روشن کتابیں گھر گھر پہنچانے کے سلسلے میں ایک انقلابی پیشکش!

انقلاباتِ عالم

- ابنِ آدم کی تہذیبی اور سیاسی طویل داستانوں کا منتخب اور مختصر تذکرہ۔
- قوموں اور ملکوں کی متنوع سرگرمیوں کا حسین اور دلکش مرقع۔
- دُنیا کے اہم معاشرتی اور سیاسی واقعات و انقلابات پر مفصل اور سیر حاصل تبصرہ
- ممالکِ دُنیا کا جغرافیہ ـــــ اقوامِ عالم کی تاریخ

ـــ مرتّبہ ـــ

ادارۂ تالیف و تصنیف



مطبوعات شیخ غلام علی

ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

دیباچہ

حیاتِ انسانی کا یہ فطری تقاضہ ہے کہ جب تک اس کے اندر مدوجزر کی کیفیتیں اور نشیب و فراز کی مزاحمتیں جنم نہ لیں، اسے کسی پل چین نصیب نہیں ہوتا۔ انسان کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے۔ آدم سے لے کر آج تک انسان پر گزرنے والا ہر لمحہ تغیر و تبدل سے عبارت ہے پہلے غاروں اور جنگلوں میں اس کا بسیرا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ متمدن معاشرت کی طرف مائل ہوتا رہا اور ایک وقت وہ بھی آیا جب اس کی ذہنی اپج اور انقلابی سوچ نے جوائے آرام دہ بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہنے کا ڈھنگ بھی سکھا دیا۔ دیکھا جائے تو انقلابات کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود انسان۔ انسان پیدا ہوا تو اس کے ساتھ ہی انقلابات کی تاریخ بھی چل نکلی اور آج یہ تاریخ، جو جانے کتنی صدیوں پر محیط ہے اس قدر وسعت اور پھیلاؤ اختیار کر چکی ہے کہ انسانی دماغ اور سوچ بھی اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے پہلے بھی اس زمین پر انسان کا وجود تھا اور خدا کے مامور اور رسل ان انسانوں کی طرف نازل ہوتے رہتے تھے۔ تاہم حضرت آدمؑ سے پہلے کی کوئی ایسی مستند تاریخ ہمیں نظر نہیں آتی۔ جس کی بنا پر کوئی واضح اور ٹھوس رائے قائم کی جاسکے۔ حضرت آدمؑ کا زمانہ، انسانی تاریخ کا ابتدائی زمانہ ہے اور اس زمانے سے انقلاباتِ عالم کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ روئے زمین پر برپا ہونے والا سب سے پہلا انقلاب، جو حقیقت میں ایک اہم انقلاب تھا۔ حضرت آدمؑ اور حوّا کی پیدائش ہے۔ جہاں سے تاریخِ انسانی کے انقلابات کی رُوداد شروع ہو کر ہم تک پہنچتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں فاضل مصنف نے حضرت آدم سے لے کر آج تک پیدا ہونے والے انقلابات کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور بڑی نفاست اور مہارت سے تاریخ کا رس نچوڑ کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ فاضل مصنف نے حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کو انسانی تاریخ میں انقلابات و حوادث کا سنگِ بنیاد قرار دیا ہے اور یہ ہے بھی حقیقت۔ کیونکہ اسی بنیاد پر بعد میں مختلف انسانی معاشروں کی عمارت استوار ہوتی رہی۔ قومیں اور ملک وجود میں آئے، رنگ، نسل اور ذات کے لحاظ سے انسان منقسم ہوا اور پھر جغرافیائی حدود اس تقسیم کو نمایاں کرتی چلی گئیں۔ تفاوت اور تنفر کی خلیج بھی یہیں سے پیدا ہوئی۔ انسان کے احساسِ برتری نے کسی مقام پر بھی اسے نچلا نہیں بیٹھنے دیا اور پھر وہ ہر مرحلے اور موڑ پر اپنے ہی جیسے انسانوں کا گلا کاٹ کر نت نئے انقلابات کی تاریخ رقم کرتا رہا۔

مصنف نے انتہائی چھان بین۔ کر ہزار ہا چار ہزار سال قبل تک کے انقلابات و واقعات تک رسائی حاصل کی ہے۔ قدیم مذہبی اور تاریخی کتب سے استفادہ کے بعد انہوں نے یہ حقیقت منکشف کی ہے کہ ان تمام انقلابات میں مذہب ہمیشہ ہی ایک اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور طوفانِ نوح۔ حضرت موسیٰ اور فراعنۂ مصر حضرت ابراہیم کا علمِ انقلاب اور نمرود کی خدائی اور پھر اس کے بعد ایران میں زرتشت کا انقلاب۔ ہندوستان میں گوتم بدھ اور چین میں کنفیوشس کی تحریک۔ یونان و روم میں زینو کا فلسفۂ رواقیت (STOILISM) اور دیو جانس کلبی کا نظریۂ حیات اور پھر حضرت عیسیٰ کی شکل میں انسانیت کے نجات دہندہ کا ظہور، وغیرہ۔ لیکن یہ تمام انقلابات بھی ناکافی ثابت ہوئے گو تم بدھ، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، زرتشت وغیرہ نے روحانیت اور اخلاقیات کے جو دیئے روشن کئے تھے ان کی روشنی رفتہ رفتہ ماند پڑتی گئی، بدھ مذہب کے پیرو خدائی ہستی کے منکر ہو چکے تھے۔ زرتشت کے مذہب میں دو خداؤں کی حکومت تھی۔ حضرت عیسیٰ کے ماننے والے تثلیث کے عقیدہ کو اپنا چکے تھے۔ یونان و روم کے رہنے والے خشک منطقی تاویلوں اور خشک بحثوں سے تنگ آچکے تھے۔ چین اور ایران میں مزدک جیسے لوگ انسانی اخلاق کا جنازہ نکال رہے تھے۔ چنانچہ اس افراتفری کے دور میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا جو انقلاباتِ عالم کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ورودِ مسعود۔ اس موقع پر تمام دنیا نے ایک ایسے انقلاب کا نظارہ دیکھا جو اس سے پہلے ان کے وہم میں بھی نہ تھا۔ اسلامی انقلاب نے صدیوں سے خشک اور بنجر پڑے ہوئے دلوں کو سیراب کر دیا۔ آبِ کوثر کے ایک جام نے خشک ہونٹوں کو تر کر دیا۔ اسلامی انقلاب نے ایک نئے نظام کے ذریعے حکومت کی باگ ڈور عوام کی طرف منتقل کر دی۔

اس کے بعد انقلابات کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یورپ میں کلیسا کا نظام اور پروٹسٹنٹ تحریک کی داغ بیل۔ روس میں زار روس اور لینن، ٹراٹسکی کی سرکردگی میں اشتراکیت اور سوشلزم کی مقبولیت۔ انقلابی تحریک بالشویک کا آغاز۔ چین میں سن یاٹ سن، چیانگ کائی شیک اور امیر حبیب اللہ وغیرہ کی تحریک، ترکی میں مدحت پاشا اور مصطفےٰ کمال اتاترک، نجد و حجاز میں عبدالعزیز بن سعود۔ شام، عراق اور مصر میں مہدی سوڈانی، جمال الدین افغانی۔ سعد زغلول پاشا اور نحاس پاشا۔ اور الجزائر کی تحریکِ آزادی میں سید عبدالقادر کا نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہٹلر اور مسولینی کا کردار — یورپ کا صنعتی انقلاب — فرانس کا انقلاب اور نپولین بونا پارٹ کی تگ و دو، یہ تمام ایسے انقلابات ہیں جنہوں نے آج کی دنیا پر حیرت انگیز اثر ڈالا۔ برصغیر پاک و ہند میں رونما ہونے والے انقلابات کی تاریخی تصویر اور —— انقلابات کی اس طویل ترین داستان کو انتہائی محنت اور خوبصورتی کے ساتھ محدود صفحات کے اندر سمیٹ دیا گیا ہے —— حقیقت یہ ہے۔ کہ دنیا کی تاریخ، سیاست، مذہب اور معیشت پر مشتمل یہ کتاب ایک مستقل انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے — کتاب کے مطالعہ کے بعد قارئین اس امر کا بخوبی اندازہ کر سکیں گے۔

(ارشد نیاز)

فہرست

حرف اوّل

تاریخ ریل گاڑی میں سفر کرنے کی مانند ہے اور واقعات ہمارے سامنے ٹیلیگراف کے کھمبوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ جو کھمبے ہماری نظروں کے عین سامنے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان تو ہمیں ایک فاصلہ دکھائی دیتا ہے لیکن جب ہم پیچھے ان کھمبوں کی طرف نظر دوڑاتے ہیں جو گزر چکے ہیں تو وہ سب باہم ملے ہوئے تو ہوتے ہیں مگر ان کے درمیان فاصلوں کا ہمیں پتہ نہیں چلتا۔

یہ فاصلے اور وقفے بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنی اہمیت خود تاریخی واقعات کو حاصل ہوتی ہے، کیونکہ تاریخی واقعات ان تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو مختلف وقفوں، زمانوں یا مختلف ادوار میں لوگوں کے خیالات اور ان کے افکار میں رونما ہوتی ہیں۔ مختلف زمانوں میں مختلف افراد، طبقے اور قومیں معاشرتی، سیاسی، مذہبی، اقتصادی یا تہذیبی لحاظ سے جو اندازِ فکر اختیار کرتی ہیں، واقعاتِ عالم دراصل اسی کا ردِ عمل ہوتے ہیں ـــ انسان کی ذہنی اختراعات اور ضروریات ہی کے نتیجہ میں نت نئے انداز سے انسانی تاریخ کا سلسلہ چلتا آیا ہے اور چلتا رہے گا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں قوموں اور ملکوں کی کشمکش اور انقلابی حادثات و واقعات کی بنیاد انسان کی اس بدلتی ہوئی فکر کے سوا اور کچھ نہیں۔

جس سرعت کے ساتھ یہ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوں گی، اسی سرعت کے ساتھ نئے واقعات جنم لیں گے، چنانچہ ذہنی اور مادی لحاظ سے موجودہ برق رفتار زمانے اور قدیم دَور کے تاریخی واقعات و حقائق کا موازنہ کرنے سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

ان حقائق کو جان لینے کے بعد ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ہسٹری محض تاریخوں یا واقعات کا نام نہیں بلکہ ابن آدم کی اس طویل اور عجیب و غریب داستان کا نام ہے جو اس کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی اور اس کی طوالت کا یہ عالم ہے کہ آج ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی اس داستان کی تکمیل نہیں ہو سکی۔

روئے زمین پر زندگی کی ابتدا یا اس کی قدامت کے بارے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی کا مخرج واحد الخلیہ مخلوق (امیبا) ہے جو مختلف مدارج سے گزر کر تکوینِ آدم پر ختم ہوئی، اور اس مدت کا صحیح تعین آج تک نہیں ہو سکا۔ قرآن کے بیان کے مطابق سب سے پہلے انسان آدم تھے۔ اس بیان کی بنیادوں پر یہی کہنا پڑے گا کہ انسانی تاریخ کی ابتدا اس وقت ہوئی جب حضرت آدم اور حضرت حوا کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا گیا۔ اس کے بعد ہابیل اور قابیل کے ہاتھوں انقلاب عالم کے پہلے باب کی ابتدا ہوئی، بعد ازاں ان کی اولاد دنیا میں کثرت کے ساتھ پھیلتی چلی گئی اور تاریخ عالم کے ابواب پر ابواب مرتب ہوتے چلے گئے۔ نئی نئی سرزمینیں انسانوں کا مسکن بنیں، نئے نئے معاشرے وجود میں آئے، مختلف تہذیبوں نے جنم لیا، یہ سب چیزیں بننے کے بعد بگڑیں، برباد ہوئیں۔ ان کی جگہ نئے انسان، نئے معاشرے اور نئی تہذیبیں ابھریں ـــ غرض دنیا میں ذہنی اور مادی تبدیلیوں کا حیرت انگیز سلسلہ جاری ہو گیا، جو آج تک جاری ہے۔

نہایت قدیم انسان کی کارگزاریوں کا چونکہ باقاعدہ ریکارڈ نہیں ملتا اس لئے اسے ہم زمانہ ماقبل تاریخ قرار دے کر اس دَور کے انسانوں کے متعلق بعض آثار و مفروضات کی بنا پر رائے قائم کرتے رہے ہیں، قدیم مذہبی کتب، روایات یا کھنڈرات سے بعض حالات کی ایک دھندلی سی تصویر ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے انسانوں کے خیالات بدلتے گئے یا ان کی فکر کا معیار بلند ہوتا گیا، وہ ہر لحاظ سے ترقی کرنے لگے، پتھر اور دھات کا زمانہ رخصت ہوا۔ تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی گئی۔ مختلف سلجھے ہوئے معاشرے وجود میں آنے لگے۔ انسانوں کے عادات و اطوار اور رسم و رواج سدھرتے چلے گئے یہاں تک کہ روئے زمین کے مختلف حصوں میں مختلف قوموں نے اپنی اپنی علیحدہ تہذیب قائم کر لی۔ ان متمدن قوموں نے انسانی فطرت سے مجبور ہو کر اختیار و اقتدار کی ہوس کا راستہ اختیار کیا، ایک قوم دوسری قوم کو محکوم اور غلام بنانے کے پیچھے لگ گئی تاکہ اس کی بالادستی میں اضافہ ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے بہادر اور جنگجو لوگوں کے لشکر تیار ہونے لگے۔ مصر، یونان اور روم کے قدیم حالات میں ہمیں ایسی ہی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے ـــ گویا انسانوں نے جونہی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی اور ذہنی و مادی ترقی کی طرف قدم بڑھائے، فوراً ہی دوسری قوموں پر بالادستی قائم رکھنے کا جذبہ ان میں اٹھ آیا اور وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے لگے یعنی لشکری جنگوں کا آغاز ہو گیا، پھر روئے زمین پر کوئی ملک اور کوئی قوم اس جذبہ سے محروم نہ رہی ـــ یہ سب واقعات کسی نہ کسی شکل میں ریکارڈ ہونے لگے۔

قدیم زمانہ میں مصر سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا تھا وہاں کے بادشاہ جو فرعونؔ کہلاتے تھے جنگ کے اس قدر دلدادہ تھے کہ یہ ان کی قدرتی غذا بن گئی تھی وہ اپنے ایشیائی پڑوسیوں کے خلاف سال میں ایک مرتبہ ضرور جنگی مہم بھیجا کرتے تھے اور موسم ختم ہونے پر فتحیاب ہو کر دریائے نیل میں ایک جلوس کی صورت میں اس طرح واپس آتے تھے کہ مفتوح بادشاہ ان کی قید میں ہوتا اور اس کا سر ان کے جہازوں کے سوراخ میں سے باہر نکل کر پانی کے رخ لٹکا ہوتا تھا۔

بعد کے زمانہ میں ایرانی اور بعض دوسری قومیں بھی اسی طرح کے جارحانہ حملوں کی شائق رہیں۔ کیخسرو، دارا اور بعض دوسرے بادشاہ مغربی ایشیا کو فتح کر کے اسے ایک ہی سلطنت بنا کر اپنے ماتحت رکھنے کے ارادہ سے مہم آزما ہوئے لیکن جب اپنے سے بہتر مسلح اور زیادہ منچلے یونانیوں سے واسطہ پڑا تو انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔

اس کے بعد یونانیوں میں جنگ کی لہر اٹھی۔ ایتھنز، سپارٹا اور بعض دوسری یونانی ریاستوں میں باہم جو لڑائیاں ہوئیں وہ بہت زیادہ تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ہر ریاست نے باری باری سے بڑا نام پایا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم کے باپ فلپ نے ان کی باہمی بے اتفاقی سے فائدہ اٹھا کر سارا یونان سنبھال لیا۔ بعد ازاں اس کے بیٹے سکندر نے مصر کو پامال کیا، پھر ایران کو روندا۔ چونکہ اس کی سپاہ بہت مضبوط تھی اس لئے اس نے ساری دنیا کو مسخر کرنے کا عزم کر لیا، درۂ خیبر کی راہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا، کئی معرکوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنے ملک کو لوٹا مگر راستہ میں بابل کے مقام پر دنیا ہی سے رخصت ہو گیا۔

یونانیوں کے بعد اہل روم نے نصف دنیا کو زیر نگیں کیا۔ آگسٹس اور جولیس سیزر جیسے نامور شہنشاہوں نے اپنے آئے دن کی لشکر کشی اور فتوحات سے دنیا کا جغرافیہ ہی بدل ڈالا۔

مقصد یہ کہ انسان روزِ اول ہی سے اپنے خیالات اور اپنی ضروریات کے مطابق اپنی تاریخ خود مرتب کرتا چلا آرہا ہے اور جیسے جیسے وہ ذہنی اور مادی طور پر ترقی کرتا گیا اس کی تاریخ میں متنوع واقعات کا اضافہ ہوتا رہا۔

گزشتہ چند صدیوں سے انسان نے سائنسی، علمی اور مادی لحاظ سے ترقی کرنے کا جو حیرت انگیز سلسلہ جاری کر رکھا ہے اور جس سرعت کے ساتھ یہ ترقی رو بہ کمال ہے، اسی حیرت انگیز تیزی کے ساتھ انسان کی تاریخ بھی ایک نئے دَور میں داخل ہو چکی ہے اور اسی تیزی کے ساتھ مختلف مراحل طے کر رہی ہے۔ سلطنتوں کے عروج و زوال، قوموں کی ترقی و انحطاط اور ملکوں کی شکست و ریخت میں بھی برق رفتاری نظر آرہی ہے۔

زیر نظر ملکوں اور قوموں کے انہیں حالات و کوائف پر مشتمل ایک مختصر سی تاریخی داستان ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، تاریخ محض واقعات یا سنین کا نام نہیں بلکہ انسان کے ہر شعبہ زندگی کے مطالعہ کا نام تاریخ ہے، اس لئے اس کتاب میں سیاسی واقعات کے ساتھ ساتھ ہر ملک کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کا بھی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جغرافیائی حالات کا سیاسی یا تاریخی واقعات سے چونکہ اک گونہ ربط ضرور ہوتا ہے اس لئے جہاں ضرورت محسوس کی گئی ہے وہاں

اس ملک کی جغرافیائی کیفیت پر بھی تبصرہ کر دیا گیا ہے، تاہم موضوع کے پیش نظر حالات میں سیاسی واقعات و حالات کا عنصر غالب نظر آئے گا۔

دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم کی ابتدا سے اس وقت تک کی تاریخ کو نہایت اختصار کے ساتھ بھی اگر یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں مرتب کرنی پڑیں۔ ہم نے قارئین کے وقت اور سہولت کا احساس کرتے ہوئے اس طویل موضوع کو ایک ہی کتاب میں محدود صفحات کے اندر سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ملکوں کا انتخاب اور واقعات کا اختصار دونوں چیزیں لازمی تھیں، تاہم موضوع کے اعتبار سے تمام ضروری واقعات لے لئے گئے ہیں۔

بعض اہم انقلابات کو الگ عنوان کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ ان انقلابات نے ساری دنیا پر حیرت انگیز اثر ڈالا۔ اسلامی انقلاب، ریفریشن، صنعتی انقلاب اور انقلاب فرانس اس ضمن میں آتے ہیں۔ پہلی اور دوسری عظیم جنگیں چونکہ نتائج کے لحاظ سے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہیں اس لئے انہیں بھی الگ عنوان کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۲۷ راگست سنہ ۱۹۶۰ء ارمان سرحدی

انقلابات عالم کی تاریخی حیثیت

تمہید

انسان فطری طور پر خود آگاہ، خود سر اور تنوع پسند واقع ہوا ہے وہ کبھی ایک حالت پر قائم رہنے کا عادی نہیں، ہر انسان خواہشات کا ایک لامتناہی سلسلہ ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ پیدائش سے موت تک وہ ان کی تکمیل میں سرگرداں رہتا ہے، دراصل یہی کشمکش زندگی کی جدوجہد کہلاتی ہے۔

انسان کی یہی انفرادی جدوجہد اجتماعی شکل میں مختلف معاشروں کی جدوجہد بن جاتی ہے۔ مختلف طبقوں، قوموں اور ملکوں کی سرگرمیوں کے پس پشت انسان کی یہی جبلت کارفرما ہوتی ہے۔

انسان کے ان طبعی خواص، عادات واطوار، رجحانات اور خواہشات کے نتیجہ میں دنیا کی تمام قوموں اور ملکوں میں سوچ کے انداز ہمیشہ بدلتے رہے ہیں۔ ان میں مختلف نظریات جنم لیتے رہے ہیں۔ ان نظریات کے مطابق قوموں اور ملکوں کی سماجی، مذہبی، تاریخی اور سیاسی زندگی میں وقتاً فوقتاً تغیرات اور حادثات واقع ہوتے رہے اور دنیا کی تاریخ میں آئے دن انقلابی واقعات کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔

آج جب ہم دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ان تمام واقعات پر غور کرتے ہیں جو مختلف قوموں اور ملکوں میں رونما ہوئے تو ہر واقعہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے سے ہم قاصر رہ جاتے ہیں اس لیے کہ موجودہ دور میں دنیا کے اندر انسان نے جو عظیم کھیل کھیلے اپنی جبلت اور فطرت کا جس طرح پر مظاہرہ کیا، ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے ذریعے سے جو تباہیاں مچائیں، ان کے بھیانک اور عالمگیر نتائج کے سامنے تاریخ کے تمام گزشتہ حادثات وانقلاب ماند پڑ جاتے ہیں۔ پہلے دنیا کا بڑے سے بڑا انقلاب کسی خاص قوم یا ملک تک محدود ہو کر رہ جاتا تھا، مگر آج کے دور میں جبکہ ریل، تار برقی، ہوائی جہاز، راکٹ، ٹیلیفون، وائرلیس، ریڈیو وغیرہ کے ذریعے سے ساری دنیا سمٹ سمٹا کر نہایت مختصر ہو گئی ہے، کسی ایک حصہ ارض میں نمودار ہونے والا کوئی واقعہ ساری دنیا کو متاثر کر سکتا ہے۔

مگر جب ہم کسی ملک کے کسی واقعے کا جائزہ اس وقت کی دنیا اور اس وقت کے لوگوں کو سامنے رکھ کر کریں، اور یہ نہ بھولیں کہ اس وقت دنیا کا ماحول بہ حیثیت مجموعی کیسا تھا، تو ہمیں اس دور کے ہر واقعے کو صحیح طور پر سمجھنے، اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگانے اور اس سے صحیح نتائج برآمد کرنے میں آسانی رہے گی۔

دیکھا جائے تو عالمی انقلاب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود انسان، یعنی انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی دنیا کی تاریخ بھی وضع ہونے لگی، جس کے تمام تر ابواب انقلابات حادثات پر مشتمل تھے۔

انقلابات عالم کی بنیاد

دنیا کے سب سے پہلے انسان حضرت آدم تھے، ہابیل اور قابیل ان کے دو بیٹے تھے، جن میں باہم کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، نتیجہ میں قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا اور اس طرح اپنے بابا بلفاظ دیگر حضرت انسان کے فطری یا جبلی تقاضوں کو بروئے کار لاکر انسانی تاریخ میں حادثات کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔

روئے زمین پر انسانوں کی آبادی کے ساتھ ساتھ معاشروں کی داغ بیل پڑتی گئی مختلف قومیں اور ملک جنم لیتے چلے گئے، رنگ، نسل اور ذات کے لحاظ سے انسان آپ اپنی تقسیم کرتا چلا گیا۔ اور جغرافیائی حدود اس تقسیم کو نمایاں کرتی چلی گئیں۔ متنازعہ فیہ امور پر مختلف طبقوں، قوموں اور ملکوں کے لوگوں کی آپس میں تکرار جاری رہتی۔ اگر بعض امور پر سمجھوتے بھی ہوتے رہتے تاہم بیشتر صورتوں میں انسان انسان کے لیے خطرہ بنا رہا اور وہ عموماً اسی خو اور خصلت کا مظاہرہ کرتا رہا جس کی نمائندگی سب سے پہلے قابیل نے کی تھی۔ آئندہ تمام عالمی واقعات بنیادی طور پر اسی سرشت کا نتیجہ رہے ہیں۔ بلا مبالغہ یہی جبلت تاریخ انقلابات عالم کی اساس ہے۔

مذکورہ بیان کے مطابق عالمی انقلابات کی تاریخ انسان کی پیدائش سے کم پرانی نہیں تاہم تاریخی آثار ونشانات اور شواہد کی روشنی میں آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل تک کے واقعات کسی حد تک معلوم ہو سکے ہیں۔ پھر پرانی مذہبی یا تاریخی کتابوں سے ان پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ہندوؤں کی قدیم کتاب مہابھارت[1]، رامائن[2]، چاروں وید[3]، زرتشت کی کتابیں ژند اور اوستا[4]، علاوہ ازیں حضرت موسیٰ کی تورات جو تاریخی تحقیق کی رو سے دنیا کی قدیم ترین کتاب مانی گئی ہے اور جس کی تصنیف کا زمانہ کسی طرح بھی چودہ سو سال قبل مسیح سے کم نہیں۔

تورات کے متعلق عام مورخین کا کہنا ہے کہ اس کے نسخوں میں بہت سی تحریف کی گئی ہے اور ضروریات زمانہ کے مطابق بعد میں اضافے بھی ہوئے ہیں۔ اس طرح تورات اپنی قدیم اور اصل شکل میں آج موجود نہیں۔ البتہ قرآن کریم ایک ایسی کتاب باقی رہ جاتی ہے جو اس لحاظ سے دنیا کی واحد قدیم کتاب کہلانے کی مستحق ہے کہ اس میں مطلق کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی، اور وہ اپنی اصل شکل میں آج تک موجود ہے۔ اگرچہ قرآن کا اصل موضوع تاریخ نہیں، تاہم بر سبیل تذکرہ یا ضمنی طور پر اس میں جہاں کہیں تاریخی واقعات کے کچھ حصے آگئے ہیں وہ ایک مورخ کے لیے بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ اور ہزاروں سال قبل کے کچھ نہ کچھ نقوش ضرور پیش کرتے ہیں اور دنیا کی تاریخ مرتب کرنے والوں کو ان سے بہت مدد ملی ہے۔

بنابریں ہم تاریخی انقلاب کا بیان اس دور سے شروع کرتے ہیں جس کے متعلق ہمیں آسمانی صحیفوں، تاریخی کتابوں اور مختلف شواہد سے تفصیلات حاصل ہو سکتی ہیں۔ واضح رہے کہ انقلاب سے مراد محض سیاسی انقلاب ہی نہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہمیت اس ذہنی انقلاب کی ہے جو کسی طبقے یا معاشرے کے افراد میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی انقلاب اپنے ساتھ ہر انقلاب کو دعوت دیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ذہنی اور فکری اصلاح کے بعد انسان کی تمام سیاسی اور معاشرتی گتھیاں خود بخود سلجھتی چلی جاتی ہیں۔ قومیں اس کے طفیل سیاست اور تمدن کے بام عروج کو پہنچ جاتی ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور ان کا پیش کیا ہوا لائحہ عمل اس بات کا زندہ ثبوت ہے جس کی تعمیل میں عرب کے بدو اور گنوار نہ صرف قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے مالک بن گئے بلکہ تہذیب و

---

[1] مہابھارت کو ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کی تصنیف کہا جاتا ہے۔
[2] رامائن کو چار سو قبل مسیح کی تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔
[3] ویدوں کی تصنیف کا زمانہ دو ہزار سال قبل مسیح سمجھا جاتا ہے۔
[4] ژند و اوستا پانچ چھ سو سال قبل مسیح کی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

تمدن کے لحاظ سے بھی اس وقت دنیا میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔

اگرچہ دنیا کا سب سے پہلا بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب وہی ہے جسے دنیا اسلام کے نام سے جانتی ہے جس کے ارتقائی دَور کی پوری تفصیل تاریخوں میں موجود ہے اور اس کا مکمل ریکارڈ ہمارے پاس محفوظ ہے تاہم اسلام سے قبل دنیا کے مختلف خطوں، مثلاً ہندوستان، ایران، چین، یونان، روم اور عرب وغیرہ کے لوگ جن افکار و خیالات کے حامل تھے، ان کا مختصر طور پر تذکرہ کیا جائے گا، اس سلسلہ میں کنفیوشس، دیو جانس کلبی اور حضرت عیسٰی وغیرہ مصلحین نے اپنے اپنے فلسفہ اور تعلیمات کے ذریعے انقلاب کی جو روح پھونکی، پہلے اسی کا اجمالی تذکرہ کیا جائے گا۔ پھر ملکوں کے الگ الگ عنوانات سے ان ممالک میں رونما ہونے والے اہم انقلابات کا سرسری خاکہ پیش کیا جائے گا۔

انقلاباتِ عالم پر ایک تاریخی نظر:

طوفانِ نوح

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ دنیا کے اولین انسان حضرت آدمؑ کی اولاد میں سب سے پہلا قابلِ ذکر واقعہ ہابیل اور قابیل کا ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات دونوں میں موجود ہے۔ اس کے بعد مذکورہ آسمانی کتب کی رو سے دوسرا اہم واقعہ "طوفانِ نوح" ہے یہ واقعہ قرآن اور تورات کے علاوہ ہندوؤں کی مقدس کتب "مشنست پتھ برہما" "جاگوت" متسیا پران، پران اور اگنی پران وغیرہ میں بھی مذکور ہے، زیادہ تفصیلات "مہا جارت" میں آئی ہیں، اور اس کی تاریخی حیثیت سے مورخین کو بھی انکار نہیں۔

تفصیلات اس طوفان کی یہ ہیں:-

عراق عرب کے لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے، صحیح مذہبی اور اخلاقی روشنی سے یکسر نا آشنا ہو چکے تھے، غیر اللہ کی پوجا، اور بت پرستی ان کا شعار تھا۔ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر نام سے پانچ خاص بتوں یا خداؤں کی پرستش کی جاتی تھی[1]۔ اخلاقی حالت کا یہ عالم تھا کہ زبردست کمزور کو دبائے بیٹھا تھا، رحم ہمدردی، دیانت، خدا ترسی کا نشان تک باقی نہ رہا تھا، تمرد، غرور اور سرکشی لوگوں کا شیوہ بن چکا تھا، ان حالات میں حضرت نوحؑ ان کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے، انہوں نے ہر چند قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کیں، مگر انہوں نے اپنا طرزِ عمل نہ بدلا، بلکہ الٹا حضرت نوحؑ کے درپے آزار ہو گئے۔

تب ان پر پانی کا عذاب نازل ہوا، تورات کے بیان کے مطابق موسلا دھار بارش ہونے لگی، دجلہ اور فرات میں بے پناہ سیلاب آگیا، ساتھ ہی طوفانی ہواؤں سے اونچی اونچی موجیں اٹھنے لگیں۔ چالیس دن اور چالیس رات پانی برستا رہا، یہاں تک کہ سب اونچی پہاڑیاں بھی پانی میں غرق ہو گئیں۔ انسان، حیوان، چرند پرند سب فنا ہو گئے۔ حضرت نوحؑ جو اللہ کے حکم سے کشتی میں سوار ہو گئے تھے، ایک مدت تک محفوظ تیرتی رہی ۔۔ ڈیڑھ سو دن کے بعد پانی زمین میں کم ہونا شروع ہوا اور کشتی ارارط[2] پہاڑ پر جا ٹھہری[3]۔

اس طوفان کی مذہبی تاویلات کچھ ہوں، بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ روئے زمین پر انسان خدا سے یکسر باغی ہو چکا تھا، وہ اپنے ہم جنسوں پر ظلم ڈھا رہا تھا، نافرمانوں نے زمین کو ظلم و تشدد سے بھر دیا تھا، ہر طرف فسق و فجور کا بازار گرم تھا، بالادست طبقہ کمزوروں اور ناتوانوں کو کچلنے میں مصروف تھا، مشیتِ ایزدی کو انسانوں کا یہ طرزِ عمل گوارا نہ ہو سکا۔ پہلے ان کی ہدایت کے لیے نبی اور رسول بھیجا، جب وہ کسی طرح نہ مانے تو طوفانِ نوح کی شکل میں انہیں سزا دی۔

طوفانِ نوح کے متعلق مورخین کی دو رائیں ہیں:- ایک یہ کہ یہ طوفان اس خاص حصے تک محدود تھا جس میں حضرت نوح کی قوم آباد تھی، اگر یہ طوفان عالمگیر ہوتا تو اس کے آثار دنیا کے مختلف حصوں میں ملنے چاہئیں تھے۔ لیکن ایسا نہیں۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں دنیا کی آبادی صرف اسی خطے تک محدود تھی، جہاں حضرت نوح کی قوم آباد تھی اور چونکہ سرکشی اور نافرمانی کے باعث وہی لوگ سزا کے مستحق تھے لہٰذا انہیں پر بارش کا عذاب نازل کیا گیا دوسرے علاقوں کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ طوفان تمام کرہ ارض پر محیط تھا اس لیے کہ دنیا کے کئی حصوں میں پہاڑوں پر ایسے جانداروں کی ہڈیاں اور ڈھانچے پائے گئے ہیں جو پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی یہ پہاڑ پانی میں غرق تھے۔

طوفان کے متعلق ان مختلف آراء سے بحث نہیں، البتہ طوفان کی عظیم تباہی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ وہ ارارط کی ان چوٹیوں تک پہنچ گیا تھا جن میں سے ایک کی بلندی چودہ ہزار تین سو فٹ ہے اور دوسری کی دس ہزار تین سو فٹ، جو طوفان اس پہاڑ کے قریب بدرجہ اتم دس ہزار تین سو فٹ کی بلندی تک پہنچ گیا تھا، اس نے عراق اور آس پاس کی زمین پر جو صورت اختیار کی ہوگی، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال اس سے بہت بڑے حصۂ ارضی پر تباہی پھیلی ہوگی۔ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا جلد سوم، مطبوعہ ۱۹۲۵ء نے بھی لکھا ہے کہ اس طوفان کی تفصیلات بظاہر افسانوی معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم چونکہ مختلف مذاہب کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے، اس لیے اسے بالکل بے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ طوفان نہ سہی کسی نہ کسی قسم کی تباہی دنیا کے وسیع و عریض حصے میں ضرور آئی ہوگی۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی معاشرہ کے ظالمانہ دستور کے خلاف یہ پہلی بغاوت تھی۔ جو دنیا میں نمودار ہوئی اور جس کے نتیجے میں روئے زمین پر انسانوں کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ ناپید ہو گیا۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ آبادی از سرِ نو بڑھنے لگی۔ نئے معاشرے وجود میں آئے اور نت نئی مدنی پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔ انسانوں کی ذہنیتیں اور ان کے اعمال بگڑتے سنورتے اور بدلتے رہے۔ ان متلون مزاجیوں نے اپنے ساتھ نت نئے حوادث اور تغیر و تبدل کو جنم دیا اور دنیا انقلاب کی آماجگاہ بن کر رہ گئی۔

بلادِ عرب

اصطلاح میں بلادِ عرب وہ علاقہ کہلاتا ہے جو عراق سے مصر تک پھیلا ہوا ہے۔ جس دور سے ہم نے بحث شروع کی ہے تاریخی اعتبار سے اس دور میں اسی علاقے کے حالات ہمیں زیادہ مستند صورت میں دستیاب ہوتے ہیں۔ مصر و بابل کی قدیم ترین تہذیب کی کڑیاں بھی انہیں علاقوں سے ملتی ہیں۔

یہی سرزمین حضرت نوحؑ کا مسکن تھی۔ طوفانِ نوح کا ظہور بھی اسی علاقے میں ہوا حضرت نوحؑ کے بعد بنی نوع انسان کو بے راہ روی سے بچا کر اخلاق و انسانیت کی راہ پر لگانے کے لیے اس سرزمین میں جن عظیم ہستیوں کا ظہور ہوا، ان میں سب سے پہلے نمایاں صورت میں حضرت ابراہیمؑ کا نام آتا ہے۔ حضرت نوحؑ کے بعد حق و صداقت کی یہ دوسری انقلابی آواز تھی جو دو ہزار سال قبل مسیح ظلم و جبر کے خلاف اعلیٰ اور نمرود جیسے متمرد، سرکش، ظالم و جابر اور مطلق العنان بادشاہ کے خلاف سرگرمِ عمل ہوئی۔

حضرت ابراہیمؑ سے پہلے انسانی معاشرت چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی بادشاہت کا وجود ناپید تھا۔ بعد ازاں بادشاہت کی بنیادیں پڑنا شروع ہوئیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ

---

[1] بتوں کے یہ نام سورہ نوح، رکوع ۲ میں آئے ہیں۔

[2] ارارط سلسلہ کوہ کا نام ہے جو ایران، روس اور جمہوریہ ترکیہ کی مشترکہ سرحد پر واقع ہے اور جس حصے کا نام ارارط ہے، وہ جمہوریہ ترکیہ میں واقع ہے۔ قرآن مجید میں اس مقام کا نام جہاں کشتی ٹھہری تھی، جودی بتایا ہے۔

[3] کتاب پیدائش، باب ۷، ۸۔

کے زمانہ میں پہلی بار بادشاہی نظام وجود میں آیا۔ نمرود عراق کا مطلق العنان بادشاہ ٹھہرا، وہ محض دنیوی حکمران نہ تھا، بلکہ دینی لحاظ سے بھی اپنے آپ کو مختارِ کل سمجھتا تھا، اس کے اعمال کے خلاف کسی کو بھی اعتراض کا حق نہ تھا، اس کا ہر حکم قطعی اور آخری مانا جاتا تھا، گویا اس نے دنیا میں خدائی کا درجہ حاصل کر رکھا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا اس کی اطاعت کا دم بھرتا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے، خدا کے بندے نمرود کے ہر حکم کے آگے ماتھا ٹیک کر مطلق العنان بادشاہی کی بنیادیں مضبوط کر رہے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اس آمرانہ حکومت کے خلاف انقلاب کا جھنڈا بلند کیا، نمرود کو مشورہ دیا کہ خلقِ خدا کو اپنے سامنے جھکانے کے بجائے خود خدائے عزوجل کے حضور اپنا سر جھکائے اور اس کے بندوں کے ساتھ انصاف، نیکی، رحم، مروت اور خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ نمرود کے دربار میں جا کر اس سے بحث مباحثہ کیا، اسے دلائل سے خدا کی ہستی کا قائل کرنے اور راہِ ہدایت پر لانے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ بالآخر نمرود کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے، مگر وہ اپنے ایمانی مسلک پر قائم رہے۔ خدا نے انہیں ہر آفت سے بچایا۔ انہیں آزار پہنچانے والی بادشاہت کا نشان بھی دنیا میں باقی نہ رہا۔ حضرت ابراہیمؑ کی مقدس تعلیم آج بھی موجود ہے۔ تین بڑے مذہبوں، ۔ اسلام، مسیحیت اور یہودیت ۔ کی نسبت حضرت ابراہیمؑ ہی تک پہنچتی ہے۔

مصر

مصر کی کیفیت یہ تھی کہ وہاں چھوٹے چھوٹے قبائل کو مطیع کرنے کے بعد ایک خاندان برسرِ اقتدار آ گیا، جس نے مطلق العنان بادشاہت کی بنیاد رکھ دی۔ غالباً یہ دنیا کی پہلی مطلق العنان بادشاہت تھی۔ جس میں نسلی امتیاز کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ قبطی نسل کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کی نسل بہت حقیر اور کمتر سمجھی جاتی تھی، جس کے نتیجے میں قوم کے اندر پست اور بلند دو طبقے بن گئے۔

اس بادشاہت کے وجود میں آنے سے پہلے غلامی کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور اس طرح کہ چھوٹی چھوٹی جنگوں میں جو لوگ قیدی بن کر آتے، انہیں غلام بنا لیا جاتا، یعنی انہیں جانوروں سے زیادہ حیثیت نہ دی جاتی، جانوروں کی طرح ان سے ہر ادنیٰ کام لیا جاتا، بات بات پر انہیں مارنا پیٹنا کوئی معیوب بات نہ تھی۔ جب مطلق العنان بادشاہت قائم ہو گئی، تو شاہی طبقے کے علاوہ عام امراء یا اونچے درجے کے لوگ کثیر تعداد میں لونڈی غلام رکھنے لگے۔ منڈیوں میں دوسرے مویشیوں کی طرح ان کی بھی خرید و فروخت ہونے لگی، غرض چند طاقت ور یا دولت مند انسانوں نے دوسرے کمزور یا غریب قبیلوں اور خاندانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا غلام بنا لیا۔ بادشاہت کے دور میں اس قباحت نے اتنا زور پکڑا کہ ہر کمزور جماعت کے افراد کو پکڑ کر زبردستی غلام بنا لیا جاتا۔ کوئی قرض ادا نہ کر سکتا تو اسے بھی غلام بنا لیا جاتا۔ علاوہ ازیں معمولی جرائم کی پاداش میں سزا یہ دی جاتی کہ مجرم کو، جرم ثابت ہو یا نہ ہو، غلام بنا لیا جاتا۔

یہ اس دور کا ذکر ہے جب مصر تہذیب و تمدن میں دنیا کا ممتاز ترین خطہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ تہذیب و تمدن مطلق العنان بادشاہت کے طفیل وجود میں آیا تھا۔ جس طرح عراق کے بادشاہوں کا لقب نمرود تھا، اسی طرح مصر کے بادشاہ "فرعون" کہلاتے تھے، فراعنہ مصر کا رویہ نمرودوں سے مختلف نہ تھا۔ فرعون دنیا کا سب سے بڑا فرمانروا مانا جاتا تھا۔ نمرود کی طرح فرعون کے حکم کے سامنے بھی کسی کو تابِ انکار نہ تھی، اس کا ہر حکم خدائی فرمان کے برابر تھا۔ بلکہ فرعون کو خدا کا درجہ دے کر اسے ہر تنقید اور اعتراض سے بالا قرار دے دیا گیا تھا۔ فرعون کے ظلم و تشدد اور جور و جفا کی بھی کوئی حد نہ تھی، اسی کے اشارے پر ہر کام انجام پاتا، غرض وہ ایک فردِ واحد کی حیثیت سے رعایا کے ہر فرد کی قسمت کا مالک تھا، بنی اسرائیل سے تو اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی اور وہ ہر وقت اس کے مظالم کا شکار رہتے تھے۔

بالآخر جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اسی طرح مصر کے آخری فرعون کے خلاف حضرت موسیٰؑ نے بغاوت کا جھنڈا پوری قوت کے ساتھ بلند کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ جبر و استبداد کی طوفانی لہروں سے ایسے ٹکرائے کہ ان کا رُخ پھیر دیا۔ فرعون اور اس کا سارا لاؤ لشکر دریا میں ڈوب کر غرق ہو گیا اور دنیا کو اس کے پنجۂ ظلم سے نجات ملی۔

شاہی نظام کو مضبوط بنانے کے لئے بادشاہ اور خدا کے تصور کو یک جا کرنے کا جو ڈھونگ رچایا گیا تھا، حضرت موسیٰؑ نے اسے بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ اس نظریۂ فکر کی شدید مخالفت کی۔ اعلان کر دیا کہ کسی انسان کو خدا سمجھ کر نہ پوجا جائے۔ سر صرف خدائے واحد کے حضور جھکایا جائے اور صرف اسی کے احکام کی تعمیل کی جائے۔

دنیا کا یہ ایک کامیاب انقلاب تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے قانون اور آئین کے نام سے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی، وہ ایک گراں مایہ تحفہ تھی، کیونکہ اس وقت تک آئین کا تصور بھی ذہنوں میں نہ آیا تھا۔ اخلاقیات کے جو اصول "احکامِ عشرہ" کے نام سے پیش کیے، معاشرت اور سیاست کے سارے قوانین کی بنیاد بعد میں انہیں پر رکھی گئی۔ اخلاقی، انسانی، معاشرتی اور روحانی لحاظ سے پہلی مرتبہ زنا، قتل، چوری وغیرہ جیسے افعال کی حدود، اور ان کے لیے سزائیں مقرر کی گئیں۔

اس انقلابی مشعل نے تاریک دنیا میں روشنی کی کرنیں پھیلا دیں، تاریک دلوں کو منور کر دیا۔ یہ روشنی بلادِ عرب ہی تک محدود نہ رہی۔ ان سے باہر یونان روم تک بھی پہنچی، بلکہ بلامبالغہ ہندوستان، ایران اور چین کے مکتب ہائے فکر نے بھی اس سے استفادہ کیا۔

ہندوستان

وسط ایشیا سے آریائی نسل کے لوگ دو ہزار سال قبل مسیح ہندوستان میں داخل ہوئے یہ لوگ ہند کے مقامی باشندوں کی نسبت زیادہ مہذب ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خط و خال رنگ، جسمانی قوت اور دوسری صلاحیتوں کی برتری کے باعث بڑی آسانی سے مقامی لوگوں پر اقتدار حاصل کر لیا اور سارے ملک کو محکوم بنا لیا۔ "تناسخ یا آواگون" کا مسئلہ جو ہندوستان میں پہلے سے رائج تھا، اس سے آریاؤں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ خود ہر لحاظ سے برتر و افضل بن گئے اور تمام غیر آریائی نسلوں کو شودر کا نام دے کر انہیں ہمیشہ کے لیے ذلیل رہنے کا مستحق بنا دیا۔ نسلی لحاظ سے اپنی برتری کا راستہ ہموار کرنے میں ہندوؤں کے نظامِ حیات اور ذات پات کے امتیازات سے انہیں بڑی مدد ملی۔

حاکمیت کا درجہ حاصل کر لینے کے بعد آریاؤں نے ہندوستان کی دوسری اقوام کے مقابلہ میں جس غلط انداز سے اپنی قوت کا استعمال کیا، اس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک قسم کی ڈکٹیٹرشپ کو جنم دے دیا تھا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ اونچے درجے کے آدمی کا نچلے طبقہ کی عورت سے زنا کرنا کوئی جرم نہ تھا۔ بہ زورِ بازو کسی عورت کو بھگا لے جانا قابلِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ غرض ذات کی برتری اور ذاتی قوت ان ہی دو چیزوں کے بل بوتے پر ہر ناروا بات روا اور ہر جائز کو ناجائز گردانا جاتا تھا۔ اس طرزِ عمل کے نتیجہ میں بندگانِ خدا انسانوں کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے اور طاقتوروں کے سامنے کمزوروں کی ستی پلید ہو رہی تھی۔

مدتوں یہی کیفیت رہی، یہاں تک کہ پانچ سو قبل مسیح میں گوتم بدھ نے اس نظامِ حیات پر کاری ضرب لگائی اور حالات کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا۔

برہمنوں کا بنایا ہوا نظامِ زندگی معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ گوتم بدھ

---

[1] غالباً نمرود حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے بادشاہوں کا عام لقب تھا۔

نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، تمام مذہبی رسوم پر پنڈتوں اور برہمنوں نے اجارہ قائم کر لیا تھا بدھ نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہر شخص مذہبی رسومات اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے۔ شودروں کو اپنی تعلیمات اور اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر کے بدھ نے ذات پات کی تمیز کے باطل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بعدازاں چندر گپت نامی ایک شودر کے سر پر ہندوستان کی فرماں روائی کا تاج رکھا گیا۔

انسانی نجات کے لیے رنگ، نسل، نسب اور قومیت کی جو پابندی ہندو مذہب نے عائد کر رکھی تھی، بدھ نے اسے غلط قرار دیا اور محض ذاتی اعمال کو نجات کا ذریعہ ٹھہرایا۔

ویدوں کو الہامی ماننے سے انکار کیا۔ بت پرستی کی مخالفت کی، راجہ یا برہمن کے متعلق جو تصورات لوگوں کے ذہنوں میں بٹھائے گئے تھے اور جن کی بنا پر وہ ان دونوں شخصیتوں کو عام انسانوں سے بہت بالا سمجھتے تھے، انہیں یک قلم مٹا دیا اور ہر دو کو ایک عام انسان کی حیثیت سے دیکھنے کی تلقین کی۔

بدھ کی تعلیمات عالمگیر پیمانے پر پھیلیں، ہندوستان کے علاوہ بیرونی ملکوں نے بھی ان کا اثر قبول کیا۔ چنانچہ برہمنوں کا بنایا ہوا نظام سرعت سے زوال پذیر ہونے لگا اور اس کے بجائے بدھ کا لایا ہوا انقلابی نظام پھیلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ چندر گپت اور اشوک کے زمانہ (یعنی کوئی دو تین سو سال قبل) میں سارا ہندوستان بدھ مت کا پیرو بن گیا۔

گوتم بدھ کے زمانہ کے قریب ہندوستان میں ایک اور مصلح مہابیر جین پیدا ہوا، بنیادی طور پر اس کی تعلیمات بھی برہمنی تصورِ حیات اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف تھیں۔ ویدوں کو الہامی درجہ دینے سے اس نے بھی انکار کیا، ذات پات کی قیود کے خلاف کچھ نہ کہا، نہ ہی بت پرستی کی تردید کی، البتہ بدھ کی طرح ترکِ دنیا پر اس نے بھی زور دیا۔

بدھ کے مقابلہ میں مہابیر جین کی تعلیمات برہمنوں کے زیادہ خلاف نہ تھیں اور برہمن مہابیر جین سے زیادہ سیخ پا بھی نہ ہوئے، اس لیے کہ اس نے بت پرستی اور ذات پات کی تمیز کو بحال رکھا۔ اس کے مقابلہ میں بدھ نے ان دونوں کی بھی تردید کی، چنانچہ جب چھٹی صدی کے آخر میں کماراجیت کے لیے ان برہمنی تصورات نے دوبارہ زور پکڑا تو طاغوتی طاقتوں نے زیادہ زور بدھ مت کو مٹانے پر لگایا۔ مہابیر جین کے پرستاروں یعنی جین مت والوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس عہد میں بدھ مت تو ہندوستان سے بالکل نیست و نابود ہو گیا مگر جین مت باقی رہا اور آج بھی جین کو ماننے والے موجود ہیں۔

ایران

شہنشاہ جمشید کے زمانہ میں ایران کی اخلاقی، دینی اور سیاسی حالت قریب قریب وہی تھی جو نمرود کے زمانہ میں ایران کی تھی اور جس کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے جمشید نے عوام کے دلوں پر اپنا سکہ بٹھانے اور اپنی عظمت و برتری منوانے کے لیے وہی حربے استعمال کیے جن پر نمرود اور فرعون نے عمل کیا تھا۔ سیاسی قوت و اختیار کا مختارِ کل ہونے کے علاوہ جمشید نے بھی الوہیت کو اپنی ذات میں جمع کرنے کی ہر ممکن سعی کی اور رعایا سے ہر بات منوائی بالآخر اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے ایران میں زرتشت نے ظہور کیا۔ انقلاب آفرینی کے لحاظ سے زرتشت کی اہمیت گوتم بدھ سے کم نہیں۔ زرتشت کا زمانہ بعض روایات کے مطابق پانچویں یا چھٹی صدی قبل مسیح میں بتایا گیا ہے[1]۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ایران کی سماجی اور سیاسی لحاظ سے وہی کیفیت تھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

زرتشت نے مذہبی، معاشرتی اور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے عوام کے ذہنوں میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ ایران کے خانہ بدوش قبائل جن کا پیشہ قزاقی، ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان کے طرزِ عمل کی اصلاح کی۔ بادشاہ کی ذات میں خدائے مطلق کی صفات شامل کرنے کے تصورات ختم کیے۔ عوام کے علاوہ خواص نے بھی زرتشت کے نظریات اور اس کی تعلیم کو اپنایا، یہاں تک کہ کیانی خاندان کے مشہور بادشاہ گشتاسپ نے بھی اسے اپنا ہادی اور رہنما تسلیم کر کے اس کی تعلیمات کو فروغِ عام بخشا۔ رفتہ رفتہ سارا ایران زرتشت کی تعلیمات کے زیرِ اثر آ گیا اور ملک کی سیاسی و معاشی حالت پہلے سے بالکل مختلف ہو گئی۔

بعدازاں جب زرتشت کے پیروؤں نے اس کی تعلیمات میں اپنی طرف سے لغویات شامل کر کے اس کا نقشہ بدل دیا تو لوگوں کی زندگی میں نئی الجھنیں پیدا ہو گئیں، ایران کے آخری زرتشتی بادشاہ کے عہد میں زرتشت کی اصل تعلیم مسخ ہو چکی تھی۔ آخری زرتشتی بادشاہ کے زمانے میں مزدک نام ایک شخص کی تحریک نے خوب زور پکڑا۔ جس نے ہر حرام کو حلال اور ہر ناروا فعل کو روا قرار دے کر زرتشتی عقائد کی بیخ کنی کر کے رکھ دی، اس نے چوری، زنا، ڈاکہ وغیرہ قسم کے تمام جرائم کو جائز قرار دیتے ہوئے انہیں کھلم کھلا کرنے کی اجازت دے دی۔ بیشتر لوگ اس کے پیرو بن گئے اور زرتشت کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد نہ صرف اس کی تعلیم اصل شکل میں باقی نہ رہی بلکہ اس کی جگہ مزدکی خیالات نے لے لی۔

چین

جس زمانے میں ہندوستان میں گوتم بدھ اور ایران میں زرتشت کی تعلیمات نے انسانوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہونا شروع کیا تھا، اور یہ دونوں ملک انقلابی تبدیلیوں سے ہمکنار ہو رہے تھے، اس زمانے میں چین میں بھی یہی خدا کی مخلوق نہایت پستی اور ذلت کے گڑھے میں گری ہوئی تھی۔ اگرچہ چینیوں نے صنعت اور کاریگری میں اس وقت کی دنیا میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی تھی، تاہم وہاں اس سے تمام تر فائدے شاہی خاندان یا طبقۂ امراء ہی اٹھا رہا تھا، عام لوگوں کی حالت قابلِ رحم تھی، حکمران طبقہ کے ہاتھوں لوگ بہیمیت کا شکار رہتے۔ عورتوں کی حالت مردوں سے کہیں بدتر تھی۔ بادشاہ کو خدا کا سایہ کہا جاتا تھا، یعنی اسے خدا کی نسل سے سمجھا جاتا تھا اور حکومت کرنا اس کا فطری حق گردانا جاتا تھا، جس طرح عراق اور مصر میں رعایا کو ان کے بادشاہوں پر کوئی بھی اعتراض کرنے کا حق نہ تھا، اسی طرح چین کے بادشاہ کا ہر فعل سب لوگوں کے اعتراض سے مبرا تھا۔ اس کے کسی بھی جائز یا ناجائز فعل کی کوئی باز پرس نہ تھی۔ اسی کڑی گرفت کے سہارے تیسری صدی قبل مسیح میں قائم ہونے والی اس نوعیت کی بادشاہت کو ہزاروں سال تک قائم رہنے کا موقع ملا، یعنی کہیں انیسویں صدی میں جا کر اس کا خاتمہ ہوا۔

بدھ کی تعلیمات کا اثر ہندوستان سے نکل کر چین تک پہنچ چکا تھا، بلکہ چین میں لوگوں کی اکثریت بدھ مت قبول کر چکی تھی، تاہم چونکہ بدھ مت براہِ راست کسی شدت کے ساتھ سیاست پر اثر انداز نہ ہوتا تھا، لہٰذا آمرانہ ذہنیت کے لوگوں نے اس کی مخالفت کی ضرورت محسوس نہ کی اور نہ ہی مخالفت ہوئی۔ البتہ پانچویں صدی مسیح (بدھ کے زمانہ کے لگ بھگ) میں چین میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔ یہ تھی کنفیوشس کی تحریک۔ اس تحریک کو تحریک کہنے کے بجائے اگر محض ایک فلسفہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اس لیے کہ کنفیوشس کسی منظم تحریک کا بانی نہ تھا بلکہ محض ایک معلمِ اخلاق تھا۔ سیاست و معیشت کے بارے میں بھی کوئی نیا ضابطہ اس نے پیش نہ کیا بلکہ اسی قانون اور ضابطے کا حامی تھا جو گیارہ سو قبل مسیح میں ڈیوک آف چاؤ نے چین کے لیے وضع کیا تھا بدھ کے مقابلے میں کنفیوشس کی تعلیم زیادہ مقبول نہ ہو سکی بلکہ اس کے مقابلہ میں بدھ مت زیادہ ترویج پاتا رہا۔ کنفیوشس کے ماننے والوں اور اس کے فلسفہ پر عمل کرنے والوں کا شاید آج کہیں سراغ نہ ملے۔ مگر بدھ مت کے پیرو آج بھی چین میں پائے جاتے ہیں۔

یونان و روما

اس زمانے میں یونان و روما میں کئی فلاسفر پیدا ہوئے جنہوں نے مختلف فلسفوں کو رواج دیا اور لوگوں نے انہیں فلسفوں کو اپنی زندگی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور تاریخ ادبیات ایران از براؤن (جلد اوّل) صفحہ ۲۷

کا نصب العین قرار دیا۔

ان فلسفوں میں ایک رواقیت یا سٹوئسٹ ازم (STOICISM) تھا جسے زینو نے جنم دیا۔ اس فلسفہ کے اصولوں میں چند یہ تھے کہ خدا انسان کی طرح جسم رکھتا ہے۔ ہر رنج و راحت خدا کی طرف سے ہے۔ رنج و مصیبت کے موقع پر صبر کرنا چاہیئے اور برداشت کی قوت پیدا کرنی چاہیئے۔ خوشی ایک عارضی چیز ہے اس کی پرواہ نہ ہونی چاہیئے۔ قسمت پر شاکر رہنا چاہیئے۔ دنیا پر نیکی اور بدی کی طاقتیں حکمران ہیں۔ جس طاقت کا نام خدا ہے، وہ بدی کا خالق نہیں وغیرہ۔

دوسرا فلسفہ کلبیت جو سکندر اعظم کے عہد کے مشہور فلاسفر دیو جانسن کلبی کا نظریہ حیات تھا۔ یہ تھا کہ خوشی سے ارادۃً کنارہ کرنے ہی کا نام نیکی ہے۔ عیش و آرام، خوشی، دولت، علم، عزت وغیرہ سب سے نفرت کرنی چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ مشقت و ریاضت کی عادت ڈالنی چاہیئے۔

دیو جانسن کلبی نے خود اس پر پورا پورا عمل کر کے دکھایا۔ وہ گرم ریت پر لیٹتا، سردی میں برف سے ہم آغوش ہوتا، دنیا والوں سے الگ تھلگ ایک گمنام جگہ وقت گزارتا، کسی سے بات تک کرنا پسند نہ کرتا، حتیٰ کہ سکندر اعظم نے اس کے پاس جا کر جب اس سے پوچھا کہ آپ کی کیا خدمت انجام دوں تو اس نے بے پروائی سے جواب دیا کہ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ دھوپ نہ روکو۔

ایک اور فلسفہ ابی کیورس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی ماہیت یہ تھی کہ انسان کی راحت نیکی اور حسن اخلاق پر مبنی ہے۔ یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ راحت نیکی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ شراب و کباب، رقص و سرود یا عورتوں سے خلا ملا رکھا جائے بلکہ سنجیدگی سے غور کر کے ان چیزوں کو حاصل کرنا ہے جو مستقل طور پر نیکی ہیں اور ساتھ ہی ان چیزوں کو چھوڑ دینا ضروری ہے جو عارضی مسرت یا عارضی کیفیت کا باعث ہیں۔

غرض یونان و روما کے مفکرین نے خشک منطقی تاویلوں اور فلسفیانہ بحثوں کے ذریعہ مصیبت زدہ انسانیت کو مطمئن کرنے کی کوششیں کیں۔ مگر وہ بار آور ثابت نہ ہو سکیں کیونکہ اجتماعی اور معاشرتی لحاظ سے انسانی زندگی کو ان سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ انسان، انسان کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دنیا کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

یہ تھا دنیا کی ان بڑی سلطنتوں کی سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی حالت کا ایک مختصر خاکہ جس کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے قبل دنیا کے مختلف حصوں میں انسانیت سسکیاں لے رہی تھی۔ ان حالات میں وقتاً فوقتاً ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جنہوں نے انسانیت کے تحفظ و بقا کے لیے بعض کوششیں کیں اور ان میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مگر یہ کامیابی نامکمل تھی یا عارضی۔ دکھی اور مظلوم انسانیت کو ان مصلحین کے پیش کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے باوجود اپنے تحفظ اور بقا کا کوئی روشن مستقبل نظر نہ آتا تھا جس سے بنی نوع انسان میں انتشار اور تذبذب کی کیفیت طاری تھی۔

غرض تشدد اور سخت گیری عالمگیر ہو چکی تھی۔ دنیا میں ہر جگہ اس کا دور دورہ تھا۔ انسانوں کا ایک محدود طبقہ ہر جگہ تمام دنیوی مراعات کا اجارہ دار بنا ہوا تھا اور خلق خدا کی ایک کثیر تعداد لوازمات زندگی کے حصول کے بارے میں اپاہج و مفلوج بن کر رہ گئی تھی اور انہیں کوئی ایسی راہ نہ سوجھتی تھی جس کے وسیلہ سے وہ مصیبت اور ذلت کے گڑھے سے نکل کر صحیح انسانوں جیسی زندگی بسر کر سکیں۔

حضرت عیسیٰؑ

آخر وہ وقت آپہنچا جب انسانیت کی پکار رنگ لائی اور حضرت عیسیٰؑ کی شکل میں انسانیت کے نجات دہندہ کا ظہور ہوا۔

حضرت عیسےٰؑ نے دنیا کے مروجہ نظام اور بالادستوں کے بہیمانہ طرز عمل کے خلاف آواز اٹھائی چونکہ ان کی آواز سارے انسانی مصائب پر حاوی تھی، اس لیے لوگ گروہ در گروہ ان کے گرد جمع ہونے شروع ہو گئے۔ چونکہ یہ آواز فلسطین سے اٹھی تھی اور وہ یہودیوں کا مستقر تھا اور حضرت عیسیٰ کے نظریات اور ان کی تعلیم سے یہودیوں کا مفاد خطرے میں پڑتا تھا، اس لیے وہ سب ان کے خلاف ہو گئے۔ روم کے اقتدار کو بھی حضرت عیسےٰ کی انقلابی دعوت میں اپنے لیے خطرہ نظر آتا تھا لہٰذا وہ بھی حضرت عیسےٰ کے دشمن بن گئے۔ اس طرح روم کی طاقت نے یہودیوں سے تعاون کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ کے خلاف محاذ قائم کر دیا اور ان کی جان کے درپے ہو گئے۔

حضرت عیسےٰؑ نے ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنے کے لیے عوام کے جذبات کو حرارت بخشی اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، پھر مقصد کی خاطر آگے بڑھنے کے لیے اسلحہ کی ضرورت تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے پاس قربانی و ایثار کا حربہ سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ انہوں نے اسی سے کام لیا، اخلاق اور کردار کی قوت سے ظلم کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ فرمایا کہ ظالم ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی حاضر کر دو۔ جو اس بات کا اعلان ہو گا کہ میں تیرے آگے گردن جھکانے کو کسی حالت میں بھی تیار نہیں۔

حضرت عیسےٰؑ کے پیغام اور ان کی تعلیم نے عوام کی مردہ رگوں میں خون دوڑا دیا جس نے نئی حرارت اور زندگی پیدا کر دی۔ عوام محسوس کرنے لگے کہ ظلم کے ہاتھوں کو شل کرنے کا ایک نہایت کامیاب حربہ ہے کہ انتہائی بے چارگی، بے بسی اور مصیبت میں بھی ظلم کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

اگرچہ روما اور یہودیوں کی طاقت نے گٹھ جوڑ کر کے اس داعیٔ حق کو آزار پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، تاہم ان کی دعوت اپنی جگہ نہ صرف قائم رہی، بلکہ دنیا کے دور دراز اور تاریک گوشوں کو بھی اس نے ضیاء بخشی۔

حضرت عیسےٰؑ کی وفات کے بعد ان کے ماننے والوں نے ان کی اصل تعلیم کو مسخ کر دیا اور ترک دنیا اور رہبانیت کے خود ساختہ پیوند لگا دیئے۔ اس لیے وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق نہ رہی۔ تابع طاقتوں کو ایک دفعہ پھر پنپنے کا موقع مل گیا اور انسانیت لوٹ کر دوبارہ کس مپرسی کا شکار ہو گئی۔

ان حالات میں ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت تھی جو سارے دنیا کے لیے امن اور چین کی فضا قائم کرنے کا موجب ہوتا۔ مخلوق کا رشتہ خالق سے جوڑتے اور بنی نوع انسان کو ایک دوسرے کا ہمدرد بنانے کا باعث بنتا۔ ایک ایسا صالح معاشی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی ماحول پیدا کر دیتا جس میں ہر انسان سکھ کا سانس لے سکتا۔

انسانیت کی یہ پکار سنی گئی اور مشیت ایزدی نے اس کا مستقل انتظام کر دیا۔ شہر مکہ دنیا کے سب سے پہلے بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب کا مرکز قرار پایا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس انقلاب کے داعی اور علمبردار ٹھہرے۔

اسلامی انقلاب

تمہید

انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے خدا کے فرستادہ پیغمبروں، نیز مصلحین رہنماؤں اور مفکروں نے ہدایت کے جو چراغ مختلف قوموں اور ملکوں میں جلائے تھے وہ سب کے سب چھٹی صدی عیسوی کے آخر تک بجھ چکے تھے۔ ساری دنیا پر جہالت کی تاریکی چھا چکی تھی۔ کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں انسانیت کے صحیح خط و خال نظر آتے ہوں اور جہاں صحیح انسانی اقدار کے پنپنے کی کوئی صورت موجود ہو، کوئی مذہب ایسا نہ تھا جو انسانی قلب و ضمیر کو منور کرنے اور انسانی شعور کو اوج ثریا پر پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بدھ، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، زرتشت وغیرہ نے روحانیت اور اخلاقیات کے جو دیئے روشن کیے تھے، ان کی روشنی ماند پڑ چکی تھی۔ ان کی تعلیمات مسخ ہو چکی تھیں، توحید کا عقیدہ باقی نہ رہا تھا۔ جگہ جگہ دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ بدھ مذہب کے پیرو خدا کی ہستی ہی سے منکر ہو گئے تھے۔ زرتشت کے مذہب میں دو خداؤں کی حکومت تھی حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے

خدائے واحد کے عقیدہ کو چھوڑ کر تثلیث کے عقیدہ میں پھنس چکے تھے۔ یہودی بھی عیسائیت کی تقلید میں حضرت عزیرؑ کو ابن اللہ قرار دے چکے تھے۔ عزیزوں میں باہم جدل و قتال جاری تھا۔ ایک ملک دوسرے ملک کو، ایک قوم دوسری قوم کو، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وحدتِ نسل انسانی کا تو خاکہ بھی کسی کے ذہن میں باقی نہ رہا تھا۔

ہندوستان کی اخلاقی حالت کا یہ عالم تھا کہ ذات پات کی تمیز نے انسانیت کے درجہ کو حد سے نیچے گرا دیا تھا اور ہر قسم کے برے افعال از قسم قتل، جھوٹ، زنا، دھوکہ اور فریب وغیرہ بزرگوں، رشیوں اور دیوتاؤں کی طرف منسوب ہونے لگے تھے۔ طرح طرح کے ناپاک اور بیہودہ قصے مقدس مذہبی کتابوں میں داخل کیے جا چکے تھے۔ شاکت مت جیسے فرقے ظہور میں آئے، جن میں بہن ماں تک سے زنا جائز تھا۔ نیوگ کے رنگ میں زنا کو ہندو مذہب میں داخل کر دیا گیا تھا۔

چین اور ایران میں جہاں کبھی، اخلاقیات کی صدائیں بلند ہوئی تھیں، وہاں مزدک جیسے لوگوں کی تعلیم انسانی اخلاق کا جنازہ نکالنے میں بے حد معاون ثابت ہوئی۔ اس تعلیم کی رو سے عورت کو جائداد مشترکہ قرار دے کر بدکاری کے راستے کھولے جا چکے تھے۔

یورپ میں رومی سلطنت کے سوا تمام علاقوں میں وحشت و بربریت کی حالت طاری تھی۔ رومی سلطنت علمی اور اخلاقی لحاظ سے اس زمانے کی دوسری سلطنتوں سے بدرجہا افضل و برتر تھی، مگر مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہاں بھی تہذیب و تمدن زوال پذیر تھا۔ آزادیٔ رائے کا حق روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سلطنت مکمل طور پر عیسائیت کے زیر اثر آ چکی تھی مگر حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیم سے بہت کم استفادہ کیا گیا۔ علمی اور فکری لحاظ سے سلجھی ہوئی قوم ہونے کے باوجود، وہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت اور بشریت کے جھگڑوں میں الجھ گئے تھے۔ رہبانیت نے مذہبی رہنماؤں کے اندر خباثت کے جراثیم پیدا کر دیئے تھے عام لوگوں کو برائی سے بچانے کے بجائے وہ انہیں برائیوں سے آلودہ کرنے لگے تھے۔ تجرد کی زندگی کو مقدس قرار دے کر در پردہ فحاشی کے مرتکب ہوتے تھے۔ غرض مذہب کے نام لیواؤں نے توہم پرستی کی بے ہودگیوں کو جنم دے کر ایک ایسی ناخوشگوار فضا پیدا کر دی تھی جس میں قوائے انسانی کی نشوونما ختم ہو چکی تھی اور انسانی اذہان و قلوب ماؤف اور مردہ ہو کر رہ گئے تھے۔

ملک عرب کے اطراف میں جو قومیں آباد تھیں، قرآن کے حوالے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اخلاقی لحاظ سے وہ بھی پستی کے قعرِ مذلت میں پڑی تھیں۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے لیے حضرت ابراہیم کے زمانے سے پہلے اور بعد میں بھی مختلف انبیاء مبعوث ہوئے جیسے حضرت ہودؑ جو قوم عاد کی طرف بھیجے گئے (جو احقاف علاقہ یمن میں آباد تھی)، اور حضرت صالحؑ جو قوم ثمود یا عاد ثانی کی طرف مبعوث ہوئے (جو مدینے کے شمال میں علاقہ حجر میں آباد تھی) حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گزرے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ جن کے متعلق بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اہل مدین کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے اور حضرت شعیبؑ جو مدین میں (جو حجر کے مغرب میں واقع ہے) مبعوث ہوئے۔

بعد ازاں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی لائی ہوئی شریعت نے لوگوں کی عام اخلاقی حالت درست کرنے کے سامان مہیا کر دیئے تھے مگر لوگ طبعاً ان شرعی قیود کے پابند ہونا گوارا نہ کر سکے۔ یہودی اور عیسائی جو اپنے آپ کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے پیرو بتاتے تھے، دراصل ان کی تعلیم اور فرمودات سے منحرف اور اپنی طرف سے عقائد، رسومات اور نئی نئی بدعتیں وضع کر کے ان پر عمل کرنے لگے تھے جس سے معاشرے میں برائیاں جڑ پکڑ رہی تھیں اور ان برائیوں پر مذہب کے پردے ڈالے جاتے تھے۔

غرض عرب کی عام حالت یہ تھی کہ ہر گھر شراب نوشی اور جوئے کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ بات بات پر قتل و غارت، معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ فحش اور ننگے الفاظ میں جنسی واقعات کا ذکر، عریاں قصیدے اور اشعار کہنا، فصاحت و بلاغت کے نام پر فنی کمال سمجھے جاتے تھے۔ توہم پرستی درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ دیوتاؤں اور خبیث روحوں پر لوگ یقین رکھتے تھے۔ تعویذ منتر اور ٹوٹکے کثرت سے استعمال ہوتے تھے۔ عورتیں متروکہ جائداد متصور ہوتی تھیں۔ باپ کے مرنے پر اس کی بیویاں بیٹے کے تصرف میں آتی تھیں۔ عزت نفس کا غلط تصور دیکھیے کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اس لیے کہ کسی کو داماد بنانا باعثِ ننگ سمجھا جاتا تھا۔

قبیلوں کی جنگیں سالہا سال تک جاری رہتیں، بات بات پر شگون لیے جاتے، غرض سارا معاشرہ ایک ایسی نہج پر جا رہا تھا جس میں خیالات، عادات و اطوار، رسم و رواج، قانون، معاشرتی ضوابط، کسی بھی لحاظ سے اچھائی کا کوئی پہلو نظر نہ آتا تھا۔

ان حالات میں ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت تھی جو دنیا کی اس ہیئت کا نقشہ بدل سکتا، انسانی ذہنوں میں انقلاب پیدا کر کے انہیں پستی سے بلندی کی طرف لے جاتا۔ قلب و ضمیر کو جلا بخشتا، مردہ دلوں میں روح پھونکتا، اخلاق و کردار کو انسانیت کی بلند سطح پر پہنچاتا، نیکی اور بدی کی تمیز پیدا کرتا، حلال اور حرام کا امتیاز بتاتا، جائز اور ناجائز کی حدود مقرر کرتا، حق و باطل میں امتیاز کرنا سکھاتا، عدل و انصاف، صلح و آشتی سے حکومت کرنے کی تلقین کرتا، اخلاقیات کے معیار کو مقرر کرتا، خدا کے بندوں کو اپنے خالق حقیقی کو پہچاننے اور اس تک پہنچنے کے گر سکھاتا، انسان کو انسان کا ہمدرد بنا کر وحدتِ نسل انسانی کی بنیاد رکھتا، چنانچہ ساتویں صدی کے اوائل میں اسلام کے نام سے اس عظیم الشان انقلاب کی وہ کرن پھوٹی جس نے تاریکی اور جہالت کے پردے کو چاک کر کے سارے عالم کو اپنی ضیا باریوں سے منور کر دیا۔

ظہور اسلام

سرزمین عرب کا ایک چھوٹا سا شہر مکّہ اس انقلاب کا سر چشمہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس انقلابی تحریک کے داعی اور علمبردار تھے جس ملک میں عرب پیدا ہوئے اور اپنی اصلاحی تحریک کی ابتدا جس قوم سے کی اس کا نقشہ مختصراً اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ دنیا میں اب تک کوئی مصلح ایسا نہیں آیا تھا جس کی قوم مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے اتنی گر چکی تھی جتنی آنحضرتؐ کی قوم۔ عرب نہ سیاست و تمدن کے کسی اصول سے واقف تھے نہ معاشرت ہی کا کوئی قاعدہ جانتے تھے۔ مذہب کا بھی کوئی صحیح تصور ان کے پیشِ نظر نہ تھا، نہ علم کے لحاظ سے کوئی برتری انہیں حاصل تھی اور نہ بیرونی لوگوں سے کوئی تعلقات رکھتے تھے، نہ آپس ہی میں اتفاق تھا، قبیلہ قبیلے کا اور خاندان خاندان کا دشمن تھا۔ ہر لحاظ سے یہ قوم خطرناک جہالت میں مبتلا تھی اور ہر لحاظ سے اصلاح طلب تھی، یہودیت اور عیسائیت کی تحریکیں ان کی اصلاح کے لیے کسی حد تک کوششیں کر چکی تھیں، مگر ناکام رہیں۔ آخر جب آنحضرتؐ کا ظہور ہوا تو عرب نے چند ہی سال کے اندر اپنے قول اور فعل کے ذریعے ذہنوں میں ایک ایسا انقلاب برپا کر دکھایا جس نے قوم کی مجلسی اخلاقی، مذہبی اور سیاسی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ عرب کے زمین و آسمان بدل گئے۔ توہم پرستی، بت پرستی اور شرک کو مٹا کر توحید کا ایسا جوش دلوں میں بھر دیا جس نے نہ صرف ملک کے اندر روحانی انقلابات کو ابھارا، بلکہ خدا کا نام سربلند کرنے والے دنیا کے ممالک میں چاروں طرف نکل گئے۔ اور دور دور تک ندائے حق بلند کی۔ دن رات جوئے اور شراب نوشی میں مصروف رہنے والوں کو عبادت الٰہی میں راتیں بسر کرنے کا عادی بنا دیا۔ صحرانشین وحشی اور غیر مہذب انسان دنیا کے عظیم الشان فاتح بن گئے، بڑی بڑی سلطنتیں ان کے سامنے یوں گرتی چلی گئیں جیسے ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

فتوحات کے ساتھ ساتھ علم و ادب میں بھی وہ کمال کر دکھایا کہ آج انہی کی بدولت دنیا علم کے نور سے منور ہے۔

آنحضرتؐ کو جو نور ہدایت عطا ہوا، وہ کسی ایک قوم کے لیے نہ تھا، بلکہ ان کے آنے کی غرض دنیا کے تمام انسانوں کو انسانیت سکھانا تھی۔ آنحضرتؐ کا ظہور آفتاب عالمتاب کا طلوع ہے جس کے ساتھ دنیا کے چاروں طرف روشنی پھیل جاتی ہے اور جس کی شعاعیں زمین کے ہر کونے کو منور کر دیتی ہیں۔ مصلحین عالم میں یہی بات آنحضرتؐ کو ممتاز کرتی ہے۔

اسلامی اصول و ضوابط

اسلام نے زندگی اور معیشت کے جو اصول مقرر کیے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا اصول تو توحید کا ہے یعنی ایک ایسی طاقت کا ماننا جو ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے، جو اپنی ذات کے لحاظ سے واحد ہے، کوئی اس کے ساتھ شریک کار یا اس جیسی قوت اور اختیارات رکھنے والی دوسری ہستی موجود نہیں۔ وہ پورے نظام عالم کی تخلیق کی ذمہ دار ہے۔ حسن و خوبی کا مجسمہ ہے، تمام سچائیوں اور صداقتوں کا سرچشمہ ہے۔

اسلام نے انسانوں میں مساوات قائم کی۔ اس کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ کالے کو گورے پر، عرب کو عجم پر، امیر کو غریب پر یا زبردست کو کمزور پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، نسل، رنگ، ملک و قوم، خاندان وغیرہ کی تمیز کو اسلام نے مٹا کر رکھ دیا اور خدا کے نزدیک شرافت و بزرگی کا معیار نیکی اور پرہیزگاری کو قرار دیا۔

غلامی کا رواج جو اس زمانے میں بہت زیادہ راسخ ہو چکا تھا، اور جس کو فوری طور پر مٹانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، اسلام نے اس کا قلع قمع کرنے کے لیے بعض نہایت دور اندیشانہ اقدامات کیے۔ جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہ رواج جاتا رہا اور انسانی مساوات کی راہیں استوار ہو گئیں۔

انسانی برتاؤ کے لحاظ سے مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تمیز روا نہ رکھی۔ فیصلوں میں بھی عدل و انصاف قائم رکھتے ہوئے اس تفریق کا کوئی خیال نہیں کیا، جس کے نتیجہ میں وحدت نسل انسانی کے لیے راستے ہموار ہوتے چلے گئے۔

آنحضرتؐ نے فطرت انسانی کی ساری شاخوں کی ایسی کامل تربیت کی اور اپنے عمل سے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اس واضح انداز میں پیش کر کے دکھایا کہ اس کے بعد زندگی کے کسی مسئلے میں الجھاؤ پیدا ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی۔

اسلام نے نظم و ضبط اور تنظیم و اتحاد کو بہت اہمیت دی۔ تنظیم و اطاعت کے جماعتی اصول پر شدت سے کاربند رہنے کی ہدایت کی، اطاعتِ امیر پر خاص طور سے زور دیا۔ یعنی اسلام صرف انفرادی اصلاح تک محدود نہیں تھا، بلکہ ہیئتِ انسانی کی جماعتی و معاشرتی زندگی پر حاوی تھا۔

انسانیت کی عام فلاح و بہبود کے لیے اسلام نے جنگ کا طریق کار تجویز کیا۔ جس کا نام جہاد رکھا گیا۔ دوسرے لفظوں میں جہاد کا مطلب یہ ہے کہ ایک نظام کو اکھاڑ کر اس کی جگہ دوسرا اس سے بہتر نظام قائم کیا جائے۔ جس میں انسانیت کو زیادہ سے زیادہ پیمانے پر پنپنے کا موقع مل سکے۔ مگر اس کے ساتھ ہی بدعہدی، دشمن یا اسیرانِ جنگ سے ناروا سلوک کرنے، لوگوں کے ہاتھ پاؤں، ناک کان وغیرہ کاٹنے، ناجائز تشدد کرنے، ہتھیار ڈال دینے پر بھی قتل و غارت جاری رکھنے کی ممانعت کر دی۔

سود، جوا، شراب وغیرہ جو انسانیت کے نام پر بدنما داغ ہیں، ان سے روک دیا۔ اس کے برعکس زکوٰۃ اور صدقات پر زور دیا، تاکہ غریب عوام کی خوشحالی کا راستہ نکل سکے اور عام ملک کی حالت بہتر بنائی جا سکے۔

اسلام نے بادشاہت کا تصور بھی مٹا دیا اور کہا کہ مسلمانوں کے تمام امور باہمی مشورے سے طے ہونے چاہئیں اور وہ شخص جسے عوام پسند کریں اور جو عوام پر حق و انصاف کی رو سے حکومت کر سکتا ہو، اسے بادشاہ یا امیر بنایا جائے۔ یعنی اقتدار اعلیٰ کا مرکز عوام کی طرف منتقل کر دیا۔

غرض آنحضرتؐ نے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عزت و عبودیت کو دنیا میں قائم کیا تو دوسری طرف مساوات اور وحدت نسل انسانی کو بھی کمال پر پہنچایا۔

اسلامی انقلاب کے بعد

اسلامی انقلاب نے شہنشاہیت اور آمریت کی شہ رگ پر ضرب کاری لگائی اور نئے نظام کے ذریعہ حکومت کی باگ ڈور عوام کی طرف منتقل کر دی۔ اس نئے نظام حیات نے رنگ و نسل اور خاندان کی تفریق اڑا کر ہر انسان کو اس کا ہر بنیادی حق دلا دیا۔ ہر انسان کو عروج و ترقی کی طرف بڑھنے میں مدد دی اور اس طرح دنیا میں صلح و آشتی اور اطمینان کی فضا پیدا کر دی۔

داعی اسلام کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے ان کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ چنانچہ ان چار خلفاء کے عہد کو خلافت راشدہ یعنی ٹھیک ٹھیک جانشینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ان چاروں خلفاء نے وہی نظام معاشرت اور نظام سیاست برقرار رکھا جس کی بنیاد آنحضرتؐ قائم کر چکے تھے اور ان کی وفات کے بعد تقریباً چوبیس سال تک اپنی صحیح شکل میں موجود رہا۔ بعد ازاں معاویہ کے عہد میں اس کا رخ بدلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ان کے بیٹے یزید کے عہد میں یک بارگی شہنشاہیت کو پھر پنپنے کا موقع مل گیا۔ اسلامی معاشرت اور اخلاقیات کے خد و خال بظاہر وہی نظر آتے تھے جو اسلام نے وضع کیے تھے اور جن پر اسلامی سیاست کی بنیادیں استوار کی گئی تھیں مگر ان میں اسلامی روح ناپید تھی۔ معاویہ کے عہد میں اسلام دور دور تک پھیل چکا تھا اور مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ سپین میں بحر اوقیانوس کے ساحل سے مشرق بعید میں بحر الکاہل تک مسلمانوں کی فرمانروائی تھی مگر اسلامی نظام سیاست اپنی صحیح انقلابی شکل میں ان جگہوں تک نہ پہنچ سکا۔ ساتھ ہی ساتھ یزید کے بعد یزید کی شہنشاہیت تسلیم کی جا چکی تھی۔ اس حکومت میں اور شاہان سلف کی حکومت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اسلام نے فرعون اور نمرود جیسی بادشاہت کا نظریہ ختم کر کے جس نئے نظریے سے دنیا کو آشنا کیا تھا، اس کے مطابق اقتدار اعلیٰ کی زمام عوام کے ہاتھوں میں تھی اور عوام کا تعاون اور اشتراک عمل حاصل کرنے کے لیے بادشاہ کا دامن ان کے آگے پھیلا رہتا تھا مگر یزید کے برسر اقتدار آنے کے بعد اسلامی ہیئت حاکمہ کا رخ بدل گیا۔ اب بادشاہ عوام کے تعاون اور اشتراک عمل کی مدد سے حکومت کرنے کی بجائے، توپوں، تلواروں اور قوت سے حکومت کرنے لگا تھا۔ حکومت میں عوام کی حیثیت برائے نام رہ گئی تھی، ملوکیت اور شہنشاہیت کے جس وجود کو اسلام نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا، وہ اپنی ہولناک شکل میں دوبارہ اسلامی معاشرے پر حاوی ہو چکا تھا۔ خلفائے بنو امیہ، بنو عباس اور خلافت عثمانیہ کے دور میں مطلق العنان بادشاہت کا پورا پورا مظاہرہ کیا گیا۔

باب ۴ — جزائر برطانیہ

عام حالت

برطانیہ ایک چھوٹا سا ملک ہے، جس کا رقبہ پاکستان کے مجموعی رقبہ کا ایک چوتھائی ہے۔ آبادی پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ آب و ہوا خوشگوار ہے۔ معدنیات کے خاصے ذخائر موجود ہیں۔ زرعی پیداوار باشندوں کی ضروریات کے مطابق کافی ہے۔ سمندر قدرتی قلعہ بندی کا کام دیتا ہے۔ سمندر کے قرب نے باشندوں کو اچھے ملاح اور

جہاز راں بننے میں مدد دی اور دور دراز کے سفر کرنے، نئے نئے علاقے دریافت کرنے اور خطرناک مہمیں سر کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔

جہالت کا دور

آج سے تقریباً بیس ہزار سال پیشتر برطانیہ وحشیوں اور غیر مہذب انسانوں کا مسکن تھا۔ چین اور مصر کے لوگ ہزاروں برس پیشتر تہذیب و تمدن کے بام عروج کو پہنچ چکے تھے۔ مگر برطانیہ ابھی قعر جہالت میں پڑا ہوا تھا۔ ہر طرف وحشت و جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ انسان انسان کو کھائے جا رہا تھا۔ مختلف جتھے قبیلے اور گروہ ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ مسیحیت جسے بعد ازاں تمام یورپ نے قبول کیا، پانچویں صدی کے آخر تک اہل برطانیہ اس سے بالکل بے بہرہ تھے۔ مذہبی اعتقادات وہی تھے جن کا اس وقت کی وحشی اور غیر متمدن اقوام میں رواج تھا، یعنی پتھروں، پہاڑوں اور بتوں کی پوجا کرنا۔

برطانیہ میں عیسائیت کا ظہور

چھٹی صدی عیسوی میں عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز روم تھا۔ روم کی عیسائی سلطنت دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوتی تھی اور اس کی ہیبت و جبروت کا ڈنکا سارے عالم میں بج رہا تھا۔ روم کا پاپائے اعظم عیسائی دنیا کی سب سے بڑی مذہبی شخصیت مانا جاتا تھا۔ اس نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے پادریوں کا ایک بڑا گروہ تیار کر رکھا تھا جو رومن سلطنت کے اندر اور باہر اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ برطانیہ کی طرف ان پادریوں کی نگاہیں عرصے سے لگی ہوئی تھیں اور وہ اہل برطانیہ کو عیسائیت کے دائرے میں لانا چاہتے تھے۔ اگرچہ پوپ کی سیاسی قوت کے طفیل پادریوں کو اپنے تبلیغی گروہوں کے سلسلہ میں بہت سی مراعات دی جاتی تھیں، تاہم روم سے بہت دور ہونے کے باعث پادریوں کو یہاں آ کر وسیع پیمانے پر عیسائیت کی تبلیغ کرنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ محدود پیمانہ پر برطانیہ کے بعض افراد نے عیسائیت قبول کر لی۔ مگر اس نئے مذہب سے جن لوگوں کے مفاد پر ضرب لگتی تھی۔ انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور اب خود عیسائیت اہل برطانیہ کے درمیان کش مکش کا باعث بن گئی۔

ولیم کا حملہ

برطانیہ کا محل وقوع ایسا ہے جو اسے بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھتا ہے۔ چاروں طرف گہرے سمندر کی ایک حد فاصل کھچی ہے۔ ہوائی جہازوں کی ایجاد تک ان سمندروں کو عبور کر کے برطانیہ پر حملہ کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ دسویں صدی عیسوی تک برطانیہ میں سیکسن نسل کے بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ اس نسل کی حکومت اس وقت ختم ہوئی جب ۱۰۶۶ء میں ولیم نے فرانس کے شمالی صوبے نارمنڈی کی طرف سے فوج کشی کر کے آخری سیکسن بادشاہ کو شکست دی اور انگلستان پر قبضہ کیا۔ برطانیہ کی مسلسل اور مربوط تاریخ ولیم ہی کے دور سے شروع ہوتی ہے۔

ولیم ایک جری، زیرک اور فہیم حکمران تھا۔ اس نے نہایت عمدہ پیمانے پر ملک کا نظام قائم کیا۔ زمینوں اور جاگیروں کا باقاعدہ ریکارڈ تیار کیا گیا۔ مویشیوں کی مردم شماری کی گئی، ملک کے مختلف حصوں کی پیداوار کا صحیح اندازہ کیا گیا، بہبود و ترقی کی سکیموں پر عمل کر کے باشندوں پر خوشحالی کے دروازے کھولے گئے۔

ولیم ہی کے دور میں پادری تبلیغ کی غرض سے جوق در جوق برطانیہ میں آنے لگے اور وسیع پیمانہ پر عیسائیت کے پھیلنے کا اہتمام ہو گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سارا برطانیہ عیسائی مذہب کی لپیٹ میں آ گیا۔

برطانوی معاشرے کی اس مذہبی تبدیلی کے بعد برطانیہ میں جو سیاسی صورت حال رونما ہوئی وہ زیادہ تر عوام اور شاہی دربار کی کش مکش کی آئینہ دار ہے اور برطانوی تاریخ زیادہ تر انہی ابواب پر مشتمل ہے۔

کلیسا کا اقتدار

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، برطانیہ کو مذہب سے روشناس کرانے اور اہل برطانیہ کو عیسائی بنانے کا کام روم کے عیسائی پادریوں نے سرانجام دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ عیسائی پادریوں نے یہ فرض انجام دینے سے پہلے اہل برطانیہ کو روحانی طور پر متاثر کرنے کے لیے برطانیہ میں اچھا خاصا رسوخ حاصل کر لیا ہوگا۔ چنانچہ جیسے جیسے عیسائیت پھیلتی چلی گئی، عوام پر پادریوں کا اثر غالب آتا رہا۔ یہاں تک کہ جب سارا برطانیہ عیسائی بن گیا تو پادریوں کو بھی عوام میں قبولیت، عزت اور تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا۔ ساتھ ہی کلیسائے روم کی قدر و منزلت عظمت اور تقدس کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ پاپائے روم اہل برطانیہ کا سب سے بڑا روحانی پیشوا بن گیا۔ برطانیہ کے تمام مذہبی امور اسی کی وساطت سے طے پاتے گئے۔ پھر جب روم میں کلیسا نے سیاسی اقتدار بھی حاصل کر لیا تو برطانیہ پر بھی پاپائے اعظم کی دھاک بیٹھتی چلی گئی۔ ابتداء میں برطانیہ کے شاہی دربار اور کلیسا کے درمیان سیاسی اقتدار نے ایک کشمکش کی شکل اختیار کیے رکھی۔ مگر بعد ازاں شاہی دربار کلیسا کے تقدس تلے دب کر رہ گیا۔ کلیسا کو برطانوی سیاست پر مکمل غلبہ حاصل ہو گیا۔ ہر شخص نہ صرف مذہبی امور میں کلیسا کا محتاج اور اسی کے رحم و کرم پر تھا، بلکہ شاہی دربار کے احکام و قوانین بھی کلیسا ہی کی وساطت اور مرضی سے طے پانے لگے۔ عوام کے مقابلہ میں پادریوں کی شخصیت بہت ممیز اور ممتاز بن گئی۔ عام عدالتوں میں پادریوں پر دیوانی یا فوجداری مقدمات نہ چلائے جاتے، بلکہ ان کی اپنی علیحدہ عدالتیں تھیں جن کا تعلق شاہ برطانیہ کے بجائے براہ راست پاپائے اعظم سے تھا۔ ان تمام حالات کی مختصر تعبیر یوں سمجھئے کہ شاہ برطانیہ قدم قدم پر کلیسا کا دست نگر تھا، مگر کلیسا کسی معاملہ میں بھی شاہ برطانیہ کا محتاج نہ تھا، بلکہ ہر بات میں اسے کامل اختیارات حاصل تھے۔

شاہ برطانیہ پر کلیسا کا اقتدار روز بروز بڑھتا چلا گیا اور مدتوں یہی کیفیت رہی۔ انگلستان کے کسی بادشاہ کو اس احساس کے باوجود کہ کلیسا اس کے اقتدار اور اختیارات پر ایک رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ عوام الناس میں کلیسا کی شدید گرفت کے خلاف جذبات ابھرنے لگے۔ چنانچہ گیارہویں صدی کے نصف آخر یعنی ہنری دوم کے زمانہ میں عوام کے اصرار پر پادریوں کے بعض اختیارات اور امتیازات ختم کر دیئے گئے۔ بادشاہ اور اہل برطانیہ کے اس رویہ کی پادریوں نے مخالفت کی، مگر اب عوام کی ایک معتدبہ تعداد جو زندگی کے ہر شعبے میں پادریوں کی اجارہ داری سے نالاں اور اس کی مخالف تھی، بادشاہ کی ہمنوا بن چکی تھی۔ پادریوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے بہت واویلا کیا۔ مگر عوام کے جذبات اتنے مشتعل ہو چکے تھے کہ شاہی دربار کے ایک ملازم نے برطانیہ کے لاٹ پادری کو قتل کر ڈالا۔

چونکہ عام لوگوں کی بڑی تعداد ابھی تک پادریوں کے حلقۂ اثر میں تھی اس لیے پادریوں سے بیزار لوگوں کا چھوٹا گروہ اپنے ارادوں میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ لاٹ پادری کے قتل نے بجائے فائدے کے، الٹا نقصان یہ پہنچایا کہ پادریوں کے حامیوں نے اس فعل کو مذہبی جرم اور ظلم قرار دے کر کلیسا کی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ کلیسا نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ عوامی جذبات کو ادھر ہوا دی۔ ہنری دوم نے پادریوں سے جو مراعات چھین لی تھیں، انہیں دوبارہ بحال کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ بالآخر ہنری نے مجبور ہو کر اپنے سابقہ احکام واپس لے لیے اور کلیسائی رسوخ پھر پہلے کی طرح اپنا کام کرنے لگا۔

اس تجربے کی روشنی میں شاہی دربار نے کلیسا کا اثر و رسوخ ختم کر کے اپنا اقتدار بحال کرنے کے لیے یہ تدبیر سوچی کہ دربار میں اپنی مرضی کے مطابق پادری رکھے۔ یوں پاپائے روم کے

خلاف حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک محاذ قائم ہو گیا۔ پھر بارھویں صدی میں جان کے زمانہ میں کلیسا اور حکومت برطانیہ کے درمیان کھلی لڑائی کی صورت پیدا ہو گئی۔

اب تک برطانیہ کا لاٹ پادری پاپائے روم کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا۔ مگر جب ۱۱۹۹ء میں جان انگلستان کے تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے طور پر ایک شخص کو اس عہدے پر مقرر کر دیا۔ پاپائے روم نے بادشاہ کے اس طرز عمل کو اپنے اختیارات پر حملہ تصور کرتے ہوئے جان کے خلاف مقدس جنگ کا اعلان کر دیا۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ جان نے مذہب کی خلاف ورزی کر کے ارتداد کا جرم کیا ہے۔ لہٰذا وہ کسی طرح بھی انگلستان کے تخت کا حقدار نہیں رہ سکتا۔

جان کا اپنا کردار بھی اچھا نہ تھا۔ اس لیے عوام میں اسے مقبولیت حاصل نہ تھی۔ علاوہ ازیں کلیسا کا اقتدار اور پاپائے روم کے روحانی تقدس کا رعب اہل برطانیہ کے دلوں پر بھی جوں کا توں موجود تھا۔ چنانچہ جب جنگ چھڑی تو عوام نے جان کا ساتھ نہ دیا بلکہ اس کے برعکس کلیسا کی حمایت کی گئی اور جان کو پاپائے روم سے صلح کرنی پڑی۔ نتیجہ میں میگنا کارٹا کے نام سے وہ چارٹر یا منشور تیار ہوا جو انگلستان کی انقلابی تاریخ کا ایک نمایاں واقعہ ہے۔ یہی منشور آئندہ برطانوی عوام کے حقوق کی بنیاد ٹھہرا۔ اٹھارویں صدی میں انقلاب فرانس کی بنیادیں بھی اسی منشور کے مطابق رکھی گئیں۔

میگنا کارٹا

اوپر کے بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انگلستان کے بادشاہ کو پاپائے اعظم خود ہی تاج و تخت دیتا تھا اور خود بھی شاہی شان و شوکت اور کر و فر سے زندگی گزارتا تھا۔ دونوں اداروں کے مفادات مشترک تھے۔ اسی لیے عوام کو لوٹنے اور بے بس و مجبور رکھنے کے لیے دونوں نے سمجھوتہ کر رکھا تھا۔ بادشاہ کے اعمال کا محاسبہ کرنے کے لیے عوام میں کوئی قوت باقی نہ رہی تھی۔ مگر دلوں میں دبے دبے جذبات ضرور پیدا ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب جان اور پاپائے اعظم کے درمیان جنگ ہوئی اور جان نے ہار مان لی تو عوام کے دبے جذبات سطح پر ابھرے۔ جان اور پاپائے اعظم کے درمیان صلح کے موقع پر جان کو مجبور کر کے دستور آزادی یعنی میگنا کارٹا پر دستخط کرائے گئے جس کے مقاصد میں بنیادی امور یہ تھے کہ کسی آزاد شخص کو نہ قید کیا جائے گا اور نہ اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ تاوقتیکہ مروجہ قوانین اس امر کی اجازت نہ دیں۔ پھر کسی عدالت میں جوں کے سامنے اس پر الزامات ثابت کئے جائیں۔ سارے ملک میں ناپ اور تول کے پیمانے یکساں قسم کے رائج ہوں۔ پردیسی تاجروں کو آزادانہ طور پر تجارت کرنے کا حق حاصل ہو۔ زمانہ قدیم سے عوام کو جو آزادیاں حاصل ہیں وہ برقرار رکھی جائیں۔ کونسل کی منظوری کے بغیر کسی قسم کا کوئی محصول نہ لگایا جائے۔

اس منشور پر بادشاہ کے دستخط ثبت ہو چکے تو اس کی بہت سی نقلیں تیار کی گئیں تاکہ ضائع نہ ہو سکے۔ لندن کے عجائب گھر میں آج بھی اس کی دو نقلیں موجود ہیں۔

کلیسا کا زوال

میگنا کارٹا کی رو سے بادشاہ کی مطلق العنانی پر بعض پابندیاں لگا دی گئی تھیں اور عوام کے حقوق آزادی کسی حد تک محفوظ ہو گئے۔ مگر کلیسا کے مذہبی اثرات اور جکڑ اسی طرح قائم رہی۔ لوگوں کو آزادی کی صحیح فضا نصیب نہ ہوئی۔ ان میں روز بروز کلیسا اور بادشاہ کے خلاف بد دلی پھیلتی چلی گئی۔ جو ان میں انقلابی روح پھونکنے کا موجب بنی۔ لوگ کلیسا کی طرف سے عائد کی گئی غیر ضروری مذہبی پابندیوں سے آزاد ہونے کے لیے مضطرب ہو رہے تھے۔

جرمنی کے مذہبی رہنما لوتھر نے برطانوی عوام کے اس اضطراب پر اور تازیانہ لگایا۔ لوتھر نے اصلاح مذہب یا ریفارمیشن کے نام سے پاپائیت کے خلاف جب پروٹسٹنٹ تحریک کی داغ بیل ڈالی اور جرمنی عوام نے ان سے تعاون کرتے ہوئے پاپائے روم کی غلامی کا جوا اتار پھینکا۔ تو اہل برطانیہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ انہوں نے پاپائے روم سے علیحدگی کے لیے پہلا اقدام یہ کیا کہ کلیسائے انگلستان کو کلیسائے روم سے الگ کر دیا گیا۔ حکومت نے باضابطہ طور پر برطانوی عوام کو پاپائے روم سے علیحدہ کر دیا۔ گویا حکومت برطانیہ نے پاپائیت سے مکمل علیحدگی اختیار کر کے عوام کو بیرونی بندھنوں سے نجات دلا دی۔ اور انہیں ملک کے اندرونی مسائل کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نصیب ہوا۔

عوامی تنظیم و قوت

عوامی طاقت بتدریج ابھرتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اسے سیاسی نظم و نسق میں ایک باقاعدہ پارٹی کی حیثیت مل گئی۔ پارلیمنٹ کے نام سے عوامی قوت کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا۔ صدیوں کی جدوجہد کے بعد حکومت و اختیار کی ساری طاقتیں دار العوام کے نام سے عوام کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئیں۔ عوام کی اس تنظیم و قوت نے برطانیہ کی سابقہ مطلق العنان بادشاہت کی حیثیت کو تو برقرار رکھا مگر اس کی کل حیثیت کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ بادشاہ کی آئینی حیثیت اور اس کے اختیارات میں مختلف ادوار میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

اہل انگلستان کو کلیسا کے برہمنی نظام سے اصلاح مذہب کی تحریک نجات دلا چکی تھی۔

بعد ازاں اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب اہل یورپ نے بجلی اور بھاپ کے خزانوں اور ان کی طاقت پر اختیار حاصل کیا۔ تب نئے نئے آلات اور مشینیں ایجاد ہونے لگے۔ بڑے بڑے کارخانے بنے۔ مہینوں میں تیار ہونے والا سامان دنوں، اور گھنٹوں میں تیار ہونے لگا تو برطانیہ صنعتی اور معاشی لحاظ سے ترقی کی راہوں پر گامزن ہو گیا۔ ترقی کی اسی دوڑ نے قومی شیرازہ بندی کا بہت بڑا کام سرانجام دیا۔ برطانیہ جو اب تک انگلستان، سکاٹ لینڈ اور ویلز کے نام سے تین علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں تقسیم تھا اور جہاں تینوں ٹکڑوں میں روایتی، تہذیبی اور تاریخی خصوصیت کے لحاظ سے اختلافات کی حدود کھینچی ہوئی تھیں، وہاں صنعتی انقلاب نے علیحدگی پسندی کے جذبات کو متحدہ قومیت کے جذبات میں تبدیل کر دیا۔ پھر اسی دور میں یورپ کے گوشے گوشے میں قومی تنظیم کی تحریکیں پھیل رہی تھیں۔ اہل برطانیہ ان سے بھی متاثر تھے۔ چنانچہ یہاں بھی متحدہ قومیت کے جذبے نے خوب زور پکڑا اور ہر شخص اپنے اپنے حلقہ میں مطمئن اور متحدہ قومیت کی لڑی میں پروئے جانے کا متمنی تھا۔ اہل برطانیہ جو جغرافیائی لحاظ سے ایک وحدت پہلے ہی سے تھے اب قومیت کے لحاظ سے بھی ایک وحدت بن گئے۔ انہوں نے دور دراز ملکوں میں غلبہ حاصل کیا امریکہ، آسٹریلیا اور افریقہ میں نوآبادیاں بسائیں۔ پہلے صرف برطانیہ ہی انگریزوں کا ملک سمجھا جاتا تھا۔ پھر کینیڈا، آسٹریلیا، امریکہ، کینیا اور جنوبی افریقہ کے علاقے انگریزوں کی بستیاں بن گئیں، جنہوں نے بعد ازاں ایک برطانوی بلاک کی شکل اختیار کر لی۔

برطانیہ۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے پہلے تجارت و صنعت کے لحاظ سے برطانیہ دنیا کی سب قوموں سے بڑھا ہوا تھا۔ اس کی سلطنت اتنی وسیع ہو چکی تھی کہ اس پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایشیا کا سب سے زرخیز خطہ ہندوستان جسے انگریز سونے کی چڑیا کہتے تھے برطانوی مملکت بن چکا تھا۔ ہندوستان کے نظم و نسق اختیار میں آ جانے کے باعث برطانیہ کی سیاسی اور فوجی طاقت میں بھی معتدبہ اضافہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ بہت سی جنگوں میں ہندوستان کی افواج نے برطانیہ کی زبردست مدد کی بلکہ بعض موقعوں پر ہندوستانی فوجوں ہی کے طفیل برطانیہ کو فتح نصیب ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم میں بھی ہندوستانی افواج نے انگریزوں کی بہت مدد کی۔

جنگ کے زمانہ میں امریکہ برطانیہ کا ایک بڑا تجارتی حریف تھا۔ چنانچہ اس نے جنگ

میں خوب روپیہ کمایا۔ علاوہ ازیں برطانیہ جنگ میں مصروف[1] رہا اور امریکہ اس کی تجارتی منڈیوں پر قبضہ کرتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کے بعد برطانیہ اگرچہ فاتح تھا، تاہم اندرونی طور پر اس کی معاشی حالت خراب ہو گئی۔ مقابلہ میں امریکہ کا خزانہ دنیا کا سب سے بڑا خزانہ بن گیا۔

برطانیہ پہلی جنگ عظیم کے بعد

جنگ ۱۹۱۸ء میں ختم ہو چکی تھی اس وقت لائڈ جارج برطانیہ کا وزیر اعظم تھا چونکہ برطانیہ کو اس وقت روپے کی ضرورت تھی اس لیے لائڈ جارج کے عہد میں نئے ٹیکس لگانے کی تجویز کی گئی۔ ۱۹۲۳ء میں جب بالڈون وزیر اعظم بنا تو نئے ٹیکسوں کی اسکیم تنازع کا باعث بنی ہوئی تھی، جس کے باعث وزارتوں میں ردوبدل ہو رہا تھا۔ بالڈون نے وزارت سے استعفیٰ دیا تو مزدوروں اور اعتدال پسندوں نے مل کر وزارت بنائی۔ مزدور لیڈر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم مقرر ہوا۔ انگلستان کی تاریخ میں یہ پہلی مزدور وزارت تھی۔ میکڈانلڈ عوام کے مفاد کے لیے کئی اصلاحات کرنا چاہتا تھا، مگر اعتدال پسند لیڈر جو اکثریت میں تھے اس کی حمایت نہ کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی سکیموں کو نافذ کرنے میں ناکام رہا۔ نئے ٹیکس لگانا اس کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ نہ ہی مزدوروں کے معتدل مطالبات پورے کر سکتا تھا۔ جب نیا الیکشن ہوا تو پھر قدامت پسندوں کی وزارت قائم ہو گئی اور بالڈون دوبارہ وزیر اعظم بن گیا۔

اب کارخانوں کے بند ہونے اور قیمتوں کے چڑھ جانے سے لاکھوں مزدور بیکار ہو چکے تھے، زیادہ اجرت کے مطالبات کو بالڈون پورا نہ کر سکا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے مزدوروں نے زبردست ہڑتال کر دی۔ آمد و رفت، رسل و رسائل کے تمام وسائل بند ہو گئے۔ اس ہڑتال نے ملک بھر میں ہلچل مچا دی۔ قدامت پسند وزارت کارخانہ داروں کی حمایت کر رہی تھی۔ چنانچہ جب ہڑتال کا معاملہ عدالت میں پیش ہوا تو فیصلہ مزدوروں کے خلاف تھا۔ ہڑتال ختم کر دی گئی اور حالات معمول پر آ گئے۔

اگرچہ ہڑتال ختم ہو گئی، تاہم اس سے کارخانوں، فیکٹریوں، کانوں اور دیگر صنعتی اداروں میں کروڑوں روپے کا جو نقصان پہنچا، وہ برطانیہ کی معاشی حالت کے لیے جو پہلے ہی اچھی نہ رہی تھی، زیادہ ابتر بنانے کا موجب تھا۔ کاروبار کا سلسلہ درہم برہم ہو جانے کے بعد اب اسے نئے سرے سے جمانے میں بہت دشواریاں پیش آئیں۔

بالڈون ۱۹۲۹ء تک وزیر اعظم رہا۔ اس کے بعد دوبارہ ریمزے میکڈانلڈ کو وزارت بنانے کا موقع ملا۔ پھر دنیا میں وسیع پیمانے پر کساد بازاری پھیل گئی۔ تو برطانیہ کا نظام بھی اس رو میں درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

دوسری جنگ کا الارم

۱۹۳۱ء میں مزدور وزارت کو توڑ کر "قومی وزارت" کے نام سے جماعتوں کی مشترکہ وزارت بنائی گئی۔ جس کا وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ ہی تھا اور ۱۹۳۵ء تک اس عہدہ پر فائز رہا۔ اس کے استعفیٰ دینے پر پھر بالڈون نے مسند وزارت سنبھالی۔ اب کساد بازاری کا زور کم ہو چکا تھا مگر بین الاقوامی امن کے لیے نت نئے خطرات پیدا ہونے لگے تھے، روس، اٹلی اور جرمنی کی اسلحہ بندی اور ان کی سرگرمیاں برطانیہ کو ڈراؤنے خواب دکھا رہی تھیں۔

اب بالڈون کی جگہ آسٹن چیمبرلین وزیر اعظم مقرر ہوا۔ عالمی امن کے سلسلے میں اس نے تخفیف اسلحہ کے لیے خاصی کوششیں کیں، مگر اس ضمن میں تمام کانفرنسیں بے کار ثابت ہو رہی تھیں۔ ایک طرف جرمنی کے لاکھوں نوجوان ہتھیاروں سے لیس ہو کر جرمنی کی ذلت کا بدلہ لینے اور دشمنوں کو ہمیشہ کے لیے کچلنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ نازی جماعت جرمن قوم کو مرنے مارنے پر تیار کر چکی تھی۔ دوسری طرف اٹلی کے فسطائی رضا کار دندنا رہے تھے اور موقع پا کر دوسرے ممالک کو ہڑپ کر جانے کی ٹوہ میں لگے ہوئے تھے۔ جاپان نے شمالی چین کا صوبہ ہڑپ کر کے اپنے جارحانہ عزائم کو بے نقاب کر دیا تھا پھر ۱۹۳۷ء میں چین کے خلاف اعلان جنگ کر کے امن عالم کو چیلنج کر چکا تھا۔

برطانوی پالیسی

چیمبرلین نے جنگ کو روکنے کی تمام تدبیریں اختیار کیں وہ نہیں چاہتا تھا کہ جنگ چھڑے یا برطانیہ کسی جنگ میں حصہ لے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء کے آغاز میں اس نے میونخ کے مقام پر سمجھوتہ کر کے اس کی ان تمام فتوحات کو بھی تسلیم کر لیا تھا جو وہ سابق معاہدوں کے خلاف عمل میں لا چکا تھا۔ مگر جرمنی کا دل برطانیہ کی طرف سے کبھی صاف نہ ہوا۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کی طرف سے جرمنی کو جو زک پہنچی تھی، اور اس کے ساتھ جو غیر منصفانہ سلوک ہوا تھا، اس کا بدلہ جرمنی نے ابھی لینا تھا۔ جرمنی کی فتوحات چیمبرلین سے سمجھوتہ کر چکنے کے بعد بھی جاری رہیں اور اب اس کے اثرات برطانیہ پر بھی پڑنے لگے۔ لہٰذا برطانیہ کا خاموش رہنا ناممکن ہو گیا۔

وزارتی ردوبدل

چیمبرلین کا صلح پسندانہ رویہ اہل برطانیہ کے لیے نقصان دہ سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ بھی جنگ میں کود پڑا[2] اور چیمبرلین کو منصب وزارت سے ہٹا کر ۱۹۴۰ء میں اس کی جگہ چرچل کو وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سونپ دیا گیا جسے مزدور پارٹی کی تائید حاصل ہو گئی۔

جنگ کے اختتام تک مزدور تحریک کی جڑیں بھی خاصی مضبوط ہو چکی تھیں، چنانچہ ۱۹۴۵ء میں جب نئے انتخابات عمل میں آئے تو برطانیہ کی تاریخ میں پہلی بار مزدور پارٹی ایوان کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی۔

مزدور وزارت کے کارنامے

مزدور پارٹی کو عوام کی زبردست تائید حاصل ہو گئی، اس پارٹی نے قومی سرمائے کو خفیہ الماریوں اور مضبوط تجوریوں سے نکال کر قومی اور ملکی بہبود میں لگانے اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ اس پارٹی نے جو لائحہ عمل وضع کیا، اس کے مطابق سرمایہ دار کا تقریباً ۹۵ فیصد نفع سرکاری خزانے میں جانے لگا۔ سرمایہ داری اگر مکمل طور پر ختم نہ ہوئی تو کم از کم اعتدال پر ضرور آ گئی۔ سارے ملک میں شاید ہی کوئی شخص ایسا رہ گیا تھا جس کی ذاتی آمدنی چھ ہزار پونڈ سے زیادہ تھی۔

مزدور وزارت نے بڑی بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت بنا دیا اور تین چار سال کے عرصہ میں بنک، بجلی گھر، کوئلے کی کانیں، گیس بنانے کے کارخانے، ریلوے، فولاد اور لوہے کا کاروبار وغیرہ اہم سلسلے قومی ملکیت بنا دیئے گئے۔ اس طرح برطانوی عوام کو کمیونزم سے بچانے کا ایک ذریعہ پیدا ہو گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانوی سیاست

دوران جنگ دنیا کے سیاسی صنعتی اور اقتصادی حالات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور مختلف ملکوں کے لیے جن نئے سیاسی تقاضوں نے جنم لیا ان کے پیشِ نظر برطانیہ نے اپنی داخلی و خارجی سیاست میں یکسر تبدیلی پیدا کر لی ۱۹۱۸ء

۱؎ پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کی کارگزاریوں کا مفصل ذکر اس جنگ کے علیحدہ باب میں دیکھیے

۲؎ دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کی کارگزاریوں کی مفصل داستان اس جنگ کے علیحدہ باب کے تحت دیکھیے۔

میں ہندوستان برما اور سیلون جیسے نادر ملکوں کو جو مدت سے اس کے حلقہ سلطنت میں چلے آتے تھے، آزاد کر دیا۔ برطانیہ نے ان ملکوں کی تمنّاؤں کا احساس کرتے ہوئے انہیں بروقت آزاد کر کے سیاسی بیدار مغزی کا ثبوت دیا۔

۱۹۵۰ء میں برطانیہ میں نیا الیکشن ہوا۔ اس دفعہ عام خیال یہ تھا کہ مزدور پارٹی ہار جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اگرچہ اسے کچھ نشستوں کی قربانی دینی پڑی۔ تاہم اکثریت اسی کو حاصل رہی مگر پوزیشن متزلزل رہی۔

۱۹۵۱ء کے انتخابات میں مزدور پارٹی ہار گئی اور مسٹر چرچل کنسرویٹو پارٹی کے لیڈر کی حیثیت میں وزیراعظم بن گئے۔ انہوں نے بڑھاپے کے باعث استعفیٰ دے دیا تو ان کی جگہ مسٹر انتھونی ایڈن نے لے لی۔ مصر سے جھگڑا چلتا رہا۔ اس جھگڑے نے تھوڑی ہی دیر میں نازک صورت اختیار کر لی۔ اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا۔ برطانیہ اور فرانس بظاہر نہر کو محفوظ رکھنے کے لیے اور حقیقتاً مصر کی جنگی قوت کو تباہ کرنے کے لیے جنگ میں کود پڑے جمہوریہ امریکہ اور دوسرے ملکوں کی ہمت سے جنگ رکی۔ فرانس، امریکہ اور اسرائیل تمام مقبوضہ علاقوں سے دست برداری پر مجبور ہوئے۔ امن دوبارہ قائم ہو گیا۔ ایڈن نے خرابی صحت کی بنا پر استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ مسٹر میکملن کو وزیر بنایا گیا۔

باب ۵

روس

تمہید

روس اشتراکی انقلاب کا نقیب اول ہے۔ اشتراکی تحریک کا علم بردار مارکس تھا جو جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس تحریک کے ذریعے اس نے ایک مرتبہ سنجیدہ انقلاب لانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ پھر یہ تحریک جلسے جلوسوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر مارکس کی وفات کے چونتیس سال بعد ۱۹۱۷ء میں اس تحریک کا پودا روس کی سرزمین میں لگایا گیا۔ اس کے لیے سب سے بڑھ کر ساز گار اسباب پیدا کرنے کے ذمہ دار خود تاجداران روس تھے۔

مارکسزم

سوشلزم یا اشتراکیت کے نظریات مارکس سے پہلے بھی موجود تھے، مگر یہ خیالات ایک مکمل فلسفے کے طور پر اس وقت سامنے آئے جب ۱۸۶۷ء میں مارکس کی کتاب "کیپٹل" یعنی "سرمایہ" کے نام سے دنیا کے سامنے آئی۔

مارکسی نظریات کے مطابق معاشی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے زندگی کے تمام معاشرتی، مذہبی، تاریخی اور سیاسی نظریات کو ایک نئی بنیاد پر قائم کرنا ضروری ہے۔ مارکس کا کہنا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ معاشیات سے غیر متعلق نہیں، چنانچہ مارکس اپنے معاشی نظریے کی تکمیل کے لیے خیالات و عقائد کی اگلی پچھلی تمام عمارتوں کو ڈھا دینا ضروری خیال کرتا ہے۔

زار روس

انیسویں صدی کے اوائل میں روس میں زار کی حکومت تھی جو مطلق العنانی کا بہترین نمونہ تھی وہ دنیوی سردار ہونے کے ساتھ مذہبی پیشوا بھی سمجھا جاتا تھا۔ زار اپنے آپ کو عیسائی دنیا کا محافظ بھی قرار دیتا تھا کلیسا اور دربار دونوں جگہ وہ عقیدت و اطاعت کی گردنیں اپنے سامنے خم دیکھنا چاہتا تھا۔ ملک کی معاشی حالت کا عالم یہ تھا کہ فقر و افلاس انتہا کو پہنچ چکے تھے، جس کے نتیجے میں لوگ حکومت سے نالاں تھے۔

عوام کی حالت سدھارنے اور ان میں تعلیم پھیلانے کی جتنی کوششیں کی گئیں انہیں انقلاب برپا کرنے کی کوششیں سمجھا گیا اور تحریک کے ذمہ داروں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ اصلاح و فلاح کی شدید مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے خدمت گزاروں میں ایک گروہ تشدد کا حامی بن گیا۔ انہوں نے بڑے بڑے سرکاری ملازموں ہی نہیں خود زاروں پر بھی قاتلانہ حملے کیے۔ چنانچہ زار الیگزنڈر دوم پر کئی حملے ہوئے۔ وہ ہر مرتبہ بچ نکلا۔ آخر مارا گیا۔ دوسرے ملکوں میں اس تحریک کے شاخسانے پھوٹے۔

غرض حکومت کے خلاف عوام کا غم و غصہ روز بروز بڑھتا رہا۔

اشتراکی انجمنیں

اشتراکی خیالات پہلے سے موجود تھے ۱۸۹۷ء میں مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک اشتراکی جماعت بنائی گئی۔ اس جماعت کا الحاق یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کی اشتراکی جماعتوں سے تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ اس کے ممبر بننے لگے اور جلد ہی اس جماعت نے اچھی خاصی قوت حاصل کر لی۔

زار روس کو جو جسمانی و روحانی باپ بننے کا دعویٰ رکھتا تھا اور اپنے کسی حکم کے سامنے کوئی دلیل سننے کے لیے تیار نہ تھا، یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی حکومت کے خلاف ملک میں کوئی جماعت قائم ہو۔ اگرچہ اشتراکی جماعت کی پالیسی ابھی تک امن پسندانہ تھی۔ تاہم زار نے اسے کچلنے کے لیے تشدد سے کام لیا۔ اس سے روسی مزدوروں کے جذبات اور مشتعل ہوئے، لینن اور ٹراٹسکی کی سرکردگی میں روسی حکومت کا تختہ الٹ دینے کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں شدت اختیار کر گیا۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لینن، ٹراٹسکی اور اسٹالن کے ضروری حالات بتا دیئے جائیں، کیونکہ زار روس کا تختہ الٹ کر روس میں اشتراکی نظام قائم کرنے کے اصل ذمہ دار یہی لوگ تھے۔

لینن

لینن ایک معلم کا لڑکا تھا ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا۔ ابتدا ہی سے وہ افراد کے غیر منصفانہ طرز عمل اور جبر و استبداد کی چیرہ دستیوں کے خلاف تھا۔ تعلیم کے دوران اس قسم کے مظاہروں کے موقع پر ہمیشہ اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ظلم و تشدد کی شدید مخالفت کی۔ اس کا بڑا بھائی بھی انقلابی تھا۔ چنانچہ اس بیچارے کو نوجوانی ہی میں پھانسی دے دی گئی۔ اس واقعے نے لینن کو اور بھی پکا انقلابی بنا دیا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد وکالت پاس کرنے کے لیے اسے سینٹ پیٹرس برگ (پیٹروگراڈ) بھیجا گیا۔ مگر اس کی سرگرمیوں کے باعث اسے سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۰۰ء میں رہائی ملنے پر پیرس اور پھر لندن گیا۔ ۱۹۰۵ء میں جب روس میں بغاوت کی وجہ تو وطن پہنچا۔ بغاوت ناکام ہوئی تو سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ جہاں "بین الاقوامی اشتراکیت" کا بڑا رہنما بن گیا۔

ٹراٹسکی

ٹراٹسکی روس کا مشہور ادیب گزرا ہے جس نے میدان سیاست میں بہت کام کیا۔ اشتراکی جوش و خروش میں لینن سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ۱۸۹۸ء میں انقلاب پسندی کے جرم میں سائبیریا بھیجا گیا۔ جہاں سے چھپ کر بھاگ نکلا اور لندن پہنچا۔ لندن میں لینن پہلے ہی سے موجود تھا۔ ۱۹۰۵ء کی بغاوت کے موقع پر دونوں واپس ہوئے۔ اس دفعہ اسے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ مگر وہ بھاگ گیا۔ جہاں ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس تک وہیں اشتراکی انجمن کا سرگرم لیڈر رہا۔ ٹراٹسکی نے انقلاب روس کی تاریخ تین جلدوں میں لکھی ہے یہ کتاب اس کی ادبی صلاحیتوں کا شاہکار ہے۔

اسٹالن

سٹالن لینن کا دوست اور اس سے عمر میں نو سال چھوٹا تھا۔ اس کا باپ موچی تھا۔ اس نے اپنی بساط کے مطابق اسے مذہبی تعلیم دے کر پادری بنانا چاہا، مگر سٹالن کی انقلاب پسندانہ طبیعت نے اسے پادری نہ بننے دیا۔ سترہ سال کی عمر ہی میں اس نے انقلابی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس وقت اشتراکی جمہوری پارٹی جو جیا کے صوبے میں شورشیں برپا کر رہی تھی۔ سٹالن بھی اس پارٹی میں شریک ہو گیا چنانچہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۳ء تک وہ متعدد مرتبہ گرفتار ہو کر جیل گیا، مگر ہر مرتبہ فرار ہوتا رہا۔ آخر، سے

چار سال کے لیے سائبیریا میں جلا وطن کر دیا گیا۔

انقلابی رو

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، حکومت روس کا تختہ الٹنے کے لیے مزدوروں نے اشتراکی انجمنیں بنا کر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ٹراٹسکی اور لینن ان کے رہنما تھے، زار روس نے انہیں دبانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر یہ جوش بڑھتا چلا گیا۔

۱۹۰۵ء میں جب زار روس نے جاپان سے شکست کھائی تو موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشتراکیوں نے بغاوت کر دی۔ مگر شاہی فوجوں نے اسے سختی سے کچل دیا۔ اب اشتراکیوں نے محسوس کیا کہ کسی ایک ملک میں اشتراکی بغاوت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کے تمام مزدور متحد ہو کر ایک ہی وقت میں بغاوت کریں۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس وقت سے مزدوروں میں ایک طرح کا عالم گیر وفاق قائم کر دیا گیا اور ان کی تحریک بین الاقوامی شکل اختیار کر گئی۔

انقلاب روس

پہلی جنگ عظیم کے موقع پر روسی فوجیں، جرمنی اور ترکی کے خلاف صف آرا ہوئیں۔ انہوں نے شکست کھائی تو نہ صرف فوج میں بددلی پھیلی، بلکہ عوام میں بھی زار روس کے خلاف ایک عام تحریک پیدا ہو گئی۔ لیکن اس انقلابی تحریک کی باگ ڈور لینن کی پارٹی کے ہاتھ میں نہ تھی، جس کا نام بالشویک رکھا گیا تھا، بلکہ دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ لینن اس وقت روس سے باہر تھا، وہ جرمنی میں سے گزرتا ہوا روس پہنچا اور تحریک اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ کامیاب نہ ہو سکا، تو وہ اور اس کے ساتھی روپوش ہو گئے۔ چند مہینے میں تمام دوسرے لیڈر ناکام ہو گئے۔

۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو لینن اور اس کے ساتھی باہر نکلے اور انہوں نے اسے معزول کر کے جمہوریت قائم کر لی اور ۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو لینن نے ایوان پر دھاوا بول کر اعتدال پسندوں کا قلع قمع کر دیا اور باقاعدہ بالشویک حکومت کا اعلان ہو گیا۔

یہ ساری کارروائی اس پھرتی سے انجام پائی کہ جو غیر ملکی سفیر اور نمائندے روس میں بیٹھے تھے، ان کو بھی کچھ پتہ نہ چلا۔

اشتراکی نظام

بالشویک حکومت نے سیاست و معیشت کا جو نیا نظام رائج کیا، وہ یہ تھا۔

۱۔ روس کی تمام دولت اور وسائل کو حکومت کی ملکیت قرار دیا۔

۲۔ غیر ممالک سے تجارت کرنے کے تمام اختیارات حکومت نے سنبھال لیے۔

۳۔ زار کے زمانے کے جتنے قرضے غیر ممالک کو ادا کیے جانے تھے وہ سب منسوخ کر دیئے گئے۔

۴۔ حکومت نے کسانوں سے مقرر کردہ قیمت پر غلہ خریدنے کا اعلان کر دیا۔ حکم عدولی کرنے والے کے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی۔

۵۔ افراد کی ذاتی املاک کو ختم کر کے دولت کو قوم کی مشترکہ ملکیت قرار دے دیا گیا۔ اشتراکی حکومت قائم ہو چکی تھی مگر ابھی روسی فوجیں جرمنی سے برسرپیکار تھیں۔ اشتراکی حکومت نے جرمنی سے صلح کر لی۔ اشتراکی نظام حکومت سے جن اداروں کے مفادات پر زد پڑتی تھی، وہ اس کے خلاف صف آرا ہو گئے، چنانچہ روس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

دوسری طرف اتحادیوں نے اس نظام کی شدید مخالفت شروع کر دی مگر حکومت نے تمام مشکلات پر قابو پانے کا تہیہ کر لیا۔ جن لوگوں نے اشتراکی نظام سے سرتابی کی، انہیں باغی قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۱۸ء سے ۱۹۱۹ء تک سات ہزار باغی قتل ہوئے۔ اس طرح سارا روس بالشویک حکومت کے پنجے میں آ گیا۔

ایک نیا اقتصادی پروگرام بنایا گیا۔ جس کے ماتحت کاشت کاروں سے سمجھوتہ کیا گیا۔ طے ہوا کہ کاشت کاروں سے غلہ کی ایک خاص مقدار ٹیکس کے طور پر وصول کی جائے۔ کارخانوں اور صنعتی اداروں پر ابتدا ہی سے حکومت نے شدید تسلط قائم کیا تھا۔ بعد ازاں اسے کم کر دیا گیا۔ غیر ملکی تاجروں کو روس میں کاروبار کرنے کے لیے کچھ مراعات دی گئیں۔ کھانے پینے کے لیے اشتراکی حکومت نے پہلے ٹکٹ یا راشن کارڈ جاری کئے تھے۔ اب یہ ترک کئے گئے۔ ان اصلاحات نے کسانوں اور شہریوں کو اپنی اپنی جگہ پر مطمئن کر دیا۔

پہلا دستور اساسی

۱۹۲۳ء میں اشتراکی نظام کا پہلا دستور شائع ہوا۔ زار کے عہد میں اقلیت اور اکثریت کو خلط ملط رکھا جاتا تھا۔ اس نئے دستور کے مطابق اقلیتوں کو خاص مراعات دی گئیں۔ ان کا جداگانہ وجود تسلیم کیا گیا جو علاقے تہذیب و تمدن یا زبان و قومیت کے لحاظ سے مشترک تھے، ان میں علیحدہ علیحدہ جمہوریتیں قائم کی گئیں اور انہیں اپنے معاملات میں آزاد کر دیا گیا۔ مختلف قوموں اور نسلوں کو تہذیبی خود مختاری دی گئی۔ لیکن معاشی ترقی کا تعلق مرکزی حکومت کے ساتھ باقی رکھا۔ محنت کشوں اور مزدوروں کو حکومت میں زیادہ دخل دیا گیا۔ مذہب کے نام پر مختلف اداروں کو جو امداد ملتی تھی، وہ بند کر دی۔

لینن کے کارنامے

بالشویک حکومت کی رہنمائی ۱۹۲۴ء تک لینن نے کی۔ لینن روس کی ایک بڑی مقتدر شخصیت ہے۔ اشتراکی حکومت اسی کی بدولت قائم ہوئی۔ اسی نے کسانوں کو زمینداروں سے زمین دلائی، اسی نے اتحادیوں کے حملوں کی مدافعت کر کے، روس کی آزادی کو تسلیم کرایا، اسی کے حسن تدبیر سے روس میں خانہ جنگی ختم ہوئی۔ اقلیتوں کو کامل خود اختیاری اسی نے دلائی۔ ملک کی معاشی ترقی کے راستے نکالے اور اس نے ملک کے سامنے ترقی کی ایک وسیع شاہراہ کھول دی۔

پارٹی کے اختلافات

۱۹۲۴ء میں لینن کی وفات کے بعد ملک کی باگ ڈور تین ممبروں کی ایک کمیٹی کے سپرد کی گئی، جس میں کامنیف، زنوویف اور سٹالن شامل تھے۔ ٹراٹسکی پہلے وزیر جنگ تھا، ۱۹۲۵ء میں اسے وزیر بنایا گیا۔ مگر کچھ مدت بعد ٹراٹسکی کو پارٹی کے خلاف اعتراضات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر سٹالن نے دوسرے دونوں ممبروں کو کمیٹی سے نکال باہر کیا، اور اقتدار خود سنبھال لیا۔ پھر ۱۹۲۷ء میں ٹراٹسکی کو روسی ترکستان جلا وطن کر دیا گیا۔ پھر وہ ملک سے بھی نکلا اور میکسیکو میں پناہ گزین ہوا۔ وہاں ۱۹۴۰ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔ دنیا نے سمجھا کہ یہ سب کچھ سٹالن یا روسی حکومت کے ایما سے ہوا۔

اسٹالن کا عروج

اس کے بعد اسٹالن روس کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اس نے صنعتی اور زرعی ترقی کا ایک پنجسالہ منصوبہ بنایا، جس پر ۱۹۲۸ء میں عمل شروع ہوا۔ اس منصوبے کے تحت زمین کی انفرادی ملکیت کو ختم کر کے اسے اجتماعی ملکیت بنا دیا گیا، تاکہ اس کے نفع میں سب کا یکساں حصہ ہو، اور محنت بھی سب مل جل کر کریں۔

اس منصوبے کے ماتحت روس نے صنعتی لحاظ سے بھی خوب ترقی کی۔ ۱۹۳۳ء میں دوسرا پنجسالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس کے نتائج بھی خوشگوار نکلے۔

دوسرا دستور اساسی

روس کا پہلا دستور ۱۹۲۳ء میں تیار ہوا تھا۔ اب اس میں تبدیلی کر کے ۱۹۳۶ء میں دوسرا دستور کیا گیا۔

جس میں خفیہ ووٹ کا اصول رائج ہوا۔ نیز یہ اعتراض بھی رفع کیا گیا کہ روس میں کمیونسٹ پارٹی کے سوا کوئی دوسری پارٹی بنانے کی اجازت نہیں۔

طرز حکومت

ضلعوں، شہروں اور دیہات میں محنت کشوں کی منتخبہ پنچایت حکومت کرتی ہے۔ یہی افراد اپنی سوویت ایٹ کی مجلس عاملہ منتخب کرتے ہیں ایک صدر اور ایک نائب صدر چنا جاتا ہے۔ ہر انتخاب دو سال کے لیے ہوتا ہے عدالتوں کے جج بھی ایک مقررہ میعاد کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔

وفاقی جمہوریت اور مرکزی جمہوریت میں اعلیٰ حکمران جماعت مجلس اعلیٰ کہلاتی ہے جو چار سال کے لیے منتخب ہوتی ہے۔ عدالتوں کے منصفوں کو شہری منتخب کرتے ہیں اس انتخاب میں ہر بالغ ووٹ دے سکتا ہے۔ تعلیم یا جائیداد کی کوئی قید نہیں تمام عدالتوں میں جیوری کے طور پر پبلک کے کچھ افراد بھی مقدمے کی سماعت کرتے ہیں۔ جج ان کے مشوروں سے فیصلہ کرتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ اعلیٰ تعلیم بھی مفت دی جاتی ہے۔ انقلاب کے وقت روس میں صرف تیس فیصد افراد خواندہ تھے۔ اشتراکی نظام قائم ہو جانے کے بعد روس نے تعلیمی لحاظ سے بہت ترقی کی۔ ہر زبان میں تعلیم کا انتظام کر دیا گیا۔

۱۹۴۱ء میں جب روس کے خلاف جرمنی نے اعلان جنگ کیا اور روس کو مجبور ہو کر جنگ میں کودنا پڑا تو اس طرح روس نے اس میں بڑی مصیبتیں اٹھائیں اور اسے بڑے نقصان پہنچے۔ تاہم یہ جنگ ایک علیحدہ باب میں مذکور ہے۔

جرمنی کے حملے سے روس کو زبردست نقصان پہنچا تھا۔ جنگ کے خاتمہ پر اڑھائی کروڑ روسی بے خانماں ہو چکے تھے۔ بہت سا علاقہ برباد ہو گیا تھا اور بظاہر اس سے عہدہ برآ ہونا مشکل نظر آتا تھا۔ مگر روس نے بڑی خوش اسلوبی سے ان نقصانات کی تلافی کی اور خارجی تعلقات بھی خوب نبھائے۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں چوتھا پنجسالہ منصوبہ بنایا گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ جنگ سے پیشتر روسی صنعت و حرفت کی جو کیفیت تھی، اسے دگنا بہتر بنایا جائے۔ ۱۹۴۷ء میں غذائی راشن ختم کر دیا گیا۔ روس اور اس کے ساتھیوں نے باہمی اقتصادی بہتری کے لیے ایک کونسل قائم کی ستمبر ۱۹۴۹ء میں دنیا کو پہلی بار معلوم ہوا کہ روس ایٹم بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں موت کی سزاؤں کی منسوخی کا اعلان کیا گیا۔ فروری ۱۹۵۰ء میں جمہوریہ چین کے ساتھ تیس سال کے لیے اتحاد کا معاہدہ ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں انتخابات میں سٹالن کی پارٹی کو ۹۹ فیصد ووٹ ملے۔ ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو سٹالن نے انتقال کیا، اس کی جگہ مالنکوف کو لیڈر بنایا گیا اور وہ وزراء کی کونسل کا صدر بھی بن گیا۔ مولوٹوف، بیریا، بلگانن اور کاگانووچ وزراء کی کونسل کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ بعد ازاں مالنکوف نے کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی صدارت چھوڑ دی ۲۳ دسمبر ۱۹۵۳ء کو روس کے نائب وزیراعظم بیریا پر غداری کا الزام لگایا گیا۔ فوجی عدالت نے اسے پھانسی کی سزا دی۔ روس نے مشرقی جرمنی کی حکومت کو پورے اختیارات دے دیے۔ اپنے قبضے کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ مگر اپنی فوج عارضی طور پر وہیں رہنے دی ۸ فروری ۱۹۵۵ء کو روسی وزیراعظم مالنکوف نے استعفیٰ دے دیا اور بلگانن وزیراعظم مقرر ہوا۔ مارشل ژوکاف نے وزیر دفاع کا منصب سنبھالا۔ اسی سال اگست میں روس نے اعلان کیا کہ وہ اپنی فوج میں چھ لاکھ چالیس ہزار کی کمی کر رہا ہے۔ یہ بھی اعلان ہوا کہ روس تمام پسماندہ عرب اور ایشیائی ملکوں کو صنعتی فنی اور زرعی ساز و سامان سے مدد دے گا۔

باب ۶

جاپان

تمہید

براعظم ایشیا کے جنوب مشرق میں بحر الکاہل کے متعدد جزیروں کے اس ملک کی تاریخ کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح سے ہوتا ہے۔ مگر اس وقت تک کی یہ تاریخ محض افسانوی ہے۔ صحیح اور مستند تاریخ ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے جب بدھ مت یہاں داخل ہوا۔ بدھ مذہب ہندوستان سے چین پہنچا، پھر کوریا کے راستے جاپان میں آیا۔ جغرافیائی اعتبار سے چین کے ساتھ جاپان کا قریبی تعلق تو پہلے ہی سے تھا لیکن جب چین کی وساطت سے جاپانیوں نے بدھ مت قبول کیا تو چین کے تہذیبی اثرات بھی جاپان پر پڑے اور جاپانی معاشرت پر چینی رنگ غالب آنے لگا۔ اسی زمانے میں چین تہذیب و تمدن کے لحاظ سے جاپان سے بہت آگے تھا۔ چنانچہ چینی اثرات نے جاپان کو تہذیبی اعتبار سے ترقی کرنے میں مدد دی۔ رفتہ رفتہ درباری رسوم، سرکاری خطابات، ملکی و معاشرتی قوانین و ضوابط اور سیاسی نظام کے سلسلے میں جاپانیوں نے چینیوں کی پیروی کی۔ بادشاہ کو خدا قرار دے کر اس کی پرستش کرنے کی رسم بھی جاپانیوں نے چینیوں سے لی۔ یہ اثرات مدتوں جاپانی معاشرت پر غالب رہے۔ بعد ازاں ان میں کمی واقع ہو کر جاپان نے چینیوں سے الگ راستہ اختیار کیا۔

مغربی اقتدار

پندرھویں صدی کے نصف میں مغربی اقوام نے جاپان میں دخل دینا شروع کیا۔ پہلے پرتگالی تاجروں نے یہاں کچھ مراعات حاصل کیں۔ پھر ڈچ اور انگریز آئے۔ بعد ازاں امریکہ اور روس نے پاؤں پھیلائے مغربی رسوخ حد سے بڑھنے لگا۔ تو شاہ جاپان نے خطرے کے پیش نظر ڈچ اور چینیوں کے سوا باقی تمام غیر ملکیوں کو ملک سے نکال باہر کیا۔ مگر امریکہ نے بدستور پاؤں جمائے رکھے۔ عوام کسی بھی غیر ملک کو اپنے ملک میں اثر قائم رکھنے نہ دے سکتے تھے۔ لہذا ملک میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ جس نے شاہ جاپان کے خلاف بغاوت کھڑی کر دی اور جاگیری نظام کی بنیادیں ہلنے لگیں۔

پہلا انقلابی دور

بغاوت نے بلووں اور ہنگاموں کی شکل اختیار کر لی، ملک میں خانہ جنگی پیدا ہو گئی۔ اب بادشاہ مجبور تھا کہ بحالی امن کے لیے نظام سلطنت عوام کے حسب منشا قائم کرے، چنانچہ ۱۸۶۹ء میں جاپانی عوام نے پہلی مرتبہ جمہوریت کا منہ دیکھا۔ قومی پارلیمنٹ قائم کر دی گئی پھر ۱۸۸۹ء میں پہلا دستور اساسی تیار ہوا جس میں جاپانی بادشاہ کو پہلی مرتبہ آئین کا پابند بنایا گیا۔ اب دنیا کے ساتھ جاپان کا باقاعدہ ربط قائم ہو چکا تھا، مگر جاپان کی اہمیت کا اندازہ دنیا کو ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ جب اس نے روس پر حملہ کر کے شمالی چین چھین لیا۔

پرانا جاپان

اٹھارویں صدی کے نصف تک جاپان، ذہنی، تہذیبی اور سیاسی لحاظ سے ایک پسماندہ ملک تھا۔ جزیروں کے اس ملک میں توہم پرست تنگ نظر اور غیر متمدن لوگ رہتے تھے۔ یہ لوگ نہ کسی دوسری قوم کو اپنے ملک میں آنے دیتے تھے، نہ ہی خود اپنے ملک کے باہر قدم رکھنا پسند کرتے تھے۔ بادشاہ کی نسبت عقیدہ یہ تھا کہ وہ سورج دیوتا کی اولاد سے ہے۔ اس تقدس کی بنا پر اپنی ہر خواہش پر اسے پورا اختیار تھا۔ سترھویں صدی کے آخر میں بدھ مت کو خیرباد کہا جا چکا تھا اور اس کی جگہ جاپان کا قدیم شنٹو مذہب، ملک کا عام مذہب قرار دیا گیا تھا۔ اس مذہب کی باگ ڈور جن پنڈتوں اور پروہتوں کے ہاتھ میں تھی، اس نے توہم پرستی اور تنگ نظری کے مختلف عقیدوں کو رواج دے کر عوام پر اپنے مذہبی اقتدار کا سکہ بٹھا رکھا تھا۔ بادشاہ، بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار ان مذہبی اجارہ داروں کی وساطت سے عوام کو اپنے پنجوں میں اس طرح جکڑے ہوئے

تھے کہ کوئی ان کی مرضی اور منشا کے خلاف قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔ مذہب کے نام پر ہر قسم کے احکام صادر کر کے ان پر عمل کرایا جاتا۔ اس صورتِ حال نے عوام کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ جہالت اور لاعلمی کے اندھیرے میں ذلت کے دن بسر کر رہے تھے۔

جب مغربی اقوام نے چین کی معاشیات پر قبضہ جمایا اور چین کے عوام میں نئے خیالات نے رواج پایا، تو جاپان کے چند حساس نوجوانوں نے بھی اس سے اثر قبول کیا۔ پھر جنوب میں آسٹریلیا کی نئی دنیا اور بحرالکاہل کے اس پار امریکہ کی نئی تہذیب نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ یورپ کی تحریک اصلاحِ مذہب اور صنعتی انقلاب نے انہیں جمہوریت اور صنعت کا درس دیا۔ نئی دنیا کے نئے تقاضوں نے جاپانیوں کو جھنجھوڑا، وہ خوابِ غفلت سے جاگے اور ایک نیا عزم اور نیا ارادہ لے کر اٹھے۔

نیا جاپان

سنہ ۱۸۶۸ء میں جاپانیوں کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ انہوں نے غیر ملکی سیاحوں پر اپنی بندرگاہوں کے راستے کھول دیئے، انہیں اپنے ملک میں آنے کی کھلی اجازت دے دی۔ خود بھی کمر ہمت باندھ کر جاپان کی حدود سے باہر نکلے، غیر ممالک میں پہنچے، وہاں کے حالات سے اپنے آپ کو روشناس کیا، جاپانی نوجوانوں کو تعلیم اور صنعت و حرفت کی غرض سے یورپ اور امریکہ بھیجا گیا۔ اقتصادیات اور سیاسیات کے نئے نئے اصولوں سے آگاہی حاصل کی گئی۔ پھر جب ان پر عمل کرنا سیکھا تو جاگیری نظام خود بخود ختم ہو گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ترقی کا احساس اتنی شدت اختیار کر گیا کہ چند سال کے اندر ہی مدد آپ کے اصول نے انہیں معاشی اور اقتصادی لحاظ سے بھی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کے ہم پلہ بنا دیا۔ نظامِ حکومت جمہوری اصولوں پر بنایا گیا۔ اگرچہ بادشاہت کی حیثیت پہلے کی طرح اوتار جیسی ہی سمجھی جاتی رہی، تاہم اس کے اختیارات مطلق العنانی کی حد تک نہ جانے دیئے گئے۔ پارلیمنٹ کی بنیاد ڈالی گئی۔ وزیروں کا انتخاب عمل میں لایا جانے لگا جو ہر مسئلے میں پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتے۔ بادشاہ کو مشورہ دینے کے لیے تجربہ کار افراد کی ایک مجلس بنائی گئی۔ مسلح افواج کو پارلیمنٹ کی دستبرد سے الگ رکھا گیا۔

جاپانیوں کی وطن پرستی

جاپانیوں میں وطن پرستی کا جذبہ جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ جاپانیوں نے روحانیت اور الوہیت کو بھی وطن پرستی میں شامل کر دیا ہے۔ جاپانی اپنے آپ کو سورج دیوتا کی خاص الخاص سرپرستی میں سمجھتے ہیں۔ اس عقیدے کو نظامِ سیاست کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ چنانچہ اپنے وطن اور بادشاہ کے لیے جان دینا عین مذہب ہے۔ بادشاہ کو اوتار کا درجہ دینے کی وجہ بھی یہی ہے۔

وطن پرستی کے اس عقیدے نے جاپانیوں میں سیاسی یک جہتی کی فضا پیدا کر دی۔ جاپانیوں میں باہم مل کر کام کرنے کا شدید جذبہ پیدا ہو گیا۔ سرکاری سرمائے کی مدد سے صنعتی اداروں کو ترقی دے کر ملک کی صنعتی اور معاشی حالت کو بہتر بنایا گیا۔ جاپان کی خاص پیداوار یعنی ریشم کے کیڑوں کو وسیع پیمانے پر منظم کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال کے اندر اندر جاپان ایک منظم متحد اور خوشحال سلطنت بن گیا۔

روس سے جنگ

چین کا شمالی جزیرہ کوریا جاپان کے عین سر پر واقع ہے۔ ملکی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ وہ جاپان ہی کے پاس رہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۵ء میں جاپان نے اسے فتح کر کے وہاں آزاد حکومت قائم کر دی، پھر سنہ ۱۹۰۵ء میں اسے جاپانی نظامِ حکومت کے تحت کر دیا گیا اور سنہ ۱۹۱۰ء میں جاپان ہی کا جزو بنا دیا گیا۔

جاپانی اور روسی ہمیشہ ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھتے رہے ہیں اس لیے کہ ان کے مفادات آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ کوریا پر جاپانی قبضے نے روس کو نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ اس نے روس کی حدود سے منچوریا تک ریلوے لائن بچھا دی۔ جاپان کے لیے روس کا یہ طرزِ عمل خطرناک تھا۔ اس نے سنہ ۱۹۰۴ء میں برطانیہ کی امداد سے روس پر حملہ کر دیا اور اسے شکست دی۔ جاپان کی اس فتح نے اسے ایشیا کی بڑی طاقتوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران

بعد ازاں سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جاپان اتحادیوں کو باآسانی اسلحہ مہیا کرتا رہا۔ جس نے اسے بہت بڑی دولت کا مالک بنا دیا۔ جنگ کے دوران جاپان نے ایشیائی ممالک میں اپنی تجارت کو فروغ دے کر خوب دولت کمائی۔ علاوہ ازیں اتحادیوں کی حمایت کے صلے میں جنگ کے خاتمہ پر مشرقِ بعید میں جرمنی کے تمام مقبوضات جاپان کو مل گئے۔ اسے لیگ آف نیشنز کی مجلس عاملہ کا ممبر بھی بنا لیا گیا۔ گویا اب برطانیہ اور روس کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جانے لگا۔

جنگ کے بعد

جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی جاپان کی تجارت معمول پر آ گئی۔ دورانِ جنگ اسلحہ بیچ کر وہ کروڑوں روپے کا منافع کماتا رہا۔ مگر جنگ کے بعد اسلحہ کی فروخت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اب اس نے اپنی تجارت کو دوسری شکل میں پھیلانے کے لیے اردگرد چین کی منڈیوں، اور جنوب میں ولندیزی جزائر (انڈونیشیا) پر اثر و رسوخ قائم کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لیے جاپان اپنی بحری طاقت میں اضافہ کرنے لگا۔ پھر ان علاقوں پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ مغربی طاقتوں نے بھانپ لیا اور جاپان کو اس طرزِ عمل پر ٹوکا جس پر جاپان نے اپنے بحری بیڑے میں کمی کرنے کا وعدہ کیا۔ چین کی منڈیوں پر قبضہ جمانے سے بھی باز رہنے کا عہد کیا۔ جاپان کی اس صلح کن پالیسی پر دوسرے ممالک نے مسرت کا اظہار کیا۔

اب جاپان نے اندرونی معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے ملکی صنعت کو ترقی دی۔ بڑے بڑے کارخانے کھولے مگر اس سے مزدوروں اور کارخانہ داروں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ عام لوگوں کے ذرائعِ آمدنی کم ہو گئے۔ معاشی مسائل روز بروز الجھتے چلے گئے، غربت و تنگدستی بڑھنے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ جاپانیوں میں سوشلزم کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ دوسری طرف جاپانی اپنے ہمسایہ ملک روس کے خیالات سے بھی متاثر تھے یہ حالات سرمایہ داروں کے لیے خطرہ کا باعث تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۸ء میں کسانوں اور مزدوروں کی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ ایک قانون پاس کیا گیا کہ حکومت جاپان کا تختہ الٹنے یا ذاتی ملکیت کو ختم کرنے کا پرچار کرنے والوں کو سزائے موت دی جائے گی۔ اگرچہ حکومت کے اس طرزِ عمل سے معاشی مسائل حل نہ ہوئے، تاہم سنہ ۱۹۳۰ء تک جاپان اس پالیسی پر عامل رہا، اور کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو سکا۔ مگر عوام کے دلوں میں حکومت کے خلاف جذبات برابر ابھرتے چلے گئے۔

وزیرِ اعظم کا قتل

پھر سنہ ۱۹۳۰ء میں لندن میں بحری اسلحہ کی تخفیف کا مسئلہ پیش ہوا تو جاپانی نمائندوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ برطانوی وزیرِ اعظم نے بالا بالا جاپانی وزیرِ اعظم کو تار دے کر اپنی مرضی کے مطابق جواب منگا لیا۔ جاپانی وزیرِ اعظم کے اس طریقِ کار نے عوام میں حکومت کے خلاف سخت اشتعال پھیلا دیا، جس کے نتیجے میں وزیرِ اعظم کو قتل کر دیا گیا۔

فوجی طاقت کے مظاہرے

اس واقعے کے بعد جاپانی امن پسندی کے بجائے جنگجوئی کا مظاہرہ کرنے پر اتر آئے۔ فوجی طاقتوں کے مالکوں نے اپنا سکہ جما لیا۔ جاپانیوں کو بسنے کے لیے نئی زمینوں کی ضرورت تھی، مگر کوئی دوسرا ملک انہیں اپنے ہاں بسنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اتفاق سے ۱۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء کو منچوریا کی جنوبی ریلوے لائن کے قریب ایک بم پھٹا جس سے بہت سے جاپانی ہلاک ہو

گئے۔ جاپان کی فوجی قوت کے سربراہوں نے اسے بہانہ بنا کر منچوریا کے پائے تخت مکڈن پر فوج کشی کر دی اور منچوریا فتح کر لیا۔ منچوریا کی فتح دراصل اپنا ساشی حلقہ وسیع کرنے کا پہلا اقدام تھا۔

لیگ آف نیشنز نے جاپان کے اس اقدام پر زبردست احتجاج کیا اور منچوریا سے اپنی فوجیں ہٹا لینے کو کہا، مگر جاپان نے ایک نہ سنی۔ اس فتح سے فوجی لیڈروں کی مقبولیت کا ڈنکا بجنے لگا۔ اس موقع پر انہوں نے آتش بیانی سے کام لیا اور ہٹلر و مسولینی کی طرح دنیا سے اپنی برتری اور عظمت کا اعتراف کرانے لگے۔ جنرل اراکی جو اس وقت جاپان کا وزیر جنگ تھا، سب میں پیش پیش تھا۔

اب جاپان بڑی سرعت کے ساتھ اپنی فوجی طاقت بڑھانے لگا۔ ۳۵-۱۹۳۳ء میں جاپان نے بجٹ کا نصف فوجی مصارف کے لیے وقف کر دیا۔ پھر جب یورپ میں ہٹلر اور مسولینی ابھرنے لگے۔ اسپین میں فرانکو کا نام چمکا تو جاپان کے جنگجو عناصر کے حوصلے اور بڑھے جارحانہ قوم پرستی کا رجحان شدت اختیار کرنے لگا۔ فوجی حلقوں کی طرف سے ان سرگرمیوں کے لیے جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ جاپان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے کے لیے نئی زمینوں کی ضرورت ہے۔

آخر دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ جاپان نے بھی اس جنگ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور اس کا جو حشر ہوا، اسی کتاب میں دوسری جنگ عظیم کے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ جنگ کے بعد جاپان کے انتظامی ڈھانچے کو نہ بدلا گیا اور ایک ایسی وزارت بنا دی گئی جس کے اراکین کسی پارٹی سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ تعلیمی نظام بدل کر اسے آزاد خیال بنا دیا گیا۔ تمام بالغوں کو حق رائے دیا گیا۔ جاگیرداری کے زمانے کے طریقے ختم کر دیے گئے۔ مزدوروں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

اپریل ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں اعتدال پسندوں کو کامیابی ہوئی، اور نئی حکومت بنی۔ ٹریبونل نے جنگی مجرموں کے مقدمات فیصل کیے نیا دستور بنایا گیا۔ بڑے بڑے صنعتی اداروں کو ختم کر کے چھوٹی صنعتوں کو فروغ دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں بیرونی ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے کی محدود آزادی بھی دے دی گئی۔

نئے دستور میں دو ایوان تھے۔ اگرچہ کئی وزارتیں بدلیں، مگر اکثریت اعتدال پسندوں ہی کو حاصل رہی۔ ۱۲ر فروری ۱۹۴۸ء کو سابق وزیر اعظم ٹوجو اور اس کے چند ساتھیوں کو موت کی سزا دی گئی۔ چونکہ جاپان کی مالی حالت خراب تھی۔ اس لیے اس سے تاوان نہ لینے کا اعلان کر دیا گیا۔ ۸ر ستمبر ۱۹۵۱ء کو جاپان اور اڑتالیس دوسرے ملکوں نے سان فرانسسکو میں صلح نامہ پر دستخط کیے۔

باب ۷

چین

تعارف

چین دنیا کا سب سے زیادہ وسیع، سب سے زیادہ آباد اور سب سے زیادہ زرخیز ملک ہے۔ آبادی پچاس کروڑ سے زیادہ ہے جس میں پانچ کروڑ کے قریب مسلمان ہیں۔ تبت، منگولیا، انام اور چینی ترکستان کے وسیع علاقے اس میں شامل ہیں۔ چین کا رسم الخط انسانی شعور کے اس ابتدائی دور کی یادگار ہے جب حروف ایجاد ہی نہیں ہوئے تھے چین نے ابتدا میں جو تصویری خط ایجاد کیا تھا، وہ ابھی تک رائج ہے۔ بادشاہ کو خدا یا اوتار سمجھنے کی رسم چین میں زمانہ قدیم سے چلی آتی ہے ہر سال سرکاری طور پر خدا پوجنے کا ایک عظیم میلہ لگتا ہے۔ اب بادشاہ کی حیثیت پہلے جیسی نہیں رہی بلکہ اس کی جگہ جمہوریت کے صدر نے لے لی ہے۔

چین کے تین دریا بہت مشہور ہیں۔ ہوانگ ہو، یانگ سی، اور سی کیانگ۔ یہ تینوں دریا اصل خشکی کے خاص خاص راستوں کی ناکہ بندی کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے دہانے گویا چین میں داخل ہونے کے دروازے ہیں۔

چینی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چینی تہذیب کی بنا آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے پڑی، جب یہاں ماؤ اور شن قوم کے بادشاہ حکمران تھے۔ پہلے ہزاروں سال تک مطلق العنان بادشاہوں کا دور رہا۔ عوام کو اپنی طاقت کا احساس پہلی بار ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ جب عوامی انقلاب رونما ہوا اور کیومن تانگ کے نام سے پہلی بار عوامی جماعت برسر اقتدار آئی۔

۲۲۱ء سے ۱۹۱۱ء تک چین میں پانچ خاندانوں کے بادشاہوں کی مطلق العنان حکمرانی رہی۔ اس قدیم مطلق العنان بادشاہی کا تختہ عوام نے ۱۹۱۲ء میں الٹ کر رکھ دیا۔ جب کیومن تانگ نے چین میں اپنی حکومت قائم کی کیومن تانگ نے جمہوریت تو قائم کر لی مگر کوئی دستور اساسی تیار نہ ہو سکا۔ بعد ازاں جب ملک کی قیادت چیانگ کائی شیک کے ہاتھ میں آئی تو ۱۹۳۱ء میں ایک دستور اساسی مرتب کر لیا گیا۔ اس عارضی دستور کے مطابق ملک کا نظام چلایا جانے لگا۔

چین غیر ملکی گرفت میں

انیسویں صدی کے آخر سے ہر صنعتی ملک اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ دوسرے ممالک میں اپنا مال تجارت بھیج کر نفع کمائے۔ جاپان برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس اور اسپین اس کوشش میں پیش پیش تھے۔

چنانچہ جہاں تک ہو سکا ان میں سے ہر ایک نے دوسرے ملک کی منڈیوں پر قبضہ کیا بعض نے سیاسی چالوں کے ذریعے دوسرے ملکوں کو اپنا مطیع بھی بنا لیا۔

جن ممالک پر ان صنعتی ملکوں کی نظریں تھیں، ان میں چین سب سے اہم ہے ہر ملک یہی چاہتا تھا کہ اپنے تیار شدہ مال کی کھپت اور خام مال کے حصول کے لیے چین میں زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کر سکے اس مقصد کے لیے ہر ملک چین پر سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ روس اور جاپان نے منچوریا پر قبضہ کر لیا۔ شمالی منچوریا سے ولاڈی وسٹک جانے والی ریل روس کے قبضہ میں آگئی ہانگ کانگ کے جزیرے پر برطانیہ قبضہ جما چکا تھا، شمالی چین کا ایک صوبہ شان ٹنگ جرمنی نے سنبھال لیا کچھ جزیروں پر پرتگال اور فرانس نے قبضہ کر لیا۔

چین کے ان علاقوں پر تو غیر ملکی حکومتیں قابض ہو گئیں، باقی حصے یعنی خاص چین کی کیفیت یہ تھی کہ اس کی ہر اہم بندرگاہ کسی نہ کسی معاہدہ کے ذریعے بیرونی تاجروں کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ تجارتی راستوں پر بھی غیر ملکی تاجروں کا اثر و رسوخ اور ان کی گرفت تھی۔ فرمانتی چین کے تین بڑے دریا جو دراصل چین کے تین بڑے پھاٹک ہیں، آج تک غیر ملکیوں کے زیر اثر ہیں۔ ان تجارتی گزرگاہوں پر جو اہم بندرگاہیں واقع ہیں ان کے متعلق مختلف حکومتوں نے چین سے جو معاہدے کیے، ان کے مطابق وہ وہاں قلعے بنا کر ان میں مسلح فوجیں بھی رکھ سکتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں چین کی ساری تجارت بیرونی طاقتوں کے قبضے میں تھی۔ درآمد و برآمد پر چینی حکومت کو کوئی اختیار نہ رہا تھا غیر ملکی بنک چین میں کثرت سے تھے ان کے مقابلہ میں چینی بنک فیل ہوتے جا رہے تھے۔

چین نے ان معاشی اقتصادی اور سیاسی جکڑبندیوں کے خلاف بہت واویلا کیا۔ پیرس کی صلح کانفرنس میں چین کے ساتھ کیے گئے سابقہ معاہدوں پر نظرثانی کی درخواست کی گئی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

چین کی بیداری اور انقلاب

صلح کانفرنس کی ناکامی چین کے لیے تازیانہ کا باعث ہوئی۔ چین کے جائز مطالبات کو اس

کی کمزوری کے باعث طاقتور حکومتوں نے جس بے اعتنائی سے رد کر دیا تھا اس نے چینیوں میں قومی حمیت کو ابھارا اور کینٹن کی حکومت سے چین کے قومی جوش و خروش کا آغاز ہو گیا۔

کینٹن کے ڈاکٹر سن یاٹ سن نے چین کی سیاسی و معاشی آزادی کے لیے ۱۸۹۴ء میں ایک انقلابی جماعت کی بنیاد رکھ دی۔ جس کا مقصد مانچو خاندان کی شہنشاہی کو ختم کر کے آزاد حکومت قائم کرنا تھا۔ ڈاکٹر نے کئی بار ملک میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار اسے قانونی گرفت میں لے لیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں جلاوطن کر دیا گیا۔ مگر اس کی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخر ۱۹۱۱ء میں مانچو خاندان ختم کر کے جمہوریت قائم کر دی گئی۔ ڈاکٹر سن یاٹ سن کو اس کا پہلا صدر بنایا گیا۔

بظاہر ملک میں جمہوریت کی بنیاد رکھ دی گئی، مگر ملک کے سرمایہ داروں، زمینداروں اور جاگیرداروں کا مفاد چونکہ چین کے قدیم نظام سے وابستہ تھا، جمہوری نظام میں انہیں اپنے مفادات سے دست بردار ہونا پڑتا تھا۔ اس لیے وہ جمہوریت کے حق میں نہ تھے چنانچہ صدر جمہوریہ کی کوششوں کے باوجود ملک میں نئے نظام کے تحت کوئی تبدیلی نہ کی جا سکی۔ بلکہ سرمایہ دار طبقہ ڈاکٹر کی مخالفت پر اتر آیا جس کے نتیجے میں ملک کے اندر بدنظمی اور انتشار کی صورت رونما ہو گئی۔

عرصہ تک یہی کیفیت رہی۔ پھر ڈاکٹر سن یاٹ سن کی کوششوں کو بار آور ہونے کا موقع اس وقت ملا جب پیرس کی صلح کانفرنس میں اتحادیوں کے اس طرز عمل سے یکایک بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب چینیوں کے تین مطالبات تھے۔ اول یہ کہ ملک سے تمام غیر ملکی مفادات کو ختم کر کے چین کو صرف چینیوں کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ دوم یہ کہ معاشرتی ترقی کے راستے میں ذات پات کی جو پابندیاں حائل ہیں، وہ نہیں ہونی چاہئیں۔ پھر ملک کی دولت کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ افراد کا ایک بڑا گروہ جو موجودہ تقسیم کے مطابق محض کام کر رہا تھا اسے روزی کمانے اور زندہ رہنے کی آسائشیں میسر آ سکیں۔ سوم یہ کہ قومی آزادی حاصل کرنے کے بعد ملک کا سیاسی نظام جمہوری اصولوں پر چلایا جائے۔

قدامت پسندی

جمہوری تقاضوں کے پیش نظر چینیوں کے یہ مطالبات تھے تو درست مگر عملاً ان کا نفاذ ناممکن تھا۔ اس لیے کہ چین کا ہر باشندہ اپنے خاندان کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ قوم اور وطن کا تصور اس کے لیے مشکل ہے۔ ہر چینی خاندان میں اس خاندان کا بڑا بوڑھا دوسرے تمام افراد پر حکومت کرتا ہے ہر معاملہ اسی کے مشورے سے طے ہوتا ہے۔ خاندان کے کم عمر افراد کو اس کا حکم بلا چون و چرا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ وہاں یہ ذہنیت کارفرما تھی کہ اگر خاندان خوش حال ہے تو قوم جائے بھاڑ میں۔ خاندانی مفاد قوم کے مفاد پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ قدامت پسندی چینی معاشرے میں راسخ ہو چکی تھی اور وہاں اچانک قوم پرستی کا نیا نظریہ پیش کر کے کامیابی حاصل کرنا ممکن نہ رہا تھا۔

ناخواندگی

اس کی ایک بڑی وجہ چینیوں کی ناخواندگی تھی۔ قوم پرستی کا تصور تعلیم ہی کے ذریعے پھیلایا جا سکتا تھا، مگر تعلیم کا مسئلہ دشوار تھا اس لیے کہ چین میں تصویری رسم الخط رائج ہے۔ ہر مفہوم کے لیے ایک نئی شکل بنانی پڑتی ہے۔ اس طرح ہزاروں شکلیں ذہن میں بٹھانے کے بعد لکھنا پڑھنا سیکھا جا سکتا ہے جس کے لیے بہت وقت اور محنت درکار ہے مگر چینی عوام جو زیادہ تر مزدور اور زمیندار ہیں وہ اتنا وقت ہی نہیں نکال سکتے۔

معاشرتی پسماندگی

عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ مردوں سے بھی زیادہ کٹھن ہے۔ اس لیے کہ چینی معاشرت میں عورت مرد کی غلام کا درجہ رکھتی ہے۔ وہاں بہترین عورت وہی سمجھی جاتی ہے جو شوہر کی زیادہ فرماں بردار ہو اور بچوں کی پرورش میں زیادہ انہماک دکھائے۔ چھوٹے پاؤں خوبصورتی کا معیار سمجھے جاتے ہیں، چنانچہ لڑکیوں کے پاؤں میں بچپن ہی سے لوہے کے جوتے پہنا دیے جاتے ہیں تاکہ بڑھنے نہ پائیں۔ مصلحت یہ ہے کہ عورت کا کام صرف گھر کے اندر چلنا پھرنا ہے اور لوہے کا جوتا پہنانے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح عورت کے پاؤں کو بڑھنے سے روکا گیا ہے، اسی طرح اس کا دائرہ عمل صرف گھر ہے۔ گھر سے باہر اس کا کوئی کام نہیں۔

شادی بچپن ہی میں کر دی جاتی ہے اور شوہر کا انتخاب خود گھر والے کرتے ہیں۔ لڑکی کو کم سنی کے باعث اپنے لیے شوہر انتخاب کرنے کا شعور ہی نہیں ہوتا نہ ہی اسے ایسا کرنے کا اختیار ہے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں چینی عورتوں کو تعلیم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ تو صرف گھر کی چار دیواری، شوہر کی فرمانبرداری اور بچوں کی پرورش کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہیں۔

معاشی پسماندگی

چین کا کسان عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے دقیانوسی اور قدیم ہندوستان کے کسانوں سے ملتا جلتا تھا۔ وہی پرانا ہل بکھیر، اصول زراعت بھی وہی قدیم۔ جدید آلات سے کام لینے کے لیے اول تو چینی کسانوں کی ذہنیت بدلنے کی ضرورت تھی۔ پھر اگر ایسا ہو بھی جاتا تو کسانوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں تھا کہ وہ جدید آلات خرید سکیں۔ غرض پیداوار کم اور کسان مفلوک الحال تھے۔

صنعت و حرفت کا بھی یہی حال تھا۔ کارخانے اگرچہ بہت تھے تاہم ان میں ہاتھوں سے مال تیار کیا جاتا۔ مشینوں سے وہ لوگ ناواقف تھے۔ ظاہر ہے کہ مشینوں کی عدم موجودگی میں صنعت و حرفت کی ترقی ناممکن تھی۔ زیادہ مال باہر سے منگوایا جاتا اور یہ کاروبار غیر ملکی تاجروں کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ تجارت میں زیادہ نفع وہی کماتے چینیوں کو باہر سے آنے والی اشیا مہنگے داموں ملتیں۔

سن یاٹ سن کا عزم

ان حالات میں سن یاٹ سن کے لیے قدم قدم پر مشکلات تھیں۔ جن پر قابو پانے کے لیے اس نے امریکہ، برطانیہ اور جاپان سے باری باری امداد مانگی۔ مگر کسی نے مدد نہ دی۔ بالآخر اس نے روس کی طرف رجوع کیا۔ لینن نے سن یاٹ سن کو اپنی ہمدردی کا پورا یقین دلایا۔ چین کے نئے نظام کے سلسلہ میں دونوں کے مابین ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جس کے نتیجے میں سن یاٹ سن نے راستہ کی تمام مشکلات کے باوجود قدم آگے بڑھانے کا عزم کر لیا۔

سن یاٹ سن کی کامیابی

سن یاٹ سن نے روس کی مدد سے کیومن تانگ کی نو جماعت کی تنظیم کی۔ وسیع پیمانے پر مزدور اور کسان اس کے ممبر بنائے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ جماعت ملک کی سب سے بڑی قوت بن گئی، چند علاقوں کو چھوڑ کر باقی سارے ملک میں ایک مرکزیت پیدا ہو گئی جس کے تمام اختیارات اس جماعت کو حاصل تھے۔ کینٹن اس مرکزیت کا صدر مقام تھا۔ پورا چین سن یاٹ سن کی قیادت کے سامنے اپنا سر جھکاتا تھا۔

سن یاٹ سن کی وفات کے بعد اس کی شخصیت زیادہ قوت اور شدت کے ساتھ زندہ رہی۔ اسے قومی مفاد کا سب سے بڑا ہیرو مانا جاتا تھا، بلکہ اس نے چین میں اوتار کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

چین کے بعض شمالی صوبوں میں خود مختار گورنر دست و گریباں تھے۔ علاوہ ازیں بعض بندرگاہوں میں مزدوروں نے ہڑتالیں کر رکھی تھیں۔ ان ہڑتالوں کی بنا پر بدلسی کارخانہ داروں

نے چینی مزدوروں کو کارخانوں سے الگ کر دیا تھا۔ ان حالات میں کینٹن کی حکومت نے ہڑتالی مزدوروں کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں پیکنگ پر حملہ کر کے دریائے یانگ تسی کی وادی پر قبضہ کر لیا۔ پھر رفتہ رفتہ شمالی چین قوم پرستوں کے قبضہ میں آگیا۔

چیانگ کائی شیک

اب کیومن ٹانگ کے ممبروں کی دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک اشتراکیت کے حق میں تھی۔ دوسری مخالف۔ اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد پرانے سرمایہ دارانہ نظام کے حامی تھے اور ادنیٰ طبقے کے افراد نئے اشتراکی انقلاب کے حامی۔ پہلی جماعت کو چیانگ کائی شیک کی حمایت حاصل تھی۔ چینی افواج کا سپہ سالارِ اعظم وہی تھا۔ اس لیے اس کی قوت زیادہ تھی۔ چیانگ نے نان کنگ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

اسی زمانہ میں قومی اور بین الاقوامی اشتراکیت کا سوال شدت سے پیدا ہو رہا تھا۔ بین الاقوامی اشتراکیت کے حامیوں کی یہ کوشش تھی کہ چین کو "سرخ جھنڈے" کے نیچے لایا جائے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے مشہور لیڈر ایم۔ این۔ اے کو بھی چین بھیجا گیا۔

چیانگ کائی شیک کے خلاف حملہ کیا گیا۔ مگر یہ حملہ اشتراکیوں کی تباہی کا موجب بنا۔ کینٹن کے سوا باقی سارا علاقہ چیانگ کائی شیک کے قبضہ میں آگیا اور ۱۹۲۸ء میں اسے نئی جمہوریہ کا صدر بنا دیا گیا۔ کینٹن کے بجائے نان کنگ پایۂ تخت قرار دیا گیا اور کینٹن دونوں کی سابق حکومتوں کا رقبہ بھی اس میں شامل تھا۔

ابتداء میں چیانگ کائی شیک نے اعلان کیا کہ چین کی اصلاح کے لیے جو خاکہ ڈاکٹر سن یات سن نے تیار کیا ہے۔ اسی پر عمل کیا جائے گا۔ بعد ازاں اعلان ہوا کہ مزدوروں اور کسانوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ ملک کے لیے خطرہ بن گئے ہیں اس لیے اس خاکے میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

جب روس نے چین کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا تھا۔ دنیا کی حکومتیں پریشان ہو چکی تھیں اب جب یہاں سے اشتراکیت کے خلاف آواز اٹھی تو انہوں نے آگے بڑھ کر چین کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور اس سے کئی معاہدے کر لیے۔

انجمن اقوام نے بھی چین کو اقتصادی معاملات میں مشورہ دینے کے لیے اپنا نمائندہ وہاں بھیج دیا۔ امریکہ اور جرمنی کے انجینئر اور فوجی افسر بھی چین میں پہنچ گئے۔

چینی کمیونسٹ پارٹی ابھی زندہ تھی اور چیانگ کے خلاف سازشیں کر رہی تھی۔ چیانگ نے ۱۹۲۷ء میں اسے خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔ مگر اس نے اپنی سرگرمیاں خفیہ طور پر جاری رکھیں۔ کینٹن کا کچھ علاقہ ابھی چیانگ کے قبضہ سے باہر تھا۔ اس کے علاوہ منگولیا سے جنوب کی طرف اشتراکی یا نیم اشتراکی نظام قائم تھا۔

اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر ستمبر ۱۹۳۱ء میں جاپان نے منچوریا پہ حملہ کر دیا۔ روسی امداد سے کمیونسٹ فوجیں چین کے پایۂ تخت کی طرف بڑھیں۔ برطانیہ اور امریکہ نے چیانگ کی حکومت کو امداد دی اور جاپانی اور روسی فوجوں کے اس سیلاب کو روک دیا۔

۱۹۳۷ء میں جاپان نے پھر چین پہ حملہ بول دیا۔ دوبارہ روس نے جاپان کی مدد کی مگر درپردہ۔ ادھر شمالی چین کے کمیونسٹوں نے ستمبر ۱۹۳۷ء میں جاپان کے مقابلہ میں چیانگ کائی شیک سے اتحاد کا معاہدہ کر لیا۔ پھر اپریل ۱۹۳۸ء میں چیانگ نے چین کا سیاسی نظم و نسق بہتر بنانے کے لیے جو پروگرام وضع کیا، کمیونسٹوں نے اس کی بھی تائید کی۔

جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور روس اور جرمنی برسرِپیکار ہوئے، تو شمالی چین کے کمیونسٹوں نے بھی آنکھیں دکھانی شروع کیں مگر جون ۱۹۴۱ء میں جب جرمنی نے سٹالن کو آ دبایا تو آنکھیں کھلیں اور ۱۹۳۷ء کے معاہدہ اتحاد کی توثیق کے وقت اعلان ہوا کہ کمیونزم کا پروپیگنڈا کرنے اور فرقہ پھیلانے کی روش ترک کر دی جائے گی سوویٹ چھاپ کی حکومتیں توڑ کر چین کو قومی بنیاد پر منظم کیا جائے گا اور سرخ فوج کو "قومی فوج" میں مدغم کر دیا جائے گا۔

چونکہ روس نے اپریل ۱۹۴۱ء میں جاپان سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ وہ غیر جانبدار رہے گا۔ اس لیے چیانگ کو جاپان کے خلاف جنگ میں کمیونسٹوں سے زیادہ مدد نہ ملی اور اندرونی بدنظمی جوں کی توں قائم رہی۔

جنگ ختم ہوئی تو روس نے چین میں پھر پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے۔ اب اس کے لیے راستہ ہموار تھا۔ لہٰذا روسی اقتدار بڑھنے لگا۔

ماؤزے تنگ

جنگ کے دوران چین کے شمالی حصے میں ماؤزے تنگ کا اقتدار پھیل رہا تھا وہ روز بروز عوام میں مقبول ہوتا جا رہا تھا۔ چیانگ کی پشت پر امریکی ڈالر اور برطانوی مدد کام کر رہی تھی۔ مگر ماؤزے تنگ کے پشت پناہ عوام تھے چنانچہ جنگ کے خاتمہ پر جب جاپان کا سوال بیچ میں آیا تو چیانگ سے براہ راست اس کی ہمت آزمائی شروع ہو گئی۔ امریکہ نے چیانگ کی ہمت بندھائی۔ مگر وہ اپنے حامیوں کی بددلی اور بے وفائی کی وجہ سے استعفیٰ دے کر سیاست سے سبکدوش ہو گیا۔ اب ماؤزے تنگ برسرِاقتدار آگیا۔

یہ سلسلہ جاری تھا کہ جون ۱۹۵۰ء میں شمالی کوریا نے جو کچھ کمیونسٹوں کے زیرِ اثر تھا، جنوبی کوریا پر جو امریکہ کی حمایت میں تھا، دھاوا بول دیا۔ ادھر جاپان نے کوریا کو جاپان کا ایک حصہ قرار دے دیا۔ چنانچہ جاپانی یہاں آکر بسنے لگے اور چند سال کے اندر اندر جنوبی کوریا مغربی جاپان بن کر رہ گیا۔

امریکہ نے جنوبی کوریا کی فوجی امداد کا اعلان کر دیا، اس نے یو۔ این۔ او کا دروازہ کھٹکھٹایا روس نے بائیکاٹ کیا، لیکن کثرتِ رائے سے فیصلہ امریکہ کے حق میں ہو گیا۔

مسلم چین

منگولیا کے جنوب مشرق میں سنکیانگ کا وسیع علاقہ ہے۔ جہاں کے باشندے چینی، ترکی اور منگول تینوں نسلوں کا مجموعہ ہیں۔ آبادی پچاس لاکھ کے قریب ہے۔ باشندے سب مسلمان ہیں۔ کاشغر اس علاقے کا خاص شہر ہے جو کبھی اسلامی تعلیمات کا گہوارہ تھا۔ پچھلی دو صدیوں میں سنکیانگ کے جذبۂ آزادی کو دبانے کے لیے چین کی مرکزی حکومت نے کئی مرتبہ فوج کشی کی۔ چیانگ کائی شیک نے، انہیں چینی وحدت کا دشمن کہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ماؤزے تنگ نے چیانگ کے اقتدار پر ضرب لگائی تو سنکیانگ کے مسلمانوں نے اس نئی حکومت کا خیر مقدم کیا اور پورے اشتراک و تعاون کا یقین دلایا۔

باب ۸ تحریکِ اصلاحِ مذہب (ریفارمیشن)

پاپائیت

جب سے روما الکبریٰ کی سلطنت مکمل طور پر عیسائیت کے زیرِ اثر آئی تھی اس وقت سے اس میں پوپ یا لاٹ پادری کو سب سے بڑے مذہبی سربراہ کی حیثیت حاصل تھی۔ پوپ کی طاقت میں زبردست اضافہ ۸۰۰ء میں ہوا جب اس سلطنت کے پہلے شہنشاہ شارلیمین کو روما میں پوپ نے اپنے ہاتھ سے تاج پہنایا۔ اس وقت اس سلطنت میں فرانس، جرمنی، اٹلی اور یوگوسلاویہ، رومانیا وغیرہ وسط یورپ کے علاقے بھی شامل تھے۔

پوپ نے عوام الناس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنے اور سیاسی اقتدار اعلیٰ پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کلرجی طبقہ کو جنم دیا۔ یعنی مقدس کتابوں کی توضیح و تشریح، مذہبی خطبہ اور مذہبی رسوم کی ادائیگی کا حق، عوام کے بجائے ایک مخصوص و محدود طبقے کے سپرد کر دیا۔ جس شخص کو پوپ کی طرف سے باقاعدہ سند نہ ملتی، وہ دینی معاملات میں دخل دینے کا حقدار نہ تھا۔ گویا خدا اور بندے کے درمیان پادری کا واسطہ ضروری قرار دیا گیا۔ بچے کی پیدائش کے بپتسمہ کی رسم صرف پادری ہی

ادا کر سکتا تھا۔ بچے کے سن شعور کو پہنچنے پر اس کی مذہبی تعلیم کا آغاز بھی پادری ہی کرتا۔ شادی کے تمام مراحل پادری کی وساطت سے طے پاتے۔ مذہبی پیشوا یا پادری بنانے کی رسم بھی پوپ ادا کرتا۔ حالت نزع میں مرنے والوں کے سر پر پادری کے ہاتھ سے مقدس تیل ملنے کی رسم ادا کی جاتی۔ پادری کے سامنے ہر شخص اپنے تمام گزشتہ گناہوں کا اعتراف کرتا۔ پھر پادری اسے گناہوں سے پاک کرتا۔ غرض اور بھی کئی ایسی رسمیں تھیں جو صرف پادری انجام دیتے تھے۔ ان رسموں کو نجات آخروی کے لیے نہ صرف لازم بلکہ ناگزیر قرار دے دیا گیا تھا اور ان کی بجا آوری پادریوں نے اپنے ہاتھ میں رکھی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ عوام ہر مذہبی معاملے میں پادریوں کے دست نگر بن گئے۔

پاپائے اعظم نے اس مذہبی اقتدار کے طفیل سیاست و معیشت کے نظام پر بھی پورا پورا غلبہ حاصل کر لیا۔ اس طرح مذہب اور سیاست یکجا ہو کر دو الگ الگ سیاسی ادارے قائم ہو گئے۔ یعنی پاپائیت اور شہنشاہیت اور ان دونوں میں تصادم ہونے لگا۔

کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہوتا کبھی دوسرے کا۔ آٹھویں صدی سے سولھویں سترھویں صدی تک یورپ کی تاریخ، پاپائیت اور بادشاہت کے تصادم کی ایک مسلسل داستان ہے۔

غرض یورپ نے مسیحی دنیا میں اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ اس کے ماتحت "مقدس سلطنت" روما کا قیام عمل میں آ گیا۔ ایک طرف عوام پر بادشاہت مسلط تھی تو دوسری طرف پاپائیت ابتدا میں پاپائیت کی فوج یعنی کلرجی طبقے کے لوگ اپنے قول و کردار میں محتاط تھے مگر جب مسیحی دنیا پر ان کی دھاک بیٹھ گئی، تو وہ عیش پسندی کی طرف مائل ہونے لگے۔ ایک طرف بادشاہ عوام کو لوٹتا تھا تو دوسری طرف پاپائی نظام کا بھی یہی حال تھا۔ پاپائی نظام دولت و اقتدار کے نشے میں بدمستی پر اترا ہوا تھا۔ اخلاق و خدا ترسی کا اس میں نام تک باقی نہ رہا تھا بادشاہت اور پاپائیت کی لوٹ کھسوٹ نے عوام کا پیمانہ صبر لبریز کر دیا تھا، مگر وہ بے بس تھے اور مدتوں ان دونوں چکیوں میں پستے رہے۔ آخر تحریک اصلاح مذہب کے نام سے مارٹن لوتھر نے پاپائیت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور اس نظام پر ضرب کاری لگائی۔

پروٹسٹنٹ تحریک

مارٹن لوتھر جرمنی کا باشندہ تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس نے پاپائیت کے خلاف آواز اٹھائی جس کے نتیجہ میں اصلاح مذہب یا ریفارمیشن کی تحریک پورے زور شور سے بروئے کار آئی اور پاپائیت کا تار و پود بکھر کر رہ گیا۔ اس تحریک کی بنیاد داعی اسلام صلعم کے اسی پیام پر قائم کی گئی کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی دینی سربراہ، مولوی یا پنڈت یا پادری کے نام سے کسی واسطے کی احتیاج نہیں۔ لوتھر نے اعلان کیا کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی راہ میں پاپائیت سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسے ختم کر دینا چاہیئے۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے کسی پادری کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہر شخص اپنا پادری ہے۔ لوتھر نے زیادہ زور اس پر دیا کہ ہر کام کی اچھائی یا برائی کو پرکھنے کے لیے انجیل موجود ہے اور اسی پر عمل کرنے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ روح کا تعلق براہ راست خدا سے ہے لہٰذا ہر شخص اپنے طور پر براہ راست خدا سے توبہ و استغفار کر سکتا ہے۔ پادری کے درمیانی واسطے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

لوتھر کی یہ بغاوت یورپ کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اس تحریک کے باعث پاپائیت کا اقتدار رفتہ رفتہ کم ہونے لگا اور ایک نئے معاشرتی اور سیاسی نظام کا آغاز پیدا ہوا۔ لوتھر ۱۴۸۳ء میں جرمنی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہ خود ایک پادری تھا پچیس برس کی عمر میں وٹن برگ کی مذہبی یونیورسٹی میں معلم مقرر ہوا۔ مگر اس کے دماغ میں شروع ہی سے پاپائیت کے خلاف خیالات پیدا ہو چکے تھے۔ وہ اندر ہی اندر یہ مادا اہل رہا تھا۔ آخر جب پوپ نے "دستاویز مغفرت" جاری کیں (ان دستاویزوں سے مراد یہ ہے کہ لوگ پیسے دے کر جنت کے پروانے لے سکتے تھے) تو لوتھر نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف مظاہرے کیے۔

جرمنی کے عوام نے لوتھر کے پیش کردہ اصولوں کی تائید میں آواز اٹھائی، لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ ہو گئی۔ بادشاہوں کی غرض بھی یہی تھی کہ اپنے علاقوں میں سے پوپ کا اقتدار خارج کریں اور مذہبی نظام کو اپنے ماتحت لے لیں۔ اس سے بھی لوتھر کی تحریک کو بڑی مدد ملی۔ پوپ نے ایک فرمان میں لوتھر کے نظریات پر لعنت و نفرین کی اور انہیں ماننے والوں کو مردود قرار دیا۔ مگر لوتھر نے اس فرمان کی مطلق پروا نہ کی۔ اس کی تحریک روز بروز پکڑتی جا رہی تھی۔ جو لوگ اس تحریک کے حامی تھے، انہیں پروٹسٹنٹ (احتجاج کرنے والے) کہا جاتا تھا۔ بہت سے فرقوں نے لوتھر کی تعلیمات سے اثر قبول کیا اور پاپائے روما کے گرجا سے علیحدہ ہوتے گئے۔ پاپائی گرجا یا رومن کیتھولک سے اختلاف رکھنے والے تمام فرقے بعد میں پروٹسٹنٹ ہی کے نام سے پکارے جانے لگے۔

باب ۴ یورپ کی نئی زندگی

احیائے علوم

پروٹسٹنٹ تحریک کے نتیجہ میں جب پاپائیت کا مرکزی اقتدار زوال پذیر ہونے لگا تو عوامی ذہنوں پر اس کی گرفت بھی ڈھیلی پڑتی گئی۔ اس سے پہلے سارا یورپ پوپ کے روحانی اقتدار کے ماتحت تھا۔ اس سے لوگ ذہنی طور پر مذہبی عقائد اور بندھنوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ آزادانہ طور پر سوچنے سے عاری ہو چکے تھے مگر جب پاپائیت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو یورپ کے عوام میں بیداری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ خود ساختہ مذہبی پابندیوں، غلط عقیدتوں اور افسانہ طرازیوں سے ہٹ کر آزادانہ غور و فکر کا رواج چل نکلا۔ چودھویں صدی کے وسط میں مشرق وسطیٰ کے علاقوں سے کئی طالبین علم و فضل عیسائیت کے مرکز اٹلی میں پہنچ کر مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ یورپ جو ابھی تک جہالت کی اتھاہ تاریکی میں پڑا ہوا تھا۔ ان معلمان عقل و دانش کے طفیل علمی خزانوں سے مالا مال ہونے لگا۔ بقراط، سقراط، ارسطو اور افلاطون کے جس فلسفہ و حکمت سے دنیا استفادہ کر رہی تھی۔ اس کا راز اب یورپ پر بھی کھلنے لگا تھا۔ چنانچہ اہل یورپ واقعات کو صحیح رنگ میں دیکھنے لگ گئے تھے۔

۱۴۳۶ء میں چھاپے خانے کی ایجاد کے طفیل کتابوں کی اشاعت میں بہت آسانیاں پیدا ہو گئیں اور اہل علم و فن کی تعلیمات کتابوں کی شکل میں چھپ کر یورپ کے دور دراز گوشوں میں پہنچنے لگیں۔ اس طرح علم و ادب کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہونے لگی۔

ان حالات نے پاپائیت کے مرکزی اقتدار کو اور دھچکا لگایا۔ چنانچہ سب سے پہلے ہنری ہشتم شاہ انگلستان نے ۱۵۱۹ء میں پوپ کی اطاعت سے بیزار ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ پھر دوسرے ملکوں نے بھی پوپ کی اطاعت کا جوا اتار پھینکا۔ جن بادشاہوں نے پوپ سے علیحدگی اختیار کی، پوپ کا روحانی اقتدار بھی انہوں نے خود سنبھال لیا۔

مطلق العنانی پر پہرہ

پہلے پوپ اور بادشاہ دونوں الگ الگ طور پر اپنے اختیارات سے ناجائز فائدے اٹھاتے رہتے تھے، اور عوام ان دونوں اداروں کی زد میں رہ کر مصائب کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ اب جب کہ بادشاہت اور پاپائیت دونوں ایک ہی ذات میں جمع ہو گئے یعنی بادشاہ ہی مذہبی سربراہ بھی بن گیا۔ لوگوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ بادشاہ کی بے روک مطلق العنانی پر ایسی پابندیاں لگائی جائیں کہ اس کے عمل پر احتساب کیا جا سکے۔ چنانچہ ایسے قوانین وضع

کیے گئے جن سے بادشاہ کے عمل پر نگرانی کا پہرہ بیٹھ جاتا تھا۔

انگلستان کے بادشاہ جان کے زمانہ میں میگنا کارٹا یعنی منشور آزادی تیار کیا گیا۔ اس منشور کی دفعات یہ تھیں کہ کسی آزاد شخص کو قید کیا جائے گا اور نہ ہی اس پر مقدمہ چلایا جائیگا سوائے اس صورت میں کہ رائج الوقت قوانین اس کی اجازت دیں۔ ایسے شخص کو باقاعدہ عدالت میں پیش کر کے اس کا جرم ثابت کیا جائے گا۔ تمام ملک میں ناپنے اور تولنے کے پیمانے ایک سے ہوں گے۔ غیر ملکی تاجروں کو آزادانہ طور پر تجارت کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ زمانہ قدیم سے انسانوں کو جو آزادیاں دی جاتی رہی ہیں، وہ سب بحال رکھی جائیں گی۔ کونسل کی منظوری کے بغیر کوئی ٹیکس یا محصول عائد نہ ہوگا۔

شاہ جان نے اس منشور کی تصدیق و توثیق کی اور اس کے بعد متعدد دوسرے بادشاہوں نے بھی جو وقتاً فوقتاً انگلستان کے تخت پر بیٹھے، اس پر دستخط کیے۔ غرض اس منشور سے بادشاہ کے اختیارات پہلے سے ندرہے مطلق العنانی کی وہ کیفیت باقی نہ رہی جو اب تک چلی آتی تھی اور عوام کے بیشتر حقوق محفوظ ہو گئے۔ بادشاہ پر احتساب کرنے کی گنجائشیں نکل آئیں اور کسی حد تک ملک اور عوام کی آزادی کے راستے ہموار ہو گئے۔

بادشاہ کے کاموں پر احتساب کا پہرہ بٹھانے کے لیے میگنا کارٹا کے بعد بھی قانون پاس ہوتے رہے۔ سترہویں صدی کے آخر میں انگلستان میں جو اہم قوانین بنائے گئے ان میں سب سے پہلا اور اہم قانون ہیبئیس کارپس (HABEAS CCRPUS) ہے جس کا مفاد یہ تھا کہ کسی شخص کو باقاعدہ عدالت میں لائے بغیر جیل میں نہ رکھا جائے۔ اس کے بعد ۱۶۸۹ء میں ایک دستاویز تیار کی گئی جس کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ کوئی رومن کیتھولک تخت انگلستان پر نہ بیٹھ سکے گا۔ گویا انگلستان کا تخت صرف پروٹسٹنٹ مذہب کے بادشاہ کے لیے مخصوص ہو گیا اور پوپ کے ساتھ انگلستان کے مذہبی تعلق کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ بعد ازاں مختلف اوقات میں کئی اور اصلاحی قوانین منظور ہوئے جو سب کے سب بادشاہ کے اختیارات پر اثر انداز ہونے تھے۔ سنہ ۱۷۰۲ء میں غیر ممالک کے جارحانہ جنگ کرنے کے اختیارات بادشاہ سے لے کر پارلیمنٹ کو دے دیئے گئے۔

بادشاہ کے اختیارات پر بندشیں قائم کرنے کی تحریکیں صرف انگلستان تک ہی محدود نہ رہیں، بلکہ یورپ کے مختلف علاقوں میں بھی ایسی تحریکیں اٹھنے لگیں اور وہاں بھی اس قسم کے متعدد قوانین بنائے گئے مگر چونکہ طاقت کا سر چشمہ صرف بادشاہ ہی کی ذات کو سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے یہ قوانین زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوئے اور شہنشاہیت اپنی پوری شان و شکوہ اور قوت کے ساتھ عوام کے دل و دماغ پر قابض رہی۔ یہی بادشاہ تھے جنہوں نے جذبہ رقابت کی بنا پر پاپائیت کے خلاف عوام کی مدد کی تھی۔ لیکن جب اٹھارہویں صدی میں پاپائیت مکمل طور پر ختم ہو گئی اور اس کی خصوصیات بادشاہ کی ذات میں جمع ہو گئیں، تو اب بادشاہوں نے بھی وہی حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے جو پاپائیت کا خاصہ تھے۔ یورپ کے بادشاہوں نے پادریوں اور مذہبی عالموں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ عوام اگرچہ پاپائیت کی طرح اب بادشاہت سے بھی نالاں ہو چکے تھے، مگر شاہی و سلطانی کے سوا کوئی اور نظام سیاست ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ بالآخر جس طرح سولہویں صدی کے آخر میں لوتھر نے عوام کے ان جذبات کی ترجمانی کی تھی جو عیسائیت کی اصلاح کے لیے ان میں موجزن تھے، اسی طرح سترہویں صدی میں فرانس کے ایک فلسفی روسو نے بادشاہوں کی مطلق العنانی سے آزاد ہونے کی وہ اسکیم پیش کی جس کے لیے عوام تڑپ رہے تھے۔

روسو کا نظریہ اور عام بیداری

روسو نے انسانی مساوات اور حریت پر ایک فلسفیانہ رسالہ لکھا۔ جس میں حکومت کے اصول اور حکومت چلانے کے طریقے بیان کیے۔ اس رسالہ کی ابتدا یوں کی کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے" پھر سارا رسالہ اسی بحث کی تشریح ہے۔

روسو نے کہا کہ انسانی معاشرت کا تصور اس لیے پیدا ہوا کہ انسان مشترکہ مفاد اور تحفظ کے لیے اپنے ارادے اور مرضی سے اکٹھے ہوئے، اور مشترک قوانین اور رسم و رواج بنائے لہٰذا بادشاہت کے موروثی یا خداداد حق کا تصور غیر فطری ہے۔ بادشاہتوں کو ختم کر کے عوام کی متفقہ مرضی سے قوانین کی ترتیب دینی چاہیئے، عوام کی خوشی ہر مسئلے میں اقتدار اعلیٰ کا درجہ رکھتی ہے۔ حکمرانی کے اختیارات نہ تو بادشاہ کی ذات میں جمع ہونے چاہئیں، اور نہ امراء و روسا کی ذات میں۔

یہ وہ وقت تھا، جب عوام میں بادشاہوں کی مطلق العنانی اور پادریوں کے خلاف جذبات جوش پکڑ چکے تھے۔ صرف عوام میں ٹیکس لگائے جاتے تھے اور خواص و امراء اس سے مستثنیٰ تھے۔ حکومت کی ہدایت کے مطابق پادری طبقہ لوگوں کو ان کی بدحالی پر قناعت کی تلقین کر رہا تھا۔ ایسے وقت میں روسو اور والٹیر وغیرہ معاشرتی مصلحین کی کتابیں جب لوگوں کے سامنے آئیں تو ان کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ ان پر واضح ہو گیا کہ برسر اقتدار طبقہ، رؤساء، امراء اور پادری سب مل کر انہیں لوٹ رہے اور تباہ کر رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی شدید احساس ہونے لگا کہ امراء و رؤسا اور پادریوں نے انسانوں کے درمیان جو امتیازات قائم رکھی ہیں، وہ سب غلط اور خود غرضی پر مبنی ہیں۔ بنی نوع انسان کو ذلت اور فاقہ کشی میں مبتلا کرنا خدا کی جانب سے نہیں، نہ ہی اس کے لیے پادریوں کا مذہبی جواز درست ہے۔ بلکہ یہ انسانوں ہی کے ظلم و تشدد کا نتیجہ ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔ غرض اس لٹریچر اور دوسرے علوم و فنون کی اشاعت نے یورپ بھر میں ایک تہلکہ مچا دیا اور عوام کے دلوں میں انقلاب کی نئی روح پھونک دی جس نے یورپ کو علمی، اخلاقی، مذہبی اور سیاسی لحاظ سے نئی زندگی عطا کی۔

باب ۱۰

صنعتی انقلاب

مشینوں کی ایجاد

اٹھارہویں صدی میں اہل یورپ کو بھاپ کی طاقت کا علم ہوا تو بڑی بڑی مشینیں بننے لگیں۔ عظیم الشان کارخانے تیار ہونے لگے، جن میں تھوڑے وقت اور کم محنت کے صرف سے وسیع پیمانے پر ضروریات کی عام چیزیں تیار ہونے لگیں۔ دن بھر کی محنت سے سال بھر میں ہاتھ سے جتنا کپڑا تیار ہوتا تھا، مشینوں کے ذریعے اب وہ چند دنوں میں تیار ہو جانے لگا۔ چنانچہ جو ملک پہلے صرف اپنی ضرورت پوری نہ کر سکتا تھا، یا بہ مشکل پوری کرتا تھا، اب وہ اتنا زیادہ کپڑا تیار کرنے لگا کہ ملکی ضرورت کو بطریق احسن پورا کرنے کے بعد بچ بھی جاتا۔ اس صورت میں تیار شدہ مال کو اپنے ملک کے علاوہ دوسری منڈیوں میں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔ علاوہ ازیں کپڑا تیار کرنے کے لیے ملکی روئی ناکافی ہو گئی اور دوسرے ملکوں سے روئی منگانے کی ضرورت پڑ گئی۔

تجارتی روابط

اس مقصد کے لیے یورپ کے سوداگروں نے دوسرے ملکوں کا رخ کیا جہاں سے وہ خام مال منگا سکیں اور تیار شدہ مال ان منڈیوں میں فروخت کر سکیں۔ یورپی تاجروں نے دنیا کی مختلف منڈیوں میں اپنا تجارتی جال پھیلانا شروع کر دیا۔ چونکہ یورپ کے علاوہ اور کوئی ملک ان مشینوں کی ایجاد سے واقف نہ تھا اور وہاں مال تیار کرنے اور استعمال میں لانے کی کیفیت وہی تھی جو مشینوں کی ایجاد سے پہلے یورپ کی تھی، اس لیے ان ملکوں نے کچے مال کی فروخت، اور تیار مال کی خرید کو بخوشی قبول کر لیا۔

جہاں جہاں یورپی تاجر پہنچے، وہاں لوگوں نے بڑی خوشی سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس لیے کہ انہیں اپنے کچے مال کے لیے مال دار گاہک ہاتھ آ گیا اور اس کے بدلے میں ایسا تیار مال ملنا شروع ہو گیا جو وہ خود نہ بنا سکتے تھے۔ نتیجہ میں یورپ کے تاجروں کی اہمیت بڑھ گئی۔

تجارتی اور سیاسی کشمکش

اس تجارت کے سلسلہ میں یورپ کی مختلف اقوام میں باہم مقابلہ اور رسہ کشی شروع ہو گئی۔ ہر قوم بہترین منڈیوں پر اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے تجارت کے پہلو بہ پہلو سیاسی تسلط جمانے کی کوششیں بھی شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے آخر تک افریقہ کے ایک کروڑ پندرہ لاکھ مربع میل رقبے میں سے مصر اور لائبیریا کے سوا باقی سارا علاقہ براہِ راست یورپ کے سیاسی اقتدار میں آ گیا۔

آسٹریلیا اور امریکہ میں یورپین لوگ پہلے ہی سے آباد ہو چکے تھے۔ جب یورپی تاجروں نے ان علاقوں میں قدم رکھا تو ان کے ہم وطنوں نے تجارتی اور سیاسی سازباز میں ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ہندوستان رفتہ رفتہ مکمل طور پر انگریزی اقتدار میں آ گیا اور مشرقی و مغربی ایشیا کا وہ علاقہ جو انگریزی اقتدار سے باہر اور اپنے طور پر آزاد تھا، وہاں بھی انگریزی اثر و رسوخ کام کرنے لگا۔ غرض بیسویں صدی کے اوائل تک ساری دنیا کی منڈیاں یورپی قبضے میں آ گئیں۔ ان منڈیوں سے یورپی کارخانہ دار خام مال خریدتے اور اپنے ملک سے تیار مال لا کر فروخت کرتے۔ اس طرح دنیا بھر کی منڈیوں سے کروڑوں روپیہ یورپ کے تاجر کمانے لگے اور یورپ اس دولت سے مالا مال ہونے لگا۔

اس تجارت کے سلسلے میں یورپ کی مختلف قوموں کی کیفیات مختلف تھیں۔ جن کے قبضے میں اچھی منڈیاں تھیں، وہ زیادہ دولت کماتیں۔ اس کے برعکس ایسی بھی تھیں جو اس تجارت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔ اس لیے کہ ان کے پاس مناسب ٹھے نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچھی منڈیوں کے حصول کے لیے یورپ کی مختلف اقوام میں رسہ کشی شروع ہو گئی۔

قومی آزادی کا جذبہ تو یورپ کی ہر قوم میں شدت اختیار کر گیا تھا مگر یہ تجربہ بھی ہو گیا کہ معاشی خوش حالی کے بغیر قومی آزادی کا تصور بے کار ہے۔ تجارت نے قوموں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ دولت کی ریل پیل اور عام خوش حالی ہی قومی آزادی کی اصل روح ہے جو قوم افلاس، غربت یا معاشی بدحالی کا شکار ہو، وہ اگر سیاسی لحاظ سے مکمل طور پر آزاد بھی ہو تو اسے کوئی نہیں پوچھتا اور دنیا کی نظروں میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اس نظریۂ فکر نے قوموں کے باہمی جذبۂ رقابت کو اور ابھارا۔ یورپ کی ہر قوم نے تجارت کے ساتھ ساتھ تجارتی منڈیوں پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی بھی پوری سعی کی۔ مقابلے کی دوسری قوم نے اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں اور حریفانہ چالیں چلیں۔ مثلاً اگر کسی قوم کا مال دوسری قوم کی منڈی میں آتا تو وہ اس کی بھاری محصول عائد کر دیتی۔ جس سے وہ مال گراں قیمت پر فروخت ہوتا۔ اس کے مقابلے میں ان کا اپنا مال سستا پڑتا۔ گویا درآمدی محصول کے ذریعے دوسروں کی خرید و فروخت کو روکا جاتا تھا۔

دوسرا سوال راستوں کا یہ تھا۔ ہر قوم کی یہی خواہش تھی کہ اس کا مال منڈیوں میں قریب ترین راستوں سے پہنچ سکے، تاکہ آمد و رفت پر زیادہ خرچ نہ اٹھے۔ اس مقصد کے لیے قوموں نے مناسب تجارتی شاہراہوں، اڈوں اور ناکوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ غرض یورپ کی ہر قوم تجارتی، معاشی اور سیاسی اعتبارات سے ایک دوسرے کی حریف بن گئی۔ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ دوسرے کی دستِ نگر نہ رہے بلکہ تمام حریف قوموں پر فوقیت اور برتری حاصل کر لے۔

اس حریفانہ جذبے کو عوام کے ذہنوں میں مختلف طریقوں سے بھی ٹھونسا گیا تاکہ لوگوں کے جذبات مشتعل کر کے ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ پاپائیت کے دور میں انسانیت کے نام پر لوگوں کو مشتعل کر کے بعض موقعوں پر کام نکالا جاتا تھا۔ اب پاپائیت ختم ہو چکی تھی۔ لوگ مذہب کے رنگ میں سوچنے کے عادی نہ رہے تھے۔ اس لیے حریفانہ مطلب برآری کے لیے قومی برتری کا احساس دلانے کے لیے نسلی برتری کے دعوے کیے جانے لگے۔ ہر قوم نسلی، جسمانی، روحانی، تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے اپنے آپ کو دوسری قوموں سے برتر قرار دینے لگی اور اس برتری کی بنا پر یہ دعوے کیے جانے لگے کہ دنیا میں سرداری کا حق صرف اسی کو پہنچتا ہے۔

القصہ تمام اقوام میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ہر قوم نے اپنی نسلی برتری کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر اپنے آپ کو دنیا کی دوسری قوموں سے ارفع و اعلیٰ ثابت کرنا شروع کر دیا۔

باب ۱۱ — انقلابِ فرانس

بادشاہت کی تنسیخ

تیرھویں صدی عیسوی میں فرانس یورپ کا سب سے مہذب اور متمدن ملک سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت وہاں شہنشاہیت کا دور دورہ تھا۔ جمعیتِ طبقات (STATES GENERAL) کے نام سے امراء، رؤسا، پادری اور عام لوگوں کی ایک پارلیمنٹ ملک کی نمائندہ جماعت تھی اور اس پارلیمنٹ میں ساری طاقت امراء و رؤسا یا پادریوں کے ہاتھ میں تھی۔ عوام کے نمائندوں کی کوئی مؤثر آواز نہ تھی، چنانچہ امراء اپنی مرضی سے جو قانون چاہتے، منظور کرا لیتے۔ بادشاہ کو جب کبھی آدمیوں یا روپے کی ضرورت ہوتی، اس پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کر لیا جاتا۔ چنانچہ ۱۳۰۲ء اور اس کے بعد چند سالوں تک اس کے کئی اجلاس ہوئے۔ ۱۶۱۴ء کے بعد تقریباً پونے دو سو سال تک اس کا اجلاس طلب کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ بالآخر ۱۷۸۹ء میں ورسیلز میں اس کا ایک اجلاس طلب کیا گیا۔ جس میں عوام نے پادریوں اور امراء کی مخالفت کے باوجود اپنا فیصلہ منوا لیا اور یہیں سے انقلاب کا آغاز ہوا۔

بعد ازاں "قومی اسمبلی" کے نام سے عوام کا ایک اجلاس بلایا گیا جس نے ۱۷۹۲ء میں بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت قائم کی۔ لوئی شانزدہم شاہِ فرانس پر باقاعدہ مقدمہ چلا کر اسے موت کی سزا دی گئی۔ امراء و رؤسا اور پادریوں کو دوسرے انسانوں پر فوقیت کے جو حقوق ملے ہوئے تھے، ان کی تنسیخ کر دی گئی۔ ہر شخص کو پوری آزادی سے تحریر و تقریر کے ذریعے اظہارِ رائے کا حق دیا گیا۔ جلسے کرنے، جلوس نکالنے اور مسائل پر بحث و تمحیص کرنے کی عام اجازت دی گئی۔ شاہی حکومت نے غیر ملکیوں سے جو معاہدے کر رکھے تھے، انہیں منسوخ کر دیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ موروثی بادشاہت سے نجات دلانے کے سلسلے میں فرانس ہر ملک کی مدد کرے گا۔

بادشاہت کے خلاف جب لوگوں کے جذباتِ اشتعال کی آخری حدوں تک پہنچ گئے تو اس کا نتیجہ عام قتل و غارت کی صورت میں رونما ہوا۔ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والوں امیروں اور رئیسوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا جانے لگا جس پر بادشاہ یا شاہی خاندان کا ہمدرد ہونے کا شبہ ہوا، اسے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ جیل خانے توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ ان قیدیوں نے قتل و غارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس عام بغاوت کا مطلب ملک میں انقلاب برپا کرنا تھا۔ دانتن اور روبسپیر انقلابیوں کے لیڈر تھے لیکن ہنگامے کے دوران انقلابیوں نے "مفادِ عامہ" کی خلاف ورزی کے جرم میں انہیں بھی دھر لیا اور شبہ کی بنا پر دونوں کو قتل کر دیا۔

چند ماہ بعد ہنگامہ سرد پڑا تو پانچ افراد کی ایک مجلس عاملہ بنائی گئی۔ جسے نظم و نسق کے تمام اختیارات سونپ دیئے گئے۔ اس طرح فرانس میں شہنشاہیت کا خاتمہ ہو کر ملک کا اقتدار عوام کی ایک نمائندہ جماعت کے ہاتھ میں آگیا۔

جمہوریت اور بادشاہت کا چکر

ملک کی یہ سیاسی کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ انقلاب کے تھوڑے ہی عرصہ بعد فرانسیسی افواج کے ایک فوجی افسر نپولین نے جو اپنی سپہ گری کے جوہر دکھا کر سارے فرانس میں ہردلعزیزی حاصل کر چکا تھا اس سیاسی کیفیت کا رُخ دوسری طرف پھیر دیا وہ اپنی ہردلعزیزی سے فائدہ اٹھا کر مجلس عاملہ کو معطل کر کے ۹ نومبر ۱۷۹۹ء کو فرانس کا واحد حاکم (CONSUL) بن گیا۔ عوام چونکہ مسلسل بدامنی اور خونریزی سے تنگ آچکے تھے، اس لیے انہوں نے نپولین کے اس طرز عمل پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ بلکہ خوشی خوشی اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لیا۔ نپولین کے سلسلہ میں فرانسیسی عوام کا یہ رویہ فرانس میں بادشاہت کو دوبارہ قائم کرنے کا موجب بنا۔

نپولین بونا پارٹ ایک باکمال مدبر سیاست دان اور قابل جرنیل تھا۔ اس نے دور دراز علاقوں کو اپنے زیرنگیں کیا اور اپنی جنگی فتوحات کے طفیل دنیا کے بہترین جرنیلوں کی فہرست میں نام پایا۔ وہ ساری دنیا پر اپنی دھاک بٹھانا چاہتا تھا مگر اس کی فتوحات کا سلسلہ جلد ختم ہو گیا۔ سولہ سال کی مسلسل کامیابیوں کے بعد ۱۸۱۵ء میں اسے شکست ہوئی اور سینٹ ہیلنا کے جزیرے میں نظر بند کر دیا گیا۔ وفات بھی وہیں پائی۔

نپولین کی خودمختاری کے نتیجہ میں فرانس میں شاہی دوبارہ عود کر آئی یہ سلسلہ ۱۸۴۸ء تک قائم رہا۔ پھر بادشاہ کو معزول کر کے جمہوریت قائم کی گئی اور نپولین کا بھتیجا نپولین ثالث اس کا صدر بنایا گیا۔ جو جلد ہی قومی اسمبلی کے آئین کو معطل کر کے خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ مگر ۱۸۷۰ء میں جرمنی کی جنگ میں اسے بری طرح ناکامی ہوئی اور بھاگ کر انگلستان چلا گیا۔ اس شکست کے دوسرے سال فرانس میں تیسری مرتبہ جمہوریت قائم کی گئی۔

انقلاب کے نتائج

انقلاب فرانس کا ایک بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں قومی خود اختیاری کا جذبہ شدت اختیار کر گیا۔ ہر قوم اپنی قوت کے زور سے اپنے اس حق کو منوانے کی کوشش کرنے لگی۔ چنانچہ نپولین کی شکست کے بعد ۱۸۱۵ء میں ویانا میں یورپی اقوام کی ایک کانگرس منعقد ہوئی جس میں پہلی مرتبہ طے پایا کہ جو لوگ مذہبی، تہذیبی، نسلی اور لسانی اعتبار سے ایک ہیں، وہ ایک قوم ہیں اور انہیں سیاسی لحاظ سے آزاد اور خود مختار ہونے کا حق حاصل ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی طے پایا کہ کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسری قوم پر حکومت کرے۔

اس کانگرس کے وقت یورپین اقوام میں سے بیشتر اس قابل یا اتنی طاقتور نہ تھیں کہ اپنا یہ حق منوا سکتیں۔ اس لیے ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہ تھا اور نہ ہی ایسا ہو سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ قومی خود اختیاری کا جذبہ جو یورپ کی ہر قوم میں شدت اختیار کرتا جا رہا تھا، کسی حد تک اسے اطمینان کا سہارا مل گیا۔ بعدازاں یورپ میں جتنی جنگیں ہوئیں، ان سب میں بنیادی طور پر یہی جذبہ کارفرما رہا۔

پہلی جنگ عظیم اور فرانس

پہلی جنگ عظیم میں فرانس حرب و ضرب کا بہت بڑا میدان بنا رہا۔ اس کے مفصل حالات "پہلی جنگ عظیم" کے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس جنگ میں فرانس ہی نے سب سے زیادہ نقصان اٹھایا۔ تیرہ لاکھ پچاس ہزار آدمی مارے گئے۔ سات لاکھ زخمی ہوئے۔ تیس لاکھ چوالیس ہزار کو معمولی زخم آئے۔ چار لاکھ چھیاسی ہزار قید ہوئے یا لاپتہ ہو گئے۔ گویا قریباً پچاس لاکھ فرانسیسی جنگ کی نذر ہوئے۔ تین لاکھ گھر برباد ہوئے اور کم و بیش اتنے ہی گھروں کو نقصان پہنچا۔ چھ ہزار پبلک عمارتیں، بیس ہزار دوکانیں اور کارخانے تباہ و برباد ہوئے۔ ایک اندازے کے مطابق چودہ لاکھ کے قریب مویشی مارے گئے اور ہزاروں ایکڑ فصل برباد ہوئی۔

ظاہر ہے کہ یہ اتنا بڑا نقصان تھا جو پورا ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ شروع میں فرانس جرمنی سے بدلہ لینے کی کوشش کرتا رہا جس سے بجائے فائدے کے الٹا اسے اور نقصان پہنچا۔

السس اور لورین کے علاقے فرانس کو مل گئے تھے افریقہ اور شام میں بھی اس نے بعض اختیارات حاصل کر لیے ۱۹۲۵ء میں مراکش اور شام کے بعض علاقوں میں فرانس کے خلاف بغاوتیں ہوئیں۔ کئی حکومتیں بدلیں ۱۹۳۴ء میں شاہ یوگوسلاویہ فرانس چلا گیا۔ جہاں کسی دہشت پسند نے اسے قتل کر دیا ۱۹۳۸ء میں یورپ میں پھر تشویش ناک حالات نمودار ہوئے تو موسیو ڈلاڈییر کو فرانس کا وزیراعظم بنا دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں فرانس کی حکومت ختم ہو گئی (مفصل دیکھیں "دوسری جنگ عظیم" کے باب میں) فرانسیسی افواج کے کمانڈر انچیف مارشل پیتاں کو پہلے موت کی سزا دی گئی۔ پھر یہ سزا عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ لاوال کو پھانسی دی گئی۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ جن میں زیادہ ووٹ کمیونسٹوں کو ملے۔ اشتراکی دوسرے درجہ پر رہے اور جمہوری پارٹی تیسرے درجہ پر۔ جنرل ڈیگال کو بالاتفاق عارضی حکومت کا صدر بنایا گیا۔ لیکن کمیونسٹوں اور اشتراکیوں کی اکثریت کے باعث اسے جلد مستعفی ہونا پڑا۔ پھر کئی حکومتیں بدلیں اور ہڑتالیں ہوئیں۔ ہندچینی میں ویٹ نام کو آزادی دیدی گئی۔

باب ۱۲

آئرلینڈ

تمہید

آئرلینڈ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو برطانیہ کے مغرب میں واقع ہے۔ رقبہ جزائر برطانیہ کے نصف سے بھی کم ہے۔ آبادی تیس لاکھ کے قریب ہے۔

یہ جزیرہ صدیوں تک، غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہا۔ غلامی کا یہ دور بارھویں صدی کے نصف سے شروع ہوتا ہے، جب ہنری دوم کے زمانہ میں آئرلینڈ انگلستان کے زیر اثر آیا۔ اس وقت سے یہ ملک نت نئے مظالم کا شکار ہوتا رہا۔ آئرلینڈ کے باشندے عیسائی تھے۔ برطانوی شہنشاہیت کی طرف سے مذہب کے مقدس نام پر آئرلینڈ کے باشندوں سے بڑا ظالمانہ اور غیر منصفانہ سلوک روا رکھا گیا۔ سولھویں صدی میں جب پروٹسٹنٹ مذہب پھیلا تو آئرلینڈ کو بھی مجبور کر دیا گیا کہ روم سے تعلق توڑ کر برطانیہ کو اپنا کعبہ بنائے۔ مقصود یہ تھا کہ آئرلینڈ والوں پر روحانی غلبہ حاصل کر کے ان کی اس روح کو فنا کر دیا جائے جو برطانوی شہنشاہیت کے جابرانہ رویہ کے باعث ان میں پیدا ہو چکی تھی اور انہیں برطانیہ کے شکنجہ میں پوری طرح جکڑ لیا جائے۔ ہنری ہشتم نے شاہ انگلستان و آئرلینڈ کا لقب اختیار کر کے بظاہر آئرلینڈ کو اپنے زیر اقتدار کر لیا، ملکی زمینداروں اور جاگیرداروں سے زمینیں چھین کر انگریزوں کو دے دی گئیں۔ پھر جب تحریک اصلاح مذہب کا زور ہوا تو ملک میں "رومن کیتھولک ہونا" جرم قرار پایا۔ آئرلینڈ کے لوگ رومن کیتھولک مذہب کو پروٹسٹنٹ مذہب پر ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے مذہبی تصادم ہونے لگا۔ گرجے ڈھائے جانے لگے۔ عبادت گاہیں منہدم ہونے لگیں۔ کیتھولک پادریوں کی جائیدادیں ضبط ہونے لگیں۔ ہر جگہ قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا، خون کی ندیاں بہ نکلیں۔

بغاوتیں اور بلوے

ہنری ہشتم کے بعد ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں بغاوتوں اور شورشوں نے زیادہ سنگین صورت اختیار کر لی جنہیں

وحشیانہ طریقے سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ مظالم سے دب کر آئرلینڈ والوں نے انگریزوں کی اطاعت تو قبول کر لی مگر دل میں عداوت کی آگ بدستور سلگتی رہی۔

یہ آگ دوبارہ اس وقت سلگی، جب سترہویں صدی میں شاہ انگلستان جیمز اوّل نے آئرلینڈ کے سب سے زرخیز علاقے السٹر میں سکاٹ لینڈ کے باشندوں کو زمین دے کر بسانا شروع کیا۔ یہ حق تلفی اہل آئرلینڈ کو گوارا نہ ہو سکی۔ چنانچہ دوبارہ انگریزی مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

برطانوی حکومت کے سامنے آئرلینڈ کی اب بھی پیش نہ گئی۔ چنانچہ اس طوفان کو بھی تشدد سے دبا دیا گیا۔

پھر آلیور کرام ویل کے زمانہ میں آئرلینڈ والوں کے دلوں میں دبے ہوئے باغیانہ خیالات کو تلوار کے ذریعے نکالنے کی کوشش کی گئی۔ آئرلینڈ کی زرخیز زمینیں پھر انگریزوں میں بٹنی شروع ہوئیں۔ مخالفت کرنے پر انہیں ذلیل اور رسوا کیا گیا بلکہ جہازوں میں لاد کر دوسرے ملکوں میں بھیجا جانے لگا۔ سترھویں صدی کے آخر میں ولیم سوم نے انگریزوں کی حمایت میں آئرلینڈ پر مزید سختیاں شروع کر دیں۔ ان پر سرکاری عہدوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ رومن کیتھولک نہ تو سرکاری ملازمت میں لیے جاتے تھے، نہ انہیں زمین کا حق ملکیت مل سکتا تھا۔ آئرلینڈ والوں کے دلوں میں انتقامی جذبہ شدید قوت پکڑ گیا۔ بعد ازاں اسی نفرت کو کم کرنے کے لیے کچھ نرمی اختیار کی گئی۔ ۱۷۸۲ء میں ایک لیجسلیٹو اسمبلی قائم کی گئی مگر ووٹ دینے اور ممبری کا حق رومن کیتھولک کو نہ دیا گیا۔ آئرستانی اس سے بہت برہم ہوئے۔ چنانچہ اس اسمبلی کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۷۹۸ء میں انگلستان اور فرانس کی باہمی کشیدگی سے فائدہ اٹھا کر آئرلینڈ نے برطانیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ انگریزوں نے پہلے تو تشدد کیا۔ پھر آئرلینڈ کی پارلیمنٹ کا انگلستان کی پارلیمنٹ سے الحاق کر کے فیصلہ کیا کہ آئرلینڈ سے جو ممبر منتخب ہوں گے وہ انگلستان کی پارلیمنٹ کے ممبر سمجھے جائیں گے۔ یہ انگریزوں کا محض ایک فریب تھا جس میں آئرلینڈ نہ آ سکا۔ اور بغاوت جاری رہی۔ آئرلینڈ کے ممبر پارلیمنٹ میں برابر آزادی کا سوال اٹھاتے رہے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

ہوم رول کی تجویز

اس تمام کوشش کو ختم کرنے کے لیے انگلستان کی لبرل پارٹی کے قائد گلیڈسٹون نے آئرلینڈ کو داخلی خود اختیاری (ہوم رول) دینے کی تجویز پیش کی۔ مگر وہ ناپسند کی گئی۔ آئرلینڈ کے صوبہ السٹر میں انگریزوں کے حامی پروٹسٹنٹ مذہب والوں کی اکثریت تھی۔ انہوں نے گلیڈسٹون کی رائے سے شدید اختلاف کیا۔ کیونکہ وہ کسی صورت کیتھولک رومن والوں سے اتفاق نہ کرنا چاہتے تھے۔ آئرلینڈ اس مخالفت کے باوجود اپنے مطالبۂ آزادی پر ڈٹا رہا۔ آخر میں داخلی خود اختیاری کا قانون منظور ہو گیا۔ ابھی نفاذ کا وقت نہ آیا تھا کہ جنگ عظیم چھڑ گئی اور یہ مسئلہ دھرا رہ گیا۔

آئرلینڈ کو یہ قانون پاس ہو جانے پر یقین ہو گیا تھا کہ اب اسے آزادی مل جائے گی۔ چنانچہ اس نے جنگ عظیم چھڑنے پر انگریزوں سے پورا پورا تعاون کیا، مگر ان کا یہ خیال خواب نکلا۔ اس لیے کہ جنگ کے دوران میں سر ایڈورڈ کارسن نے، جو بعد میں برطانوی کیبنٹ کا وزیر بنا اعلان کر دیا کہ میں جنگ کے اختتام پر شمالی آئرلینڈ سے رضاکاروں کی ایک بہت بڑی تعداد بھرتی کروں گا جو کم از کم السٹر میں ہوم رول کی مخالفت کرے گی اس اعلان نے آئرلینڈ والوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ انہیں احساس ہونے لگا کہ ان کے ساتھ بدعہدی کی گئی ہے، چنانچہ انقلابی روح نے ان کے دل و دماغ میں پھر لہریں پیدا کر دیں۔ اندر ہی اندر سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں آئرلینڈ نے انقلابی جھنڈا بلند کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

ڈی ویلیرا

آزادی کے ان علمبرداروں میں ڈی ویلیرا کا نام زیادہ نمایاں ہے جو حریت پسند لیڈروں میں سے ایک تھا۔ دوسرے لیڈروں کے ساتھ اسے بھی گرفتار کر کے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ مگر بعد ازاں اس کی سزا منسوخ ہو گئی۔

۱۹۱۸ء میں ایک قانون کی رو سے آئرلینڈ کے لوگوں کو فوج میں جبری بھرتی کیا جانے لگا۔ اس سے بغاوت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ اٹھیں اور برطانیہ کے خلاف پھر جلسے شروع ہو گئے۔ اس زمانے میں سن فین (SINN FEIN) نام سے ایک سیاسی جماعت آئرلینڈ میں بہت طاقت پکڑ چکی تھی۔ اسی جماعت نے انگلستان سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کرنے کا اعلان کر کے آئرلینڈ کی آزادی اور جمہوریت کا جھنڈا بلند کر دیا پھر دو تین سال تک ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیے رکھا۔

جب صورت حال زیادہ خراب ہو گئی تو دسمبر ۱۹۲۱ء میں انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے آئرلینڈ کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ صرف السٹر کا صوبہ آزادی سے مستثنیٰ قرار پایا۔ طے ہوا کہ آئرلینڈ کا برطانوی پارلیمنٹ سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ بلکہ وہ اپنی پارلیمنٹ خود بنائے گا۔ البتہ ہر ممبر کو شاہ انگلستان سے حلف وفاداری اٹھانا پڑے گا اور ایک گورنر جنرل آئرلینڈ میں رہے گا۔

ڈی ویلیرا نے آزادی کی ان شرائط کو رد کر دیا، مگر بعض دوسرے لیڈروں نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ چنانچہ باہم پھوٹ پڑ گئی اور ڈی ویلیرا کے خلاف ایک اور پارٹی کھڑی ہو گئی۔ دونوں میں جنگ ہونے لگی۔ برطانوی حکومت نے ڈی ویلیرا کی مخالف پارٹی کی حمایت کی اسی پارٹی نے حکومت قائم کر لی اور ڈی ویلیرا گرفتار کر لیا گیا۔ سال بھر کی گرفتاری کے بعد رہا ہوا تو ۱۹۲۷ء میں اس نے آزاد پارلیمنٹ میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور بہت سی نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر ۱۹۳۲ء میں مخالف پارٹی کو شکست دے کر اپنی پارٹی کو برسر اقتدار لے لیا۔ اب وہ آئرلینڈ کا وزیر اعظم بنا۔

ڈی ویلیرا نے سب سے پہلے انگلستان سے تمام تعلقات منقطع کرنے کا اعلان کیا۔ بادشاہ انگلستان سے حلف وفاداری کا رواج بھی منسوخ کر دیا۔ آئرلینڈ جو سالانہ رقم انگلستان کو دیتا تھا، وہ بھی بند کر دی ۱۹۳۹ء میں جب برطانیہ نے جنگ عظیم میں شمولیت کا اعلان کیا تو اس نے آئرلینڈ میں فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کی بہت کوشش کی، مگر اجازت نہ ملی اور آئرلینڈ جنگ کے دوران غیر جانبدار رہا۔

۱۸ اپریل ۱۹۴۹ء کو ڈبلن میں آئرلینڈ کی جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس موقع پر جارج ششم شاہ انگلستان نے جمہوریت کے لیے خیر سگالی کا اظہار کیا۔

باب ۱۳

اٹلی

تعارف

رومۃ الکبریٰ کی عظیم الشان سلطنت جس کا پرچم اقبال کبھی مصر و ایران کی سرزمینوں پر بھی لہراتا تھا، اٹلی اس کا مرکز تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح سے ۴۷۶ء تک رومن بادشاہوں نے جس شان و شوکت سے حکومت کی وہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ سیزر اور آگسٹس جیسے شہنشاہوں کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھی صدی میں رومن سلطنت کی بنیادیں کمزور پڑنے لگیں، حتیٰ کہ ۴۷۶ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر ۸۰۰ء میں روم کے لاٹ پادری نے بادشاہ شارلیمان کو تاج پہنا کر مقدس سلطنت روما کے نام سے نئی عیسائی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کا پایہ تخت

بھی اگرچہ اٹلی کا شہر روم تھا تاہم اٹلی کی وحدت ختم ہو چکی تھی اور ملک کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ہر حصّے کا علیٰحدہ حکمران تھا جو رسمی طور پر پاپائیت کے مرکز روم سے تعلق جوڑے رہتا تھا۔ پوپ کی وجہ سے روم ساری عیسائی دنیا کا روحانی مرکز سمجھا جاتا تھا اٹلی کو بھی اسی وجہ سے یورپ میں عظمت و برتری کا درجہ حاصل تھا۔

اٹلی کی برتری اور عظمت کو زوال اس وقت آنا شروع ہوا جب جرمنی کے مارٹن لوتھر نے پاپائیت کے خلاف آواز اٹھائی۔ پوپ سے بیزاری کا اعلان کیا اور "اصلاح مذہب" کی تحریک نے عیسائیت کو پاپائیت کے اثر و رسوخ سے پاک کرنا چاہا۔

متحدہ اٹلی

پھر جب قومیت اور وطنیت کے جذبات نے زور پکڑا اور لوگ ہر مذہبی، علمی اور سیاسی مسئلے میں روما کی طرف رجوع کرنے کی بجائے اسے اپنی قوم اور اپنے وطن کی شاندار تاریخ میں دیکھنے لگے۔ تو روما کی کلیسائی طاقت کو زوال آنے لگا ادھر اٹلی کی حالت یہ تھی کہ ہر صوبہ خود مختار تھا۔ ان میں ہم مذہب اور ہم رنگ ہونے کے باوجود یگانگت کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ جب انیسویں صدی میں قوم پرستی کی ہوائیں چلنے لگیں۔ تو ہر قوم نے ایک نئے ولولے اور نظریے کے ساتھ اپنی تنظیم شروع کر دی۔ اطالوی دماغوں میں بھی قوم پرستی جنم لے چکی تھی میزنی (MAZINI) نے اٹلی کو ایک متحدہ قوم بنانے پر زور دیا۔ رئیسوں اور زمینداروں نے میزنی کو اپنے لیے خطرہ جانتے ہوئے ۱۸۳۰ء میں اسے جلاوطن کرا دیا اس نے فرانس پہنچ کر "نوجوان اٹلی" کے نام سے ایک جماعت بنائی جس نے یورپ میں اٹلی کے اتحاد کے لیے پروپیگنڈا کیا۔ نتیجہ میں اٹلی کے علاوہ یورپ کے دوسرے علاقوں میں بھی "متحدہ اٹلی" کے ہمدرد پیدا ہو گئے آخر ۱۸۶۱ء میں جزیرہ سارڈینیا کے رئیس وکٹر عمانوئیل کو اٹلی کے تمام حدود کا واحد تاجدار تسلیم کر لیا۔ تمام صوبے ایک حکومت اور ایک بادشاہ کے ماتحت آ گئے۔ اس طرح اٹلی سیاسی اعتبار سے متحد ہو گیا۔

۱۸۸۲ء میں اٹلی نے جرمنی اور آسٹریا ہنگری سے دوستی کا ایک معاہدہ کیا جو اتحاد ثلاثہ کے نام سے مشہور ہے۔ پھر ۱۹۱۴ء کی جنگ میں اٹلی ایک شاندار مستقبل کے لالچ میں اس معاہدے سے انحراف کر کے فرانس و برطانیہ کا حلیف بن گیا۔ مگر ۱۹۱۷ء میں آسٹریا کے ہاتھوں شکست کھائی۔ بعد ازاں برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے آسٹریا و ہنگری کی سلطنت پر فاتحانہ ضرب تو لگائی مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ جنگ عظیم کے خاتمہ پر اسے بہت کچھ ملنے کی توقع تھی، اتحادیوں کی طرف سے جو وعدے کیے گئے تھے" ان کے پیش نظر اٹلی سمجھتا تھا کہ روما الکبریٰ کی سلطنت کی طرح اس کا ستارہ بھی چمکے گا۔ مگر جنگ کے خاتمہ پر جب اسے توقع کے مطابق سب کچھ نہ ملا تو وہ بہت مایوس ہوا۔

فسطائیت

رد عمل کے طور پر اٹلی میں اتحادیوں کے خلاف جماعتیں بننے لگیں۔ جو سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے نئے نئے پروگرام وضع کرتی تھیں ان جماعتوں میں زیادہ اہمیت فسطائی یا فاشسٹ (FASCIST) جماعت کو حاصل ہوئی۔ اس کی تنظیم فوجی انداز پر کی گئی تھی۔ نصب العین یہ تھا کہ اٹلی کو اشتراکیت اور جمہوریت کے ملے جلے اصول کے مطابق ترقی کرنی چاہیئے۔ مقابل میں اشتمالیت پسندوں کی ایک جماعت بھی تھی فسطائی جماعت زیادہ مقبول تھی اور وہ اشتمالیت کے خلاف تھی۔ چنانچہ دونوں جماعتوں میں بلوے ہوئے۔

۱۹۱۹ء میں اٹلی میں سارا سال ہڑتالوں کا زور رہا۔ بندرگاہوں، ریلوں، فیکٹریوں اور چھاپہ خانوں میں مزدوروں نے ہڑتالیں کر دیں اور روسی اشتراکیت کے نمونے پر اپنی پنچائتیں بنائیں مگر وہ کامیاب نہ ہوئے۔ گویا اٹلی میں اشتراکیت ہار گئی اور کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے ممبر الگ ہو کر فسطائیوں سے مل گئے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں فسطائیوں کے ۳۲ آدمی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ ان میں سے ایک مسولینی تھا۔

اسی سال فسطائیوں نے ایک کانفرنس کی جس میں مسولینی سے جو اس جماعت کا لیڈر تھا عہد کیا کہ اس کے احکام کا اتباع کیا جائے گا۔ مسولینی نے اعلان کیا کہ وہ ملک کو بالشویکی خطرات سے بچانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے سوشلزم اور جمہوریت کے نعرے چھوڑے اور شاہیت پسندی کا نعرہ لگایا۔ اب فسطائیوں نے بے حد قوت حاصل کر لی۔ عوام کی کثرت ان کے ساتھ تھی اور مسولینی کے اشارے پر ہر کام ہوتا تھا۔ مسولینی نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور سوچا کہ کیوں نہ فوجی طاقت کے ذریعے انقلاب لایا جائے۔

انقلاب

اس پروگرام کے تحت ۲۷ جون ۱۹۲۲ء کو ۲ لاکھ فسطائی رضاکاروں نے مسولینی کی سرکردگی میں روم پر حملہ کر کے شاہی محل کو گھیرے میں لیا بادشاہ نے گھبرا کر مسولینی کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔

مسولینی کی وزارت میں تیس وزیر تھے۔ نصف فسطائی جماعت کے اور نصف دوسری جماعتوں کے۔ بیرونی معاملات اور اندرونی امن و انتظام اور انصاف کے محکمے مسولینی نے اپنے ہاتھ میں رکھے۔

یہ انقلاب کامل امن و سکون کے ساتھ ظہور میں آیا۔ فسطائی رضاکاروں کو بعد میں قومی فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔

مسولینی نے فوجی طاقت کے بل پر اٹلی کی حکومت حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی برتری اور عظمت منوانے کے لیے قوت کا استعمال ضروری سمجھا۔ فسطائی جماعت کے سوا باقی تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا وزارت سنبھالنے کے بعد اس نے جتنی بلند اور پُر جوش تقریریں کیں وہ خطابت کے لحاظ سے بہت اونچا درجہ رکھتی ہیں۔ ابتدا میں اس کی بہت مخالفت ہوئی جسے اس نے سختی سے دبانے کی کوشش کی چنانچہ تین چار سال کے اندر اس کے خلاف ہر سازش ناکام ہو گئی اور اٹلی میں عملاً مسولینی کا راج قائم ہو گیا فاشسٹ پارٹی کو برتری حاصل ہو گئی اور یہ پارٹی ملک کی حکمران تسلیم کر لی گئی۔

مسولینی کے کارنامے

بحیرہ ایڈریاٹک کی اہم بندرگاہ فیوم پر عرصے سے اٹلی کی نظریں تھیں ۱۹۱۹ء کی صلح کانفرنس میں اسے آزاد ریاست بنا دیا گیا تھا۔ مسولینی نے برسر اقتدار آتے ہی یوگوسلاویہ سے بات چیت کر کے فیوم پر قبضہ کر لیا۔ مجلس اقوام نے احتجاج کیا۔ مگر اٹلی نے قبضہ بحال رکھا۔

اب مسولینی افریقہ کے شمالی ساحل کے علاوہ یورپ میں یوگوسلاویہ سے لبانیہ و یونان تک اپنی حدود وسیع کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے بہانے کا منتظر تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۶ء میں حبشہ پر حملہ کر کے اٹلی سے اس کا الحاق کر لیا۔ پھر اپریل ۱۹۳۹ء میں البانیہ سنبھال لیا۔ ہٹلر اور مسولینی کے اغراض مشترک تھے اس لیے دونوں نے باہم اتحاد قائم کر لیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ بولا تو مسولینی کو بھی موقع ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ اس نے جون ۱۹۴۰ء کو جرمنی کی آواز میں آواز ملا کر برطانیہ اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ پہلے یونان کو مطیع کیا۔ پھر یوگوسلاویہ پر قبضہ جما لیا۔ جب جنگ نے پانسا پلٹا تو پہلے افریقی مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکلے، پھر اتحادی فوجیں آگے بڑھیں تو خود مسولینی کی پارٹی کے آدمی اس کے خلاف ہو گئے۔ شاہ اٹلی نے اسے معزول کر کے نظر بند کر دیا۔ ہٹلر کے دوستوں نے حیرت ناک طریقہ سے مسولینی کو چھڑا لیا۔ بعد ازاں جب ہٹلر کا ستارہ غروب ہونے کے دن آئے تو مسولینی کو بھی ایک غضبناک ہجوم نے قتل کر دیا۔

باب ۴: طرابلس، تونیسیہ، الجزائر اور مراکش

تعارف

طرابلس (لیبیا) تونیسیہ، الجزائر اور مراکش افریقہ کے شمالی ساحل کے وہ مظلوم علاقے ہیں جن میں تقریباً دو کروڑ عرب و بربر بستے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ان علاقوں کی زرخیزی کے باوجود غربت و فلاکت کا شکار ہیں۔ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے پسماندہ اور سیاسی لحاظ سے ان کی حالت قابل رحم ہے۔ یہی پس ماندہ افراد کبھی ہسپانیہ کے حکمراں تھے۔ آٹھ سو سال تک انہوں نے وہاں بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ غرناطہ اور قرطبہ کی عمارتیں اور محلات آج تک ان کی عظمت و شوکت کی داستانیں سنا رہے ہیں، لیکن جب حکومت چھن گئی تو ذلت و ادبار کی گھٹاؤں نے انہیں گھیر لیا۔ یورپی شہنشاہیت ہی نے ان کا خون چوس کر قوی مضمحل کر دیئے۔ دولت و ثروت سے محروم کر دیا اور اب ان مظلوموں میں سے بعض کے لیے آزادی کا دروازہ کھلا ہے اور بعض ابھی تک نہایت خوفناک ظلم و جور کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔

سیاسی حالات

تونیسیہ اور مراکش کا تعلق عرب فرمانرواؤں سے ہے مگر نگرانی فرانس کی ہے۔ الجزائر بھی فرانس ہی کے قبضہ میں ہے۔ تونیسیہ براہ راست اٹلی کے ماتحت تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آزاد ہوا۔ مراکش کا کچھ حصہ ہسپانیہ کے تصرف میں ہے۔ طنجہ کا علاقہ بین الاقوامی ہے۔

فرانس نے اپنی ہر نو آبادی میں فرانسیسی قومیت کی تبلیغ کے لیے راستے ہموار کئے۔ افریقہ کی بیشتر نو آبادیوں میں اس کی یہ پالیسی کامیاب رہی۔ مگر جب اس نے ان عرب علاقوں میں یہی طریق کار اپنایا تو کامیابی در کنار فسادات کا سلسلہ چل نکلا۔ الجزائر اور مراکش میں فرانس نے اپنا شہری قانون نافذ کر کے عربوں کو یہ حق دیا کہ وہ چاہیں تو شہری حقوق کے لحاظ سے فرانسیسی بن سکتے ہیں۔ عربوں کو فرانسیسی بنانے کے لیے یہ ایک ناپاک اقدام تھا۔

طرابلس (لیبیا)

پہلی جنگ عظیم سے پہلے طرابلس سلطنت عثمانیہ کا صوبہ تھا۔ جب اس سلطنت کو زوال آنے لگا اور اس کی طاقت ختم ہو گئی تو اٹلی نے دوسری یورپی طاقتوں کے ساتھ سازشیں اور خفیہ معاہدے کر کے اس پر حملہ کر دیا عثمانی فوجوں میں مقابلے کی طاقت نہ تھی، وہ پیچھے ہٹ گئیں اور اٹلی نے آسانی سے اس پر قبضہ کر لیا۔

اہل طرابلس نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف جدوجہد شروع کر دی اور اپنی آزادی کے لیے سرگرمیاں جاری رکھیں۔ طرابلس کی ان تحریکوں میں سنوسی تحریک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اٹلی نے پوری قوت کے ساتھ اس تحریک کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ بالآخر چار سال کی مسلسل جنگ کے بعد سنوسی تحریک کو مکمل طور پر کچل دیا گیا۔

اطالوی فوجوں نے انتقامی جذبہ کے تحت، بچوں بوڑھوں اور عورتوں تک کا قتل عام کیا۔ لوگوں کو چن چن کر گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ کھیتوں اور فصلوں کو تباہ کر دیا گیا۔ عورتوں کی عصمت لوٹی گئی۔ کفرہ سنوسی تحریک کا مرکز اور بہت زرخیز جگہ تھی۔ وہاں کی زمینیں، کھیت اور باغات ضبط کر لیے گئے۔ اصل مالکوں کو علاقے ہی سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ کفرہ میں اطالویوں کو بسانے کی تجویز ہوئی۔ غرض اٹلی نے بدوئن کے نہتے شہریوں اور بے قصور لوگوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ جس کا رد عمل یہ ہوا کہ تمام عالم اسلام نے اٹلی کے اس طرز عمل پر احتجاج کیا۔ اٹلی کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔

تونیسیہ کے جنوب میں ریگستانی علاقہ کو چھوڑ کر باقی سارا زرخیز علاقہ اٹلی کا صوبہ بنا دیا گیا اور اطالوی باشندوں کے سوا باقی سب پر مارشل لا کی فوجی حکومت مسلط کر دی گئی۔ دوسری جنگ عظیم میں طرابلس پر اتحادیوں نے قبضہ کر لیا اور انجام کار سنوسی خاندان کے ایک فرد سید ادریس سنوسی کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ طرابلس کا نام آج کل لیبیا ہے۔

تونیسیہ

الجزائر کے مشرق میں تونیسیہ کا سرسبز و شاداب خطہ ہے۔ فرانس نے الجزائر پر قبضہ کرنے کے بعد تونیسیہ پر دست درازی کی گنجائش پیدا کی اور ۱۸۸۱ء میں اس پر حملہ کر دیا۔ فرانس کے اس اقدام پر یورپی طاقتوں پر کھلبلی مچی، اس لیے کہ وہ تونیسیہ کے معاملے میں فرانس کی حریف تھیں، لیکن خفیہ معاہدوں کے ذریعے انہیں خاموش کر دیا گیا۔ برطانیہ سے کہا کہ مصر میں جو چاہو کرو، ہم اس میں دخل نہ دیں گے۔ پھر جرمنی کو کانگو اور کامروق میں ایک علاقہ دے دیا گیا۔

اٹلی سے کہا کہ طرابلس پر حملہ کر کے اسے سنبھال لو، ہم نہ بولیں گے۔ غرض ان رشوتوں کے طفیل فرانس نے بے کھٹکے تیونس اپنے قبضہ میں کر لیا۔

تونیسیہ میں برائے نام ایک سلطان تخت پر بٹھا دیا گیا مگر علاقہ کی باگ ڈور فرانس کے ہاتھ میں رہی آزادی حاصل کرنے کے لیے الجزائر کی طرح تیونیسیہ میں بھی ہنگامے ہوئے، مگر انہیں دبا دیا گیا سنہ ۱۹۲۰ء کی جنگ میں تیونیسیہ کے باشندوں سے بھی وعدہ کیا گیا کہ جنگ میں چندے اور آدمیوں کے ذریعے مدد کرو تو اختتام پر تمہیں آزاد کر دیا جائے گا چنانچہ تونیسیہ نے جی کھول کر فرانس کی مدد کی مگر کوئی وعدہ ایفا نہ کیا گیا اس پر ہنگامے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اتنا کیا گیا کہ سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک مجلس بنائی گئی جس کی صدارت کے فرائض مستقل طور پر فرانس کے ریذیڈنٹ جنرل کو، جو محکمۂ خارجہ کا وزیر ہوتا ہے سونپ دیئے گئے۔ اس مجلس کے ذریعے عوام کی آواز کو حکومت کے نظم و نسق میں کچھ دخل حاصل ہو گیا۔ مجلس کے گیارہ ارکان میں سے آٹھ فرانسیسی آبادی سے لیے گئے۔ جو سات فیصد ہے اور تین عرب آبادی سے جس کا تناسب ۹۲ فیصد ہے۔

سارے علاقے کو ۱۹ ضلعوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر ضلع کا فرانسیسی گورنر مقرر ہوا مسلمانوں کے مقدمات کے لیے قاضی اور فرانسیسیوں کے معاملات کے لیے فرانسیسی منصف مقرر کیے گئے۔ لیکن آہستہ آہستہ تونیسیہ کی قومی تحریک بروئے کار آئی۔ وہاں جمعیت قائم ہو گئی اور اب آزادی کا دور دورہ ہے۔

الجزائر یا الجیریا کا رقبہ ساڑھے آٹھ لاکھ مربع میل ہے۔ جنوبی حصہ بیشتر ریگستانی ہے مگر شمالی ساحل بہت زرخیز اور وہاں کی آب و ہوا خوشگوار ہے۔

مردِ مجاہد

الجزائر کی تحریک آزادی کے سلسلے میں سید عبدالقادر کا نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے ۱۸۳۲ء میں الجزائر کے سب قبائلیوں نے اسے اپنا امیر مقرر کر کے فرانس کے خلاف جنگی اقدامات شروع کر دیئے۔ فرانسیسی فوجی طاقت کے سامنے قبائلیوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ تاہم الجزائریوں نے نہایت پامردی کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا۔ شکستوں پر شکستیں کھائیں مگر پائے استقلال میں لغزش نہ ہوئی اور برابر لڑتے رہے۔ آخر ۱۸۴۵ء میں فرانس نے زبردست تیاری کے بعد عبدالقادر کی طاقت کو توڑ دیا اور وہ مراکش سے بھاگنے پر مجبور ہوا۔ دو سال بعد ۱۸۴۷ء میں اسے گرفتار کر کے مع اہل و عیال فرانس لے جا کر بند کر دیا گیا۔

عبدالقادر کی گرفتاری کے باوجود تحریک آزادی دبائی نہ جا سکی۔ نئے رہنما پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے فرانس کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھیں۔

سنہ ۱۹۵۴-۵۷ء میں خوفناک جنگیں ہوئیں۔ فرانس نے نہتے شہریوں پر اپنی پوری بہیمیت اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ قتل و خونریزی اور درندگی کا پورا پورا ثبوت دیا گیا مگر آزادی

کا جذبہ الجزائریوں کے دل سے فنا نہ کیا جا سکا۔

الجزائر کی ساری آبادی مسلمان تھی۔ اس لیے بظاہر وہاں کے باشندوں میں تفرقہ پیدا کر کے حکومت کرنے کی فرانس کو کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ لہٰذا یہ ترکیب سوچی گئی کہ ملک کے شمالی علاقہ میں یورپ کے باشندوں کو بسا کر ایک نئی اقلیت پیدا کر دی جائے۔ پھر الجزائر کو جدا ملک کی بجائے فرانس ہی کا حصہ قرار دے دیا جائے۔ اس تجویز کے تحت سنہ ۱۸۳۴ء میں نپولین ثالث نے اعلان کیا کہ الجزائر نوآبادی نہیں، بلکہ فرانس کا ایک صوبہ ہے۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں جب جرمنی نے فرانس پر حملہ کیا تو الجزائر کے باشندوں نے فائدہ اٹھا کر پوری قوت سے فرانس کے خلاف جارحانہ اقدامات شروع کر دیئے مگر کسی منظم طاقت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ اس لیے فرانس نے انہیں پچھاڑ دیا۔ تونیسہ نے الجزائر کے باشندوں سے ہمدردی کا ثبوت دیا تھا، چنانچہ فرانس نے انتقامی طور پر تیونس پر بھی بول دیا اور اسے بڑی طرح شکست دی۔

اس جنگ و دو کے بعد فرانس نے الجزائر کو فرانس کا صوبہ بنانے کا کام پوری طاقت سے شروع کر دیا۔ ہزاروں مربع میل زمینیں بیس سے زمینداروں کو بے دخل کیا جانے لگا۔ بغاوت کے الزام میں کئی افراد قتل کیے گئے، یا جیلوں میں ٹھونسے گئے۔ مختلف ٹیکس لگائے گئے۔ الجزائریوں سے تاوان جنگ وصول کیا گیا۔ الجزائر کی داخلی خود مختاری کو ختم کر کے تمام شعبے اپنے قبضے میں لے لیے گئے۔

ان سختیوں کے باعث عرصہ تک آزادی کی تحریک دبی رہی۔ پہلی جنگ عظیم چھڑی تو فرانس کو الجزائریوں کی مدد کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ یہ جھانسا دیا گیا کہ جنگ کے بعد الجزائر کو آزاد کر دیا جائے گا۔ الجزائر کے باشندے اس فریب میں آگئے اور جنگ کے زمانے میں ہر طرح سے فرانس کی امداد کی، لیکن جنگ کے خاتمے پر فرانس نے اپنا وعدہ وفا نہ کیا یورپین لوگ الجزائر کے شمال میں آباد ہو چکے تھے اور ایک طاقتور اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ الجزائریوں نے جنگ کے بعد فرانس کی بدعہدی دیکھ کر آزادی کے لیے آئینی تحریک شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں تین مراعات دے دی گئیں۔

۱۔ قصبوں اور شہروں کے انتظامات کے لیے محدود اختیارات رکھنے والی کمیٹیاں بنا دی گئیں۔

۲۔ فوج میں الجزائریوں کو چند ابتدائی درجوں تک ترقی دی جانے لگی۔

۳۔ الجزائریوں کو فرانسیسی شہریت کے حقوق مل گئے۔

ان مراعات کے ساتھ ساتھ فرانس کی پالیسی ہمیشہ یہ رہی کہ الجزائریوں کو فرانسیسی تہذیب میں جذب کر لیا جائے۔ یا انہیں مذہباً عیسائی بنا لیا جائے۔ اچھی اچھی زمینیں عربوں سے چھین کر انہیں ناقص اور بنجر زمینیں دی گئیں۔ سرسبز و شاداب علاقوں پر فرانسیسیوں کا تسلط ہو گیا۔ چھوٹی عمر کے یتیم بچوں کو فرانس بھیج دیا جاتا تھا۔ جہاں پادری ان کی تربیت اور پرورش کرتے اختلافات کو ہوا دینے کے لیے فرانس نے عرب اور بربر کا جھگڑا کھڑا کر لیا۔ بربر قوم کی "قومی زبان" تسلیم کی گئی اور ان کے مدارس میں ذریعہ تعلیم بن کر عربوں اور بربروں کے درمیان تفرقہ اور کشیدگی پیدا کرنے کا موجب بنی۔ شمالی حصے میں یورپین آبادی بسائی گئی۔ لہٰذا الجزائر کی شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کی گئی۔ دونوں حصوں کا نظم و نسق علیحدہ کر دیا گیا۔ یورپین آبادی کا تناسب تقسیم ملک کے باعث یک چوتھائی کے قریب ہو گیا۔ اس اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرنے کے لیے یہ اہتمام کیا گیا کہ ووٹ دینے والے کا ایک مخصوص معیار مقرر کر دیا گیا۔ یہ معیار ایسا تھا کہ بہت کم عربوں کا نام ووٹروں کی فہرست میں آتا تھا۔ چنانچہ الجزائر کی ۹۰ فیصد اکثریت عملاً اقلیت بن کر رہ گئی۔

ووٹ کے سلسلے میں تو عربوں کو یوں نظر انداز کر دیا گیا۔ مگر ٹیکس زیادہ تر انہیں سے لیے جاتے۔ نیز ایک قانون بنایا گیا۔ جس کی رو سے جنگ کے موقع پر عرب کم از کم دو سال تک فوجی ملازمت کرنے پر مجبور تھے۔

شمالی حصہ مکمل طور پر فرانس کا حصہ بن چکا تھا۔ اسے فرانسیسی پارلیمنٹ کا حلقہ انتخاب قرار دیا گیا۔ جہاں سے دو تین ممبر منتخب ہو کر جاتے۔ حکومت کے تمام محکمے براہ راست فرانسیسی وزیروں کے سپرد تھے۔ مقامی حکومت کی نگرانی کے لیے گورنر جنرل مقرر ہوا دیوانی و فوجداری قوانین وہی تھے جو فرانس میں رائج تھے مسلمانوں کے مذہبی معاملات شرعی عدالتوں میں طے پاتے، مگر جب ہائی کورٹ میں ان فیصلوں کے خلاف اپیلیں کی جاتیں ان کا جج فرانسیسی ہوا کرتا۔

الجزائر کے پایۂ تخت میں ایک یونیورسٹی ہے جہاں فرانسیسی ذریعۂ تعلیم ہے مسلمانوں نے ابتدائی تعلیم کے مدرسے کھول رکھے ہیں مگر اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانسیسی درسگاہیں ہیں۔

اس کے بعد مزید تغیرات ہوئے۔ آج کل ہنگامے جاری ہیں۔ الجزائریوں نے ایک آزاد حکومت قائم کر لی ہے اور وہ فرانسیسیوں سے جنگ کر رہے ہیں۔

مراکش

مراکش شمالی افریقہ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی تک اس کی عظمت کا پرچم، افریقہ کے جنوب مشرقی اور شمالی ساحل سے ہسپانیہ و پرتگال تک لہراتا رہا ہے۔ یورپین اقوام اہل مراکش کو مُور کے نام سے یاد کرتی ہیں پندرھویں صدی کے آخر میں جب ہسپانیہ کی سلطنت پامال ہو گئی تو مراکش میں بھی سیاسی ابتری پھیل گئی۔ خانہ جنگیوں کا سلسلہ چل نکلا ملک کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ آخر سترھویں صدی میں جب یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہو رہا تھا، مولائی سماعیل نے مراکش کے باہمی اختلافات ختم کر کے سیاسی انتشار کو ختم کیا مگر صنعتی انقلاب کے باعث جہاں یورپ کے دوسرے ملکوں نے اپنی معاشی اقتصادی اور سیاسی حیثیت کو زیادہ مضبوط کیا۔ وہاں نت نئی سائنسی ایجادات اور ترقیات کے نئے طریقوں سے ناواقفیت کی بنا پر اہل مراکش محروم رہے اور یورپ کے مقابلہ میں اقتصادی اور سیاسی دونوں لحاظ سے کمزور رہے۔ یورپ کی حریصانہ نظریں مراکش پر مدت سے تھیں۔ چنانچہ جب فرانس الجزائر و تیونس پر قابض ہو گیا تو اب اس نے مراکش پر دندانِ آز تیز کرنے شروع کر دیے۔ برطانیہ، اسپین اور اٹلی کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مراکش کے لیے یورپی طاقتوں میں باہم رسہ کشی علاوتیں اور رقابتیں پھوٹ نکلیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں برطانیہ، فرانس، اٹلی اور ہسپانیہ میں باہم جو خفیہ معاہدے ہوئے ان میں طے پایا کہ سلطانِ مراکش کی آزادی کو بحال رکھا جائے، مگر معاشی فائدے کے لیے اسے الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر کے آپس میں بانٹ لیا جائے۔ اب اس مقصد کے لیے موقع کا انتظار تھا۔

یہ موقع یوں نکلا کہ سنہ ۱۹۰۱ء میں سلطان عبدالعزیز مراکش کا حکمران بنا یہ شخص بہت زیادہ فضول خرچ اور عیاش تھا۔ اس کے طرز عمل نے ملک میں شورش برپا کر دی۔ فرانس نے اس کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ملک سے بدامنی کو دُور کرنے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ فرانسیسی افسروں کے ذریعے پولیس کو جدید طریقوں کے مطابق ترتیب دی جائے۔ سڑکوں اور تار برقی وغیرہ کے انتظام کیا جائے۔ اس طرح ملک کی حالت اصلاح پذیر ہو کر بدامنی ختم ہو جائے گی پھر دو کروڑ بیس لاکھ فرانک سلطان کو قرض دیئے گئے۔ اس کے عوض میں درآمد برآمد کے محصول بطور رہن اپنے قبضے میں لے لیے۔ فرانسیسی پولیس افسروں نے جو سرکشیوں کو زیست

دیے آنے لگے۔ رفتہ رفتہ سارے محکمہ پولیس پر قبضہ جما لیا۔ غرض بڑی خوش اسلوبی سے مراکش میں فرانسیسی دخل کا اہتمام ہوگیا۔ جرمنی نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تو فرانس نے اپنے دخل کا کام دھیما کر دیا۔ بعد ازاں مراکش کے معاملہ میں جرمنی اور فرانس کے مابین سمجھوتہ ہوگیا پھر جب اہل مراکش نے فرانسیسی اقتدار کے خلاف جلسے کیے تو فرانس نے بلووں کو دبانے کے بہانے کاسابلانکا میں اپنی فوجیں اتار کر اس پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی جگہ جگہ اپنے مسلح آدمی کھڑے کر دیئے پھر دونوں فوجوں میں جھڑپ بھی ہوئی، مگر ہر ایک یہی کہتا تھا کہ اسے مراکش کی آزادی کو سلب نہیں کرنا۔

سلطان مراکش فضول خرچیوں اور عیاشیوں کے باعث فرانس تلے دب چکا تھا۔ جس سے فرانس کو مراکش میں قدم جمانے کا اچھا موقع مل گیا۔ ۱۹۱۲ء میں طے پایا کہ مراکش کے جس حصے پر فرانس کا قبضہ ہے، وہ فرانس ہی کے پاس رہے۔ شمال مغربی حصے پر جو ہسپانیہ کے پاس ہے، وہ اسی کی سرپرستی میں رہے اور طنجہ کا علاقہ جو اہم تجارتی شاہراہ پر واقع ہے بین الاقوامی سمجھا جائے۔

اس تقسیم نے مراکش کے مختلف حصوں میں بغاوت پیدا کر دی۔ ۱۹۲۱ء میں ہسپانوی مراکش میں بغاوت کی آگ بھڑک گئی۔ مراکشی مجاہدین کے لیڈروں میں ریف کے غازی عبدالکریم اور ہسپانوی افواج کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں ۱۹۲۶ء میں ہسپانیہ اور فرانس کی فوجوں نے مل کر غازی عبدالکریم پر زبردست حملے کیے جن کی تاب نہ لا کر غازی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس فتح کے بعد ہسپانیہ نے مراکشی عوام میں پھوٹ ڈالنے کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ بربروں میں قانون شریعت کے بجائے ۱۹۳۰ء کا قانون و رواج نافذ کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بربر قوم کے معاشرتی اعمال و افعال اور ذہنی و دماغی ترقی کی رفتار کو فرانس کی حکومت سے باندھ دیا گیا اور عربوں اور بربروں میں تفرقہ پیدا ہوگیا۔ علاوہ ازیں فرانس نے بعض لوگوں کو خطابات اور انعامات کے ذریعہ فرانسیسی حکومت کا حامی اور مدح خواں بنا لیا۔ بعض عربوں کو مکمل طور پر فرانسیسی تہذیب و معاشرت میں رنگ لیا گیا۔ اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ فرانسیسیوں کے خلاف مراکشیوں کی تحریک آزادی بے حد کمزور ہو جائے۔ یعنی ہوئی نہیں۔ اس سلسلہ میں فرانس نے ایک مرتبہ سلطان مراکش کو معزول کیا۔ قوم نے اس جوش سے سلطان کا ساتھ دیا کہ فرانس سلطان کو واپس لانے پر مجبور ہوگیا۔ اب پہلے کے مقابلے میں آزادی ہے، لیکن ابھی تک کامل آزادی حاصل نہیں ہوئی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ فرانسیسی مراکش میں حکومت بہ ظاہر مراکشی سلطان کرتا ہے۔ مراکش کے اس حصہ میں جو ہسپانیہ کے زیر نگیں ہے اسی سلطان کا ایک نائب حکمران ہے۔ مگر عملاً وہاں ہسپانوی ہائی کمشنر ہی سب کچھ کرتا ہے۔ فرانسیسی مراکش کی بھی یہی کیفیت ہے۔

مراکش کا علاقہ ۲ لاکھ ۳ ہزار مربع میل وسیع ہے۔ آبادی ۸۰ لاکھ سے زائد ہے جس میں اسی فیصد مسلمان ہیں۔ عام زبان عربی ہے۔ بربری قبائل میں بربری زبان بولی جاتی ہے جو عربی سے ملتی جلتی ہے۔ فرانسیسی حلقے میں سرکاری اور دفتری زبان عربی ہے ہسپانوی حلقے میں سرکاری زبان ہسپانوی ہے۔

باب ۱۵ افغانستان

تعارف افغانستان کا آزاد ملک پاکستان کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں روس اور ایران سے ملتی ہیں۔ رقبہ ایران سے دو تہائی کم یعنی اڑھائی لاکھ مربع میل اور آبادی ایران کے برابر یعنی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے۔ زرخیزی میں ایران سے بڑھا ہوا ہے۔ میووں اور پھلوں کی تجارت کا خاص مرکز ہے۔ ہینگ نکالنے کا پودا افغانستان میں کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ بدخشاں میں دنیا کے بہترین لعل کی کان ہے۔ ایراک اور ہرات میں پٹرول کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔

سیاسی اہمیت ہندوستان پر انگریزوں کی عملداری کے زمانہ میں افغانستان پر ہمیشہ انگریزوں کی نظر رہی ہے۔ اس لیے کہ یہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ہندوستان کو روس کی دستبرد سے محفوظ رکھتا ہے۔ لہٰذا انگریزوں نے ہمیشہ افغانستان پر اپنا اثر و رسوخ اور اقتدار قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ انگریزوں نے مغربی بازو پر افغانستان کو ہندوستان کی پشت پناہ بنائے رکھا۔ روس بھی افغانستان کو ہمیشہ للچائی نظروں سے دیکھتا رہا ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان کے ساتھ تجارت کے لیے یہی ایک مناسب راستہ ہے۔ نیز وہ اسلامی ملکوں کے ساتھ اسے وسیلے کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔

افغان اور برطانوی کشمکش افغانستان پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے انگریزوں نے پہلی کوشش ۱۸۳۸ء میں کی۔ برطانیہ کی منظم فوجوں نے چار سال تک کئی مرتبہ افغانستان پر یلغار کی اور متعدد اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ مگر قبضہ بحال رکھنا ممکن نہ ہوا، اس لیے ہر بار واپس جانا پڑا۔

اٹھارویں صدی تک افغانستان کے مشرقی حصہ میں سلطنت مغلیہ اور مغربی میں ایران کا پرچم لہرا رہا تھا اور افغانستان ان دونوں حکومتوں کی کڑی گرفت میں رہا مگر جب ایران میں نادر شاہ نے وفات پائی، ادھر اورنگ زیب دنیا سے رخصت ہوا تو یہ گرفت ڈھیلی پڑی۔ سو سال تک افغانستان میں خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہر امیر اپنا اقتدار بڑھانے کی کوشش کرنے لگا ادھر ہندوستان میں انگریز برسر اقتدار آ چکے تھے۔ چنانچہ وہ افغانستان کو اپنے اقتدار میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس وقت پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی اور سکھوں کا طوطی بول رہا تھا۔ انگریزوں نے رنجیت سنگھ کو افغانستان کے خلاف مدد دی۔ مقصود یہ تھا کہ اس بہانے افغانستان پر برطانوی قبضہ ہو جائے مگر ۱۸۳۴ء میں امیر دوست محمد نے سکھوں کو زبردست شکست دے کر انگریزوں کی ان امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ بلکہ انگریزوں کو افغانستان سے خطرہ پیدا ہوگیا۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے افغانستان پر چڑھائی کر دی، ملک عارضی طور پر انگریزوں کے قبضہ میں آگیا مگر افغانستان اپنے ملک میں انگریزوں کا وجود برداشت نہ کر سکے۔ بغاوت کا زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں انگریزی سپاہ موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ صرف ایک شخص ڈاکٹر برائڈن بچ کر برطانوی حدود میں پہنچ سکا۔

اس کے بعد انگریزوں نے یہی مناسب سمجھا کہ افغانستان کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی اختیار کی جائے مگر اپنے قدم جمانے کے لیے در پردہ اقدامات جاری رکھے۔ ایک مرتبہ پھر افغانستان پر چڑھائی کی گئی۔ کابل میں انگریز ریذیڈنٹ مقرر کر دیا گیا اور حفاظتی فوج بھی متعین ہو گئی۔ مگر وہاں ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا یہی مناسب سمجھا گیا کہ افغانوں سے صلح و آشتی کے تعلقات برقرار رکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ افغانستان کو کم از کم ایسی آزاد حکومت بنا دیا جائے جو روس کے بجائے انگریزوں کی بہی خواہ ہو۔ اس مقصد کے لیے انگریزوں نے افغانستان کے ساتھ مختلف معاہدے کیے۔ ان معاہدوں کی ابتداء افغانستان کے امیر عبدالرحمان کے عہد سے ہوتی ہے۔

امیر عبدالرحمان

افغانستان ابھی تک بہت سے قبائلی سرداروں میں بٹا ہوا تھا۔ افغانستان کی کمزوری کا سب سے بڑا باعث یہی تھا روس اور برطانیہ اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں امیر عبدالرحمان تخت افغانستان پر بیٹھا تو اس نے سب سے پہلے اسی کمزوری کو محسوس کیا۔ چنانچہ اس کا پہلا اقدام یہ تھا کہ اس نے قبائلی سرداروں کی باہمی رقابت اور خانہ جنگیوں کو ختم کر کے ملک میں وحدت قائم کی۔ پھر روس اور برطانیہ سے باعزت سمجھوتے کیے جن کے طفیل بیرونی مداخلت کا راستہ بند ہو گیا۔ امیر نے انگریزوں کو یقین دلایا کہ اگر وہ افغانستان کو اپنی سازشوں کا نشانہ نہ بنائیں تو اس کے تعلقات ان سے خوشگوار رہیں گے۔ انگریزوں نے اس پیشکش کو غنیمت جانا اور برطانوی فوجیں افغانستان سے نکال لیں۔

برطانوی حکومت سے ایک صلح نامہ ہوا جس کے تحت افغانستان کے خارجی معاملات پر نگرانی کا اختیار برطانیہ کو دیا گیا۔ یہ اس لیے ہوا کہ افغانستان بہت کمزور تھا۔ بعد ازاں جیسے افغانستان کی قوت بڑھتی گئی، انگریزوں کا یہ اختیار بھی کم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ امیر امان اللہ خاں کے زمانے میں بالکل ختم ہو گیا۔

امیر عبدالرحمان کے زمانے میں انگریزوں اور روسیوں نے تجارت وصنعت و حرفت کی ترقی، تعلیمی اداروں کے قیام اور دیگر حیلوں کے ذریعے افغانستان میں پاؤں جمانے کی بہت سبیلیں کیں مگر شاہ افغانستان نے انہیں اس امر کی اجازت نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افغانستان جدید ترقی و تہذیب کے طریقوں سے بے بہرہ رہا یہ ضرور ہوا کہ اس کی خودمختاری اور آزادی پر پرامن مداخلت کے بہانے چھاپے مارنے کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔

امیر حبیب اللہ خاں

افغانستان میں "پرامن مداخلت" کی گنجائش اس وقت نکلی کہ جب ۱۹۰۱ء میں امیر عبدالرحمان کی وفات پر اس کا بیٹا حبیب اللہ خاں تخت نشین ہوا۔ انگریز بڑی آسانی سے اسے اپنے حلقہ اثر میں لے آئے۔ اب تہذیب و ترقی کے نام پر برطانوی گماشتے افغانستان میں داخل ہونے لگے۔ افغانوں میں بے چینی پیدا ہونا لازمی تھی۔ چنانچہ عوام نے اس پر احتجاج کیا ۱۸۸۰ء کے صلح نامے پر نظرثانی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ آخر ۱۹۰۵ء میں نیا معاہدہ ہوا۔ جس نے عام بے چینی کو دور کر دیا، مگر افغانستان کا دامن برطانیہ کے ساتھ جوں کا توں بندھا رہا۔

افغانستان کو روس کی طرف سے ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا مگر ۱۹۱۷ء میں جب روس میں بالشویک حکومت بنی تو یہ خطرہ عارضی طور پر جاتا رہا۔ دوسری طرف جنگ عظیم کے زمانے میں افغانستان پر انگریزوں نے اپنی گرفت بہت مضبوط رکھی جس کے باعث عوام شاہ افغانستان سے ناراض تھے اور اسی بنا پر ۱۹۱۹ء میں بادشاہ کو قتل کر دیا گیا۔

امیر امان اللہ خاں

امیر امان اللہ خاں کو تخت پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ اس نے افغانستان پر سے انگریزی اثر و رسوخ کو مکمل طور پر ختم کر دینے کا تہیہ اور اعلان کر دیا۔ ہندوستان پر حملہ اس اعلان کی ایک صورت تھی۔

سلطنت برطانیہ پر افغانوں کا یہ حملہ بظاہر امان اللہ خاں کی حب الوطنی، عوام دوستی اور بہادری کا مظاہرہ تھا، مگر حقیقت میں یہ محض عوام کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا نیز اس حملے کا مقصد یہ بھی تھا کہ افغانستان کے خارجی معاملات پر برطانیہ کی جو نگرانی قائم کی گئی ہے اسے منسوخ کر دیا جائے۔ چنانچہ چند ماہ کی لڑائی کے بعد ۱۹۲۱ء میں نیا معاہدہ ہوا جس نے افغانستان پر برطانیہ کے تمام اثرات کو زائل کر دیا۔ علاوہ ازیں سرحدی مسائل بھی حل ہو گئے۔

۱۹۲۶ء میں امیر امان اللہ خاں نے "بادشاہ" کا لقب اختیار کیا اور تمام طاقتوں نے اسے شاہ برطانیہ کے ہم پلہ ہونا تسلیم کیا۔

انقلاب

امان اللہ خاں کے عہد میں ایران اور ترکی کی جدید ترقی کے بہت چرچے تھے۔ رضا شاہ اور مصطفیٰ کمال نئی سیاست پر عمل پیرا تھے۔ امان اللہ خاں نے بھی ان کے نقش قدم پر چل کر افغانستان کو جدید ترقیات کے میدان میں لانا چاہا۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں افغانستان کی تاریخ میں پہلا دستور اساسی تیار ہوا۔ جس کے تحت بادشاہ کو آئین و قوانین کا پابند بنا دیا گیا اور عوام کو حکومت کے کاروبار میں دخل کا موقع دیا گیا۔

ساتھ ہی معاشرتی اصلاح کا کام شروع ہوا۔ افغانوں کو پرانے طرز معاشرت سے نکال کر جدید تہذیب و ترقی کے میدان میں لانے کی کوشش کی گئی۔ بود و ماند کے انگریزی طریقوں کو ملک میں رواج دیا جانے لگا۔ افغان اس تبدیلی کے لیے تیار نہ تھے۔ نیز بعض مذہبی حلقوں نے اس تبدیلی کو غیر مذہبی قرار دیتے ہوئے مذہبی تعصب کو ہوا دی۔ امان اللہ خاں کے خلاف عام بغاوت کے جذبات پیدا ہو گئے چنانچہ ۱۹۲۹ء میں اس کے خلاف زبردست بغاوت ہو گئی۔ جس کی تاب نہ لا کر اسے افغانستان چھوڑنا پڑا۔ بچہ سقاؤ نے جو ایک معمولی فرد تھا، کابل پر قبضہ کر لیا اور چھ ماہ تک افغانستان ابتری اور بدحالی کا شکار رہا۔ اس اثنا میں بچہ سقاؤ نے ملک میں خوب لوٹ کھسوٹ مچائی۔

اس وقت جنرل نادر خاں یورپ میں مقیم تھا۔ ملک میں افراتفری کا حال سنتے ہی وہ فوراً افغانستان پہنچا۔ قبائلی افواج کی مدد سے اس نے تخت افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ بچہ سقاؤ قتل کیا گیا۔ قوم نے نادر خاں کو بادشاہ منتخب کر لیا۔ اور نادر شاہ کا خطاب دیا۔ نادر شاہ کے تعلقات انگریزوں اور روس دونوں کے ساتھ اچھے رہے ۱۹۳۳ء میں کسی نے اسے قتل کر دیا۔ تب اس کا بیٹا ظاہر شاہ، افغانستان کا بادشاہ بنا۔ اس عہد میں ملک نے صنعتی، زرعی، اقتصادی، تعلیمی اور تجارتی ترقیوں میں وہ درجہ حاصل کر لیا جو پہلے اسے کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۵۳ء کو مارشل شاہ محمود خاں غازی کی جگہ جنرل محمد داؤد خاں کو وزیر اعظم بنایا گیا اور انہوں نے وزارت بنائی ۲۹ مارچ ۱۹۵۵ء کو وزیر اعظم افغانستان نے حکومت پاکستان سے احتجاج کیا کہ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کو پاکستان کے مجوزہ صوبے میں کیوں شامل کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کابل میں حکومت پاکستان کے خلاف مظاہرے کیے گئے پاکستانی سفارتخانے پر یورش ہوئی۔ پاکستانی پرچم کی بے حرمتی کی گئی، مصر، دولت سعودیہ عربیہ، جمہوریہ ترکیہ اور بعض دوسرے اسلامی ملکوں نے افغانستان اور پاکستان کے درمیان مصالحت کی کوششیں کیں۔

افغانستان نے روس کے ساتھ پانچ سال کے لیے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے دونوں ملکوں نے مال لانے لے جانے کے لیے ایک دوسرے کو آزادانہ حق گذر دے دیا۔

سردار محمد نعیم خاں وزیر خارجہ اور پاکستانی سفیر کے درمیان دونوں ملکوں کے باہمی جھگڑے کے متعلق تصفیہ ہو گیا۔ اس وقت سے دوستانہ تعلقات استوار چلے آتے ہیں۔ اگرچہ بعض معاملات کا تصفیہ ابھی تک اطمینان بخش طریق پر نہیں ہو سکا۔

باب ۱۶ ایران

تعارف

ایران کا رقبہ متحدہ ہندوستان کا ایک تہائی اور آبادی اندازاً دو کروڑ ہے۔ رقبے کے لحاظ سے آبادی کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ ایران

کا ایک بہت بڑا علاقہ ریگستان ہے۔ افیم کی پیداوار بکثرت ہے۔ ایران کے قالین دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔

ایران کی سب سے بڑی اہمیت تیل کے چشموں کی بنا پر ہے۔ مگر ایران اس قابل نہیں کہ خود مشینری کے ذریعے ان چشموں سے تیل نکالنے کا بندوبست کر سکے چنانچہ یہ کام اسے غیر ملکی کمپنیوں سے لینا پڑا۔ اور یہی امر بعد ازاں سیاسی پیچیدگیوں اور پریشانیوں کا موجب بنا۔

ملکی ابتری

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ایرانی سلطنت ابتری کا شکار ہو رہی تھی۔ بادشاہ عیاشیوں میں پڑا ہوا تھا، سلطنت کی آمدنی زیادہ تر بادشاہ کی عیاشیوں اور لغویتوں کی نذر ہو رہی تھی۔ یورپی سوداگروں اور سرمایہ داروں نے ملک کی ابتری اور بادشاہ کی مالی ضرورتوں سے فائدہ اٹھا کر ملک میں جال پھیلانے شروع کر دیے تھے ۱۸۹۰ء میں جب ایران کے تمباکو کی کاشت، فروخت اور برآمد کا ٹھیکہ ایک انگریز کمپنی کو دیا گیا تو ملک کے باشعور سیاسی حلقوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔

بادشاہ کی اس ناعاقبت اندیشی کے خلاف ایک طرف ایرانی سفیر متعینہ لندن نے احتجاج کیا اور "قانون" کے نام سے ایک اخبار نکال کر اس میں ایران کی معاشی بدنظمی اور بدحالی کا ماتم کیا تو دوسری طرف سید جمال الدین افغانی ایران پہنچے جنھوں نے ایران کے نظم و نسق، بادشاہ کے ناعاقبت اندیشانہ رویہ اور ایران میں برطانوی اقتدار کی مذمت کی۔ شاہ ایران نے انہیں جلاوطن کر دیا مگر وہ ایران کی اصلاح کا عزم کر چکے تھے۔ لہٰذا سیدھے لندن پہنچے اور وہاں معزول شدہ ایرانی سفیر کے ساتھ مل کر ایران کے لیے کام کرنے لگے۔ ان ہر دو افراد نے مضامین لکھ کر، ایرانی عوام کی ملتے کو بیدار کرنا شروع کر دیا۔

بغاوتیں اور سیاسی ردوبدل

ملک کے سیاسی حلقوں نے جمال الدین افغانی اور ایران کے معزول شدہ سفیر کی دعوت پر لبیک کہا اور ملکی نظام حکومت کے خلاف ناراضگی کی عام لہر نے سازشوں اور بغاوتوں کا طوفان کھڑا کر دیا۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لیے بادشاہ نے تمباکو کا ٹھیکہ غیر ملکیوں سے واپس لے لیا مگر یہ ایک مشق شورش کو دبانے اور ملک کی حالت بہتر بنانے میں مفید ثابت نہ ہوئی۔ دوسرے ایرانی اداروں پر برابر برطانوی اور روسی تسلط برقرار رہا آخر ۱۸۹۶ء میں بادشاہ کو قتل کر دیا گیا۔ مگر اس سے نظامِ حکومت میں کوئی فرق نہ آیا۔ نیا بادشاہ اپنے پیش رو جیسا نکلا اسے بعض غیر ملکی حکومتوں سے قرض لے کر رنگ رلیاں منانے کی عادت تھی، چنانچہ روس سے ۱۹۰۰ء اور پھر ۱۹۰۲ء میں قرضہ لیا گیا۔ نتیجہ میں ملکی ادارے روس کی ضمانت میں چلے گئے اور روپیہ یورپی ہوٹلوں کی نذر ہو گیا۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا ۱۹۰۵ء میں بغاوت کی چنگاری شدت سے بھڑکی۔ بادشاہ سے دستوری و آئینی حکومت کا مطالبہ کیا گیا، چنانچہ مجبور ہو کر ۱۹۰۶ء میں عوام کی نمائندہ مجلس طلب کی گئی۔ جس میں ایک دستور مرتب کیا گیا، اس کی رو سے بادشاہ کے اختیارات کو آئین و دستور کا پابند بنانے کی کوشش کی گئی۔

ایران کے بادشاہ اور اجنبی طاقتوں کو یہ دستور کیسے موافق آ سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پھر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں چنانچہ ۱۹۰۷ء میں روس اور برطانیہ نے باہم معاہدہ کر کے تین حلقوں میں بانٹ لیا۔ ایک شمالی حلقہ جو روس کے لیے مخصوص ہوا۔ دوسرا جنوبی حلقہ جو انگریزوں نے سنبھال لیا۔ تیسرا حلقہ بیچ میں غیر جانبدار رکھا گیا کہ روس اور برطانیہ کے درمیان حلقہ حائل (بفر) کا کام دے۔

عوام نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، بادشاہ نے عوام کو تشدد سے دبانے کی کوشش کی اور کئی سال تک شاہ اور عوام کے درمیان کشمکش جاری رہی جس میں بہت سے محبانِ وطن کو جانیں دینی پڑیں۔ آخر محمد علی شاہ کو ایران کا ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ عنانِ حکومت اس کے بیٹے احمد شاہ کے ہاتھ میں آئی۔ جس نے آئینی حکومت کو بحال کر دیا اور اپنے باپ کی زیادتیوں کی تلافی کر کے، امن کی فضا قائم کر دی۔

روس، جرمنی اور ایران

جب جرمنی نے بغداد ریلوے سکیم کے تحت برلن سے خلیج فارس تک رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی تو روس کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں جرمنی، ایران کو اپنے حلقۂ اثر میں نہ لے آئے، چنانچہ اس نے اس اسکیم کی مخالفت کی نتیجے میں دونوں کے درمیان معاہدہ ہوا جس کی رو سے جرمنی نے شمالی ایران کو "روسی حلقۂ اثر" تسلیم کر لیا اور یقین دلایا کہ ایران میں ریلوں کا کام روسی سرمائے سے شروع کیا جائے تو جرمنی کو اعتراض نہ ہو گا۔

پھر روس کی سازباز برطانیہ سے چلی اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہیں، ان سب میں ایران کے تیل کا بھی خاصا دخل رہا۔ آخر پہلی جنگ عظیم چھڑنے پر روس اور برطانیہ دونوں کو جرمنی سے ٹکر لینی پڑی۔

۱۹۱۷ء میں جب زارِ روس کو شکست ہوئی اور بالشویک حکومت برسرِ اقتدار آئی تو ایران سے روسی تسلط ہٹا لیا گیا۔ برطانیہ نے اس سے فائدہ اٹھا کر ایران کے خاص مقامات پر فوجی چھاؤنیاں قائم کر لیں۔ پھر ایک معاہدہ کے ذریعے پورے ایران کو اپنے فوجی اقتدار میں لے لیا۔

ردعمل کے طور پر روس نے ایران کے شمالی صوبوں میں اشتراکی جمہوریتیں قائم کرنی شروع کر دیں۔ اشتراکی جمہوریت کی بنیاد سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں گیلان کے صوبے میں رکھی گئی پھر دوسرے صوبوں کو لپیٹ میں لیا جانے لگا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شمال میں اشتراکیت چھا رہی تھی اور جنوب میں برطانوی اقتدار پاؤں پھیلا رہا تھا۔ ایرانی آزادی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ شاہ ایران اپنے محل میں بے فکر پڑا تھا۔ اسے محض اپنے عیش و آرام سے غرض تھی۔ ان حالات میں ایران کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ ایک غیر معروف فوجی افسر نے ایران کے آرام طلب بادشاہ کو معزول کر کے خود شاہی اختیارات سنبھال لیے۔

رضا شاہ پہلوی

روسی اور انگریزی سازشوں کے طفیل ایران اندرونی بدحالی کا شکار تھا۔ عوام بادشاہ سے بددل ہو چکے تھے۔ فوج میں بھی حکومت کے خلاف بے اعتمادی اور بددلی کے آثار نمایاں تھے اس موقع پر ۱۹۲۱ء میں ایک غیر معروف فوجی افسر رضا خاں نے تھوڑی سی فوج لے کر طہران پر قبضہ کر لیا۔ یہ ساری تحریک سید ضیاء الدین طباطبائی نے چلائی تھی۔ چنانچہ سید موصوف ہی نے نئی وزارت بنائی جس میں رضا خاں کو وزیر جنگ کا عہدہ ملا۔ بعد ازاں وزیر اعظم کا عہدہ بھی رضا خاں ہی نے سنبھال لیا۔ رضا خاں نے بدامنی ختم کی اور روس سے مصالحت ہو گئی ۱۹۲۱ء میں برطانیہ کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو منسوخ کر دیا گیا۔ ایران کے شہروں سے برطانوی فوجوں کو نکالا اور ایران پھر ایرانیوں کے ہاتھ میں آ گیا۔

ان کارناموں کے طفیل رضا خاں نے عوام میں مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کی طاقت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ بعد ازاں شاہ ایران کو معزول کر دیا گیا دسمبر ۱۹۲۵ء میں رضا خاں کو شاہی اختیارات سونپ دیے گئے اور اس نے پہلوی خاندان کی بنیاد رکھ دی۔ جس کا پہلا بادشاہ وہ خود تھا۔

تیل کے چشمے

ایران میں تیل کے چشمے جنوبی ساحل کے قریب واقع ہیں۔ ایران چونکہ خود ان چشموں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی اہلیت نہ رکھتا

تھا۔ نیز خیال کیا جاتا تھا کہ ایران میں ان چشموں کے علاوہ بعض دوسرے مقامات پر بھی تیل کے چشمے موجود ہیں، جنہیں دریافت کیا جا سکتا ہے اور یہ کام ایرانی ماہرین کے بس کا نہ تھا۔ لہٰذا اس کے لیے برطانوی انجینئروں کی مدد ضروری سمجھی گئی۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں ایران نے برطانیہ سے معاہدہ کیا جس کے تحت طے پایا کہ تبریز سے خراسان تک کے جنوبی علاقے میں جتنے چشمے دریافت ہوں ان پر برطانوی سرمایہ داروں کا قبضہ تسلیم کیا جائے گا۔

رضا شاہ نے برسر اقتدار آنے کے بعد اس معاہدے کی قباحتوں کو محسوس کیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۲ء میں اس نے یہ رعائتیں منسوخ کر دیں۔ برطانوی سرمایہ داروں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور انگریزی حکومت بہت سیخ پا ہوئی۔ چنانچہ نیا معاہدہ مرتب ہوا۔ جس میں سابقہ علاقے کو کم کر کے نصف کر دیا گیا۔ ایرانی چشموں میں ایران اور برطانیہ دونوں کا سرمایہ لگا رہا۔ ہر سال کروڑوں من تیل ان چشموں سے نکالا جاتا ہے سنہ ۱۹۳۸ء میں ۲۸ کروڑ من تیل نکالا گیا۔ مگر اس کی آمدنی کا تیسرا حصہ ایران کو ملتا ہے۔ زیادہ منافع برطانیہ کا ہوتا ہے۔

ریلوے

ایران میں صرف ایک ریلوے لائن ہے جو شمال میں بحر اسود کے کنارے سے جنوب میں خلیج فارس تک جاتی ہے۔ پاکستان کی جانب سے ایک ریل ایران کی سرحد میں صرف چند میل دور جا کر دزداب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عراق سے آنے والی ریلیں تبریز اور قصر شیریں کے سرحدی علاقوں تک آ کر رک جاتی ہیں۔ بحر اسود سے خلیج فارس تک جانے والی ریل روس کے پیہم اصرار پر بنائی گئی۔ اس لیے کہ اسے بحر ہند تک اپنا سامان لے جانے کے لیے اس کی اشد ضرورت تھی۔

عام اصلاحات

اب تک ایران دوسرے ملکوں سے کٹا ہوا تھا۔ چنانچہ شاہ ایران نے ضرورت محسوس کی کہ افغانستان، مصر، ترکی وغیرہ سے رابطے قائم کئے جائیں۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں ایران کے قصر سعد آباد میں ترکی، ایران اور افغانستان کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے طے پایا کہ وہ باہم دوست رہیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں گے یہ معاہدہ میثاق بغداد کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے نے آس پاس کے اسلامی ملکوں کو ایران سے بہت قریب کر دیا اور باہمی دوستی کی فضا پیدا ہو گئی۔

رضا شاہ نے تہران میں ایک یونیورسٹی قائم کی اور مدارس کو بھی منظم کرنے کی کوششیں کیں سنہ ۱۹۲۱ء میں ایران میں صرف چھ سو بارہ مدارس تھے مگر سولہ سال بعد سنہ ۱۹۴۰ء میں یہ تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اکیس سال سے زیادہ عمر والے افراد کے لیے فوجی تربیت لازمی قرار دی گئی۔ جس سے ملک کی فوجی طاقت میں اضافہ ہونے لگا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد

ایران کے ساتھ روس اور برطانیہ دونوں کے مفاد وابستہ ہیں۔ اس لیے دونوں نے ہمیشہ اس پر نظریں جمائے رکھیں۔ قسطنطنیہ اور درہ دانیال پر روس اور ترکی کے مابین جنگوں کے پس پشت روس کی یہی ذہنیت کار فرما تھی۔ برطانیہ مشرقی ملکوں کی تجارت پر نگرانی رکھنے کی غرض سے ایران پر اپنا پہرہ بٹھانا چاہتا تھا، چنانچہ دونوں ملک ہر وقت ایران پر قبضہ جمانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ آخر سنہ ۱۹۴۱ء میں روسی اور برطانوی فوجیں ایران میں داخل ہو گئیں۔ رضا شاہ نے تاج و تخت چھوڑ دیا اور اس کا بیٹا محمود رضا بادشاہ بنا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اجنبی فوجیں ملک سے نکلیں، لیکن حالات کافی حد تک پریشان کن رہے۔ خصوصاً ڈاکٹر مصدق کی وزارت میں تیل کے متعلق جھگڑے نے خاصی نازک صورت اختیار کر لی۔ اس جھگڑے کو بھی مناسب طریق پر طے کر لیا گیا اور ایران میثاق بغداد میں شامل ہو گیا جس میں ترکی، پاکستان اور عراق بھی شامل تھے۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ ملک کے دفاع کو تقویت پہنچے۔

۱۶-۱۹ اپریل سنہ ۱۹۵۶ء کو میثاق بغداد کی کونسل کا دوسرا اجلاس تہران میں وزیر اعظم ایران کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ عراق، پاکستان اور برطانیہ کے نمائندوں کے علاوہ امریکہ سے بھی ایک وفد ناظر کے طور پر آیا ہوا تھا۔ اس وفد نے بتایا کہ جمہوریہ امریکہ مختلف ذرائع سے میثاق بغداد کے ساتھ تعاون کرے گی۔ مثلاً اقتصادی اور تخریبی سرگرمیوں کو روکنے والی کمیٹی میں امریکہ شریک رہے گا۔ اور مستقل سیکرٹریٹ کے مصارف کے لیے بھی رقم دے گا۔ میثاق میں جو ملک شریک ہیں انہیں مالی امداد دی جائے گی۔ فوجی امداد کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔

جولائی سنہ ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد عراق میثاق بغداد سے الگ ہو گیا۔ ترکی، ایران اور پاکستان بدستور اس میں شامل رہے۔

باب ۱۷ — انڈونیشیا

عام حالات

جنوبی مشرقی ایشیا میں بحر الکاہل کے جزیرے جن میں جاوا اور سماٹرا خاص اہمیت رکھتے ہیں، انڈونیشیا کے نام سے پکارے جاتے ہیں تیرھویں صدی عیسوی میں جب عرب تاجروں کی یہاں آمد و رفت شروع ہوئی تو اسلام کا پیغام یہاں کے باشندوں تک پہنچا اور مسلمان باشندوں کے طفیل یہاں کے تقریباً تمام باشندے اسلام لے آئے۔

جب یورپ میں صنعتی انقلاب اٹھا اور یورپی تاجروں نے دنیا میں نئی منڈیاں تلاش کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تو سنہ ۱۶۰۲ء میں ولندیزی تاجر انڈونیشیا پہنچے۔ انہوں نے آٹھ سال کے اندر اندر باشندوں کو مطیع کر کے ان پر ولندیزی گورنر مقرر کر دیا۔ ایک عرصے تک مقامی باشندوں کو لوٹتے رہے۔ انڈونیشیا میں پیدا ہونے والی تمام اشیاء پر اپنا اجارہ قائم رکھا۔ پھر جب باشندوں نے ولندیزی ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائی تو انہیں سختی سے دبایا جانے لگا۔ اس تشدد کی داستان بہت طویل ہے۔ اس لیے اسے بیان کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔

جاوا اور سماٹرا کا مجموعی رقبہ فرانس، پرتگال، اسپین، ڈنمارک، بیلجیم، سوئٹزرلینڈ اور ہالینڈ کے مجموعی رقبہ کے برابر ہے۔ جاوا دنیا میں سب سے گنجان علاقہ ہے۔ سماٹرا جاوا سے تگنا بڑا ہے، مگر آبادی جاوا کا پانچواں حصہ ہے۔

سیاسی حالات

ہالینڈ نے ان جزائر کو صوبوں میں تقسیم کر کے ان پر ولندیزی گورنر کو نگران مقرر کیا۔ حکومت مقامی باشندوں کے ذریعے کی جاتی۔ سنہ ۱۹۱۲ء کے لگ بھگ سے یہاں سیاسی خود اختیاری کی تحریکیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ چونکہ ولندیزیوں نے چند افراد کے سوا باقی تمام باشندوں کو معاشی لحاظ سے پامال کر دیا تھا۔ اعلیٰ اور متوسط طبقہ بالکل فنا ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ تحریکیں پر دلنا ری قسم کی تھیں یعنی مطالبہ یہ تھا کہ محنت کشوں اور مزدوروں کو معقول آمدنی کے ذرائع مہیا کیے جائیں۔

ولندیزی حکومت نے اس مطالبے کی بڑھتی ہوئی قوت کے پیش نظر منتخبہ ممبروں کی ایک کونسل قائم کر دی، لیکن ممبروں کی تعداد بہت قلیل رکھی گئی ہے جسے عوام نے قبول نہ کیا، در بدامنی اور ایجی ٹیشن برابر جاری رہا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں کچھ ترمیم کے ساتھ دوسرا آئین بنایا گیا مگر یہ بھی لوگوں کو مطمئن نہ کر سکا۔ اس دفعہ کارخانوں میں ہڑتالیں بھی جاری ہو گئیں۔ فسادات ہونے لگے۔ حکومت نے مظاہرین پر سختیاں شروع کر دیں۔ پکڑ دھکڑ جاری ہو گئی۔ مار پیٹ

اور قتل و غارت کی وارداتیں ہونے لگیں، مگر اس سے لوگوں کے جوش و خروش میں اور اضافہ ہو گیا۔ حکومت اور سابھ کاروں کی لوٹ کھسوٹ سے بچنے کے لیے عوام نے ایک قومی بینک قائم کیا۔ قومی تعلیم گاہیں بنائی جانے لگیں۔ جن میں قومی تعلیم جاری کی گئی۔

ولندیزیوں نے انڈونیشیا کو آزادی و خود مختاری دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں کے باشندے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے اتنے نااہل اور اتنے ناکارہ ہیں کہ داخلی معاملات بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہونے چاہئیں، چہ جائے کہ انہیں مکمل آزادی دے دی جائے۔ مسلسل تین سو سال تک ولندیزی ان جزائر پر قبضہ جمائے رہے۔ آخر سنہ ۱۹۴۲ء میں جاپان نے حملہ کر کے ولندیزیوں کو ان جزائر سے نکال باہر کیا۔ جنگ کے خاتمے پر ولندیزیوں نے انڈونیشیا پر دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے بہتیرے جتن کیے مگر وہ بے نتیجہ رہے۔ کبھی انہوں نے یہ الزام لگایا کہ یہاں جاپانیوں نے اڈے جما رکھے ہیں، کبھی امریکہ اور برطانیہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے کمیونزم کا شوشہ چھوڑا، مگر ان کی یہ چالیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ آخر سنہ ۱۹۴۹ء میں انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا مگر ایک وحدت کے بجائے اسے کئی ریاستوں میں تقسیم کر کے کئی وحدتیں بنا دی گئیں۔ انڈونیشیا نے یہ تجویز ابتدا ہی میں مان لی تھی، لیکن جب اختیارات منتقل ہو چکے تو اس تقسیم کی سخت مخالفت ہوئی۔ چنانچہ اگست سنہ ۱۹۵۰ء میں انڈونیشیا کے ایوان نمائندگان نے اٹھارہ کے مقابلے میں نوے ووٹوں کی اکثریت سے سولہ ریاستوں کو ایک وحدانی ریاست میں تبدیل کر دیا۔

اعلان آزادی کے باوجود انڈونیشیا کی مشکلات ختم نہ ہوئیں کیونکہ ہالینڈ کے بچے کھچے اقتدار سے نجات حاصل کرنا ابھی باقی تھا۔ دوسری طرف اندرونی سیاست کو مناسب شکل میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔ حکمران پارٹی کے علاوہ کئی اور جماعتیں بھی میدان عمل میں تھیں۔ زیادہ مضبوط اور مقبول جماعت وہ تھی جو اسلامی اصولِ حیات کو نافذ کرنا چاہتی تھی۔

سنہ ۱۹۵۳ء میں دارالاسلام کی تحریک کے زیر اہتمام رنجہ میں مسلح بغاوت پھوٹ پڑی اس بغاوت کا مقصد ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنا تھا۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں کابینہ میں رد و بدل ہوا۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں انڈونیشیا نے چین کے ساتھ معاہدہ کیا۔ پھر سنہ ۱۹۵۶ء میں ہندوستان کے ساتھ معاہدہ ہوا۔ وہاں کے حالات اب تک کامل اطمینان کی شکل اختیار نہیں کر سکے۔

باب ۱۸

ترکی

سلطنت عثمانیہ کا زوال

پندرھویں صدی کے آخر میں سترھویں صدی کے اوائل تک ترکی سلطنت انتہائی عروج پر تھی۔ مصر فتح کرنے کے بعد سلیمان اعظم کے زمانے (سنہ ۱۵۲۰ء تا سنہ ۱۵۶۶ء) میں ترکوں کا فاتحانہ سیلاب ریاست ہائے بلقان سے گذر کر آسٹریا کے پائے تخت ویانا تک جا پہنچا اور جرمنی کی سرحدوں کو عبور کر گیا۔ سلیم اول کے زمانے تک جتنے ترک بادشاہ گذرے انہوں نے سلطنت عثمانیہ کا نظم و نسق برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی وہ جری، بہادر، اولو العزم اور بردلعزیز بھی تھے۔ انہوں نے سلطنت عثمانیہ کی حدود کو وسیع کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا۔ چنانچہ سلطان محمد ثانی نے بزنطینی سلطنت کے پرخچے اڑا کر قسطنطنیہ پر ترکی جھنڈا لہرایا مگر سلیمان اعظم کے زمانے میں ترکی بادشاہت کی تمام سابقہ خصوصیات ختم ہو چکی تھیں۔ اب نہ وہ پہلا سا نظم و نسق برقرار رہا تھا، نہ شجاعت اور بہادری ہی باقی رہی تھی۔ بادشاہوں کی زندگی خواجہ سراؤں اور دوسرے غیر ذمہ دار جلسوں کی صحبت میں گزرنے لگی تھی۔ سلطنت کا بار اٹھانے اور صحیح طریقے نظم و نسق چلانے کی اہلیت ان میں باقی نہ رہی تھی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں جب محمود ثانی تخت نشین ہوا تو سلطنت عثمانیہ کی حالت اور بگڑ چکی تھی۔ نظم و نسق خراب ہو چکا تھا۔ رعایا بددل تھی۔ افسر سرکشی پر اتر آئے تھے۔ انقلاب فرانس کے اثرات سلطنتِ عثمانیہ تک پہنچ چکے تھے۔ عوام نے انہیں قبول کیا اور مطلق العنان حکومت کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔ قومیت کے نام پر صوبے میں بغاوت پھیلنے لگی۔ سب سے پہلے سنہ [illegible]ء میں سربیا نے ترکی کے خلاف بغاوت کر کے اس سے علیحدگی اختیار کی، پھر رومانیہ، یونان اور بلغاریہ نے اس کی تقلید کی۔ مصر میں بھی قومی آزادی کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ جب اس جذبے نے شدت اختیار کی تو مصر سے نکل کر یہ آگ عرب میں بھی پھیلنے لگی۔

سنہ ۱۸۷۶ء میں جب سلطان عبدالحمید سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا تھا، تو اس نے حالات کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے کچھ اصلاحات نافذ کرنا چاہیں، مگر فوراً ہی روس سے جنگ چھڑ گئی تو اس نے مطلق العنانی کو بحال رکھتے ہوئے سارے اختیارات براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھے۔ ایک طرف یورپ کی طاقتیں سلطنتِ عثمانیہ کے یورپی صوبوں کے عیسائی باشندوں کو ترکوں کے خلاف اکسا رہی تھیں تو دوسری طرف روس عیسائی رعایا کی حمایت کے بہانے ترکی صوبوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ ترکی اقتصاد و معاش کے تمام ذرائع پر یورپی سرمایہ دار چھائے ہوئے تھے۔ عرب میں وہابیت اور سوڈان میں مہدیت کے نام سے جو تحریکیں اٹھی تھیں وہ بھی دراصل ترکوں کے اقتدار کے خلاف تھیں پھر انیسویں صدی کے آخر سے جنگ عظیم تک ترکی کو کئی خوفناک جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس نے سلطنت کو زبردست نقصان پہنچایا۔ سنہ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان و طرابلس نے تو ترکی سلطنت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔

ادھر عالمگیر اتحاد اسلامی کے قائد جمال الدین افغانی نے جو مطلق العنان شہنشاہیت کے مخالف اور جمہوریت کا حامی تھے، خلافت عثمانیہ کے خلاف آواز اٹھائی، جس کے نتیجے میں سلطان نے انہیں قسطنطنیہ سے خارج کر دیا۔ مگر ترکی میں کئی جمال الدین افغانی پیدا ہو چکے تھے، جو ایک پل کے لیے بھی مطلق العنان بادشاہت قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ غرض ہر جگہ قومیت اور وطنیت کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ سلطان عبدالحمید نے ہرچند اپنی خلافت کی عظمت و تقدیس کا رعب بٹھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ایک طرف عرب ترکوں کو ننگِ اسلام سمجھتے تھے تو دوسری طرف ترکوں میں یہ جذبہ شدت سے ابھر چکا تھا کہ وہ عربوں سے علیحدہ ہو کر اپنی قومی ترقی کو بحال کریں۔

مدحت پاشا

ترکی قومیت و حب الوطنی کا بانی مدحت پاشا تھا۔ جس نے اپنی جماعت منظم کر کے پہلے سلطان عبدالعزیز کو معزول کر دیا، پھر سلطان عبدالحمید کو تخت پر بٹھا کر اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ سلطان نے مدحت پاشا کو وزیر اعظم بنا لیا اور کچھ اصلاحات نافذ کر بھی دیں مگر بعد ازاں اس کی قوت کے ڈر سے اسے جلا وطن کر دیا اور اصلاحات منسوخ کر دیں۔ مدحت پاشا عوام میں بے حد مقبول تھا، چنانچہ عوامی اصرار کے سامنے سلطان کو سر جھکانا پڑا۔ مدحت پاشا کو واپس بلایا گیا۔ سلطان عبدالعزیز کے قتل کا الزام لگا کر پہلے اسے نظر بند کیا گیا پھر قتل کرا ڈالا۔

مدحت کے قتل نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ لوگ بہت مشتعل ہوئے۔ مجبوراً سنہ ۱۹۰۹ء میں سلطان کو تخت چھوڑنا پڑا۔ اب عنانِ حکومت سلطان محمد خامس کے ہاتھ آئی۔

انجمنیں

"انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے ترکوں کی ایک جماعت ترکی قومیت کے جذبات کی ترجمان تھی یہ جماعت روز بروز قوت پکڑتی جا رہی تھی ساتھ ہی وہ عالمگیر اسلامی برادری کی بھی قائل تھی۔ یورپی قوموں کو ترک عوام کے ان جذبات سے خطرہ لاحق ہوا۔ اس لیے کہ وہ مسلمانوں کے عالمگیر اتحاد کو اپنے حق میں نقصان دہ تصور کرتی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے یہ چال چلی کہ عربوں میں ترکوں کے اس قومی جذبے کے خلاف نفرت کے بیج بونے شروع کر دیئے اور ان میں بھی قومی آزادی کے جذبات بھڑک اٹھے۔ شام کی آزادی کے لیے دمشق میں خفیہ انجمنیں بننے لگیں۔ حجاز میں شریف اعظم اپنی سلطنت کے خواب دیکھنے لگا۔ نجد میں ابن سعود اپنا سکہ قائم کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔

قوم پرستی کا ردِ عمل

غرض سلطنت عثمانیہ کے خلاف چاروں طرف سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ان حالات میں جب پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو سلطان ترکی نے جرمنی سے مل کر برطانیہ فرانس اور روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ سلطان اور ترک عوام دونوں کا یہ خیال تھا کہ اس طرح سارے مسلمان عثمانی جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے اور ترکی کو جرمنی کا حلیف ہونے کے باعث اس کی مدد سے جدید اسلحہ بھی مل جائے گا مگر یہ امید غلط تھی۔ عراق میں عربوں نے انگریزی فوجوں کا خاطر خواہ مقابلہ نہ کیا۔ بلکہ ہتھیار ڈال دیئے۔ شام کے عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے برطانیہ کی حمایت کی۔ نجد میں ابن سعود نے غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر دیا۔ مکہ میں شریف حسین نے اتحادیوں کو یقین دلایا کہ اگر اسے بلادِ عرب واپس دے دیئے جائیں تو وہ عرب قبائل کو ترکوں کے خلاف آمادۂ جنگ کرے گا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں ترکی فوجوں نے بڑی بے جگری سے لڑ کر ایک سال تک جزیرہ نمائے گیلی پولی کی حفاظت کی۔ پھر جب مصطفیٰ کمال کی قیادت میں ترکوں نے برطانیہ کو اس محاذ پر شکست دی تو برطانیہ نے مجبور ہو کر شریف حسین سے ساز باز کی اور عراق و عرب کی راہ سے ترکوں پر حملہ کرنے کا پروگرام مرتب کر لیا۔

شریف حسین خود بھی ترکوں کے خلاف صف آرا تھا۔ عرب کے تمام قبائل اس کے ساتھ تھے اس وقت شریف حسین کا بیٹا فیصل اور مشہور کرنل لارنس عربوں کی رہنمائی کر رہے تھے لارنس نے عربوں کو ترکوں کے خلاف خوب بھڑکایا۔

غرض عربوں کی مدد سے انگریزی فوج ترکی کی سرحد تک پہنچ گئی۔ اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بالآخر نومبر ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور مدروس میں التوائے جنگ کے عارضی صلح نامے پر دستخط کر دیئے۔ جس کی رو سے ترک، مصر اور بلادِ عرب کی حکومت سے دستبردار ہو گئے۔

مصطفیٰ کمال

ان حالات میں مصطفیٰ کمال سلطان ترکی کی اجازت سے اناطولیہ آیا۔ جہاں پہنچ کر اس نے سلطان کے فرمانرواؤں کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ اس نے محسوس کیا کہ اب عثمانی خاندان ترکوں کی شیرازہ بندی نہیں کر سکے گا شیرازہ بندی کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ قومیت اور وطنیت کی بنا پر ترکوں کو متحد اور منظم کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ مصطفیٰ کمال کی حکمت عملی، تدبر اور سیاست نے ترکی کو انقلاب کے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔ اس نے ترکی کی بکھری ہوئی طاقت کو جمع کر کے جدید ترکی کی بنیاد ڈالی اور اسے دنیا کی دوسری طاقت ور قوموں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔

۱۹۰۵ء میں مصطفیٰ کمال ایک ادنیٰ فوجی افسر تھا، اس سال کے بعد ترکی نے جتنی جنگیں لڑیں ان سب میں اس نے شرکت کی۔ جبل الدروز اور بلغاریہ کی جنگوں میں حصہ لیا۔ اٹلی کے خلاف طرابلس کی لڑائی، برطانیہ کے خلاف گیلی پولی میں اور روس کے خلاف کاکیشیا میں اور ۱۹۱۹ء میں شام کے محاذ پر ان سب جنگوں میں شریک رہا، اور اپنے کارہائے نمایاں کے طفیل بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

جب مصطفیٰ کمال اناطولیہ پہنچا تو اس نے اتحادیوں کے خلاف ترکوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اس نے قومی مجلس کی طرف سے سینکڑوں ترک لیڈروں کو دعوت نامے جاری کیے تاکہ سب جمع ہو کر آئندہ کے لیے لائحہ عمل بنائیں۔ چنانچہ ایک بہت بڑا اجتماع ہوا سب نے متفقہ طور پر مصطفیٰ کمال کو اپنا صدر منتخب کیا۔ اس مجلس کی ایک کونسل بنائی گئی جسے ترکی کی آزادی کے حصول کے لیے ہر قسم کے عملی اختیارات دیے گئے۔ اس کونسل کا صدر بھی مصطفیٰ کمال ہی تھا۔

چند دنوں بعد اس کونسل نے ایک میثاق شائع کیا جس کی رو سے ترکوں نے اعلان کیا کہ ہم عرب قوم کی ہر سرزمین سے دستبردار ہوتے ہیں مگر جن علاقوں میں ترکوں کی اکثریت ہے اور جو مذہب، نسل اور نصب العین کے لحاظ سے ایک لڑی میں منسلک کیے جا سکتے ہیں، وہ سب ایک قوم اور ایک ہی ملک ہیں جنہیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

انہی دنوں معاہدہ سیورے شائع کیا گیا جس کی رو سے ترکی کا کچھ علاقہ اتحادیوں کے ایک کمیشن کے تحت کر دیا گیا۔ سمرنا کا علاقہ یونان کو دے دیا گیا۔ آرمینیا و عرب کا حق خود اختیاری کے ہوئے کیا گیا۔ چھوٹا میدان اور بحیرۂ روم کے ساحل کا کچھ علاقہ ترکی کے پاس رہا۔ یہ بھی طے ہوا کہ ترک پندرہ ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھیں گے۔

اس معاہدے کی شرائط نے ترکی کی آنکھیں کھول دیں، وہ ترکی کی آزادی کے لیے آخری جدوجہد کرنے پر اتر آئے اور سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

۱۹۲۰ء میں اتحادیوں کی امداد کے بھروسے پر یونان نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ مصطفیٰ کمال کی سرکردگی میں ترکوں نے دو سال تک جنگ جاری رکھی۔ بالآخر ۱۹۲۲ء میں یونانی فوجوں کو نہ صرف سمرنا سے، بلکہ تھریس سے باہر دھکیل دیا۔

۱۹۲۲ء میں لوزان میں برطانیہ اور ترکی کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہونا طے پایا۔ تاکہ ترکی کی حدود کا تعین کیا جا سکے۔ ترکی کی طرف سے عصمت پاشا جو مصطفیٰ کمال کے ہم خیال، ہمدرد اور دوست تھے۔ اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور برطانیہ کی طرف سے لارڈ کرزن نے نمائندگی کا حق ادا کیا۔ مگر یہ گفت و شنید ناکام رہی۔

لوزان میں دوبارہ کانفرنس ہوئی جس میں ترکی کے تمام مطالبات برطانیہ نے مان لیے۔ اور جولائی ۱۹۲۳ء میں عہدنامے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کی رو سے ترکی کی تجارت اور مالیات پر یورپی طاقتوں نے جو پہرے بٹھائے تھے وہ منسوخ ہو گئے۔ قسطنطنیہ اور اس کے اطراف سے اتحادی کمیشن واپس بلا لیا گیا۔ تھریس ترکی کو واپس مل گیا۔ ترکی افواج کی تعداد پر کوئی پابندی نہ رہی۔ ساتھ ہی ترکی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

جمہوریہ ترکی

اب سوال یہ تھا کہ ترکی میں کس قسم کی حکومت قائم کی جائے مجلس وطنی نے بھاری اکثریت سے خلافت کے منصب کو منسوخ قرار دے دیا سلطانی ختم کر دی اور ترکی میں جمہوریت کو نافذ کر دیا۔ مصطفیٰ کمال اور عصمت پاشا نے مل کر دستورِ اساسی کا مسودہ تیار کیا۔ قومی مجلس نے اسے منظور کر لیا اور مصطفیٰ کمال کو جمہوریہ ترکیہ کا پہلا صدر مقرر کر دیا۔

نئے دستور کے خلاف کردوں نے بغاوت کر دی اور ترک سپاہیوں کو بے دریغ قتل کیا جانے لگا۔ ترقی پسند پارٹی کے نام سے ایک جماعت دستورِ اساسی اور مصطفیٰ کمال کے سیاسی اقتدار کے خلاف تھی۔ اس پارٹی نے کردوں کی حمایت کی۔ مصطفیٰ کمال نے انتہائی سختی سے کردوں کی بغاوت کو کچل دیا۔ ترقی پسند پارٹی کے تمام لیڈروں کو قتل یا جلا وطن کر

دیا گیا اور حکومت کا نظم و نسق بحال ہوا۔

جدید اصلاحات

خلافت کے نام پر سلاطین عثمانیہ اور شیخ الاسلام نے ترکوں پر ترقی کی تمام راہیں مسدود کر رکھی تھیں اور انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر رکھا تھا۔ وہ آزادانہ سوچنے اور دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ چلنے سے معذور ہو چکے تھے۔ مذہب کے نام پر لوگوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا عثمانی بادشاہت کا خاصا بن چکا تھا۔ مصطفےٰ کمال نے ترکوں کو اس تعزّلت سے نکالنے کے لیے جو اصلاحات نافذ کیں اور جن خیالات کی ترویج کی۔ وہ ترکی کو میدانِ ترقی میں ایک نئی شاہراہ پر گامزن کرنے کا باعث بنے۔ ترکی ٹوپی کے بجائے ہیٹ کو رواج دیا گیا۔ عورتوں میں نقاب اور برقعے کے رواج کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں انگریزی حروف کو حکماً جاری کر کے بائیں طرف سے لکھنے والی تحریر کو ترکی میں نافذ کیا گیا۔ دو سال بعد اسے سارے ملک کا سرکاری و غیر سرکاری رسم الخط بنا دیا گیا۔

دینی تعلیم کے ادارے اور درویشوں کی خانقاہیں بند کر دی گئیں۔ شرعی عدالتیں ختم کر کے جدید مغربی قوانین کے مطابق نئے محکمہ ہائے عدالت بنائے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں انگورہ کے مقام پر نئے انشاپردازوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے ترکی زبان سے عربی و فارسی کے الفاظ نکال کر ان کی جگہ ترکی الفاظ رائج کرنے کا کام شروع کر دیا۔

معدنیات اور زراعت کے لحاظ سے بھی ترکی کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ ۱۸۸۱ء میں سلطنت عثمانیہ کے مالیے پر قرض خواہ ممالک کی ایک کمیٹی کو نگران بنا دیا گیا تھا۔ جمہوریت قائم ہو جانے کے بعد مصطفےٰ کمال نے اسے منسوخ کر دیا اور قرضے کی ادائیگی کے سلسلے میں طے ہوا کہ سالانہ بجٹ کا نصف قرض میں لگایا جائے۔ کارخانوں کے قیام اور جدید آلات کی مدد سے زراعت کا پروگرام بھی وضع کیا گیا۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۸ء تک مصطفےٰ کمال نے جس انداز سے ترکی پر حکومت کی اس کے پیش نظر اسے ترکی کا ڈکٹیٹر کہنا چاہیئے۔ اگرچہ بظاہر ترکیہ پارلیمنٹ اور جمہوری دستور اساسی ضرور تھا۔ تاہم ہر معاملے میں مصطفےٰ کمال جو چاہتا کرتا۔ پارلیمنٹ میں حزب مخالف قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ حکومت کی طرف سے پیش ہونے والی ہر تجویز کو ماننا ضروری تھا۔ اس تجویز پر اعتراضات تو ہو سکتے تھے اور ہوتے تھے مگر باقاعدہ مخالف پارٹی بنا کر اس تجویز کی مخالفت نہ کی جا سکتی تھی۔

مصطفےٰ کمال جانتا تھا کہ جمہوری اصولوں کے مطابق پارلیمنٹ میں حزب مخالف پر کوئی پابندی نہیں ہو سکتی مگر اسے یہ بھی احساس تھا کہ ابھی ترک قوم اتنی ترقی یافتہ نہیں کہ جمہوریت کے آداب کے مطابق اپوزیشن یہاں کامیاب ہو سکے۔ بالآخر ۱۹۳۰ء میں فتحی پاشا کی قیادت میں اپوزیشن بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن جلد ہی مصطفےٰ کمال کو محسوس ہو گیا کہ اس کا یہ اقدام اس کے اپنے حق میں مفید نہیں۔ کیونکہ اپوزیشن کے قیام کے ساتھ ہی ملک میں حکومت کے خلاف اودھم مچ گیا۔ جگہ جگہ مخالفتیں ہونے لگیں۔ حکومت پر جائز ناجائز نکتہ چینی ہونے لگی۔ مجبوراً مصطفےٰ کمال نے حزب اختلاف کو توڑ دیا اور اپنی مخالفت کو سختی سے دبا دیا۔

ہر چوتھے سال ترقی کے نئے صدر کا انتخاب "مجلس عوام" عمل میں لاتی تھی۔ اس مجلس کا صدر بھی مصطفےٰ کمال ہی تھا۔ چنانچہ ہر نئے انتخاب کے موقع پر وہی صدر بنایا گیا۔ گویا جمہوریت کے قیام سے اپنی وفات (۱۹۳۸ء) تک مصطفےٰ کمال ہی مجلس عوام اور جمہوریہ دونوں کا صدر رہا۔ اس کی وفات کے بعد صدارت کا عہدہ عصمت انونو کے سپرد کیا گیا۔

۱۹۳۹ء میں ترکی اور برطانیہ کے مابین معاہدہ ہوا کہ اگر ترکی پر حملہ ہوا یا بحیرہ روم کے علاقے میں لڑائی چھڑ جائے۔ تو دونوں فریق ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اسی سال فرانس کے ساتھ ترکوں کا معاہدہ ہو گیا کہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے۔ سوویٹ یونین نے ۱۹۲۵ء کا ترکی اور روسی معاہدہ جس میں فریقین نے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا اقرار کیا تھا۔ ختم کر دیا۔

حکومت نے حزب جمہوریہ کو، جس کا رئیس سابق وزیر اعظم جلال بایار تھا، تسلیم کر لیا۔ عام انتخابات ہوئے تو نئی پارٹی نے چھیاسٹھ نشستیں حاصل کیں۔ حزب عوام یا حکومت کی پارٹی کو تین سو سچانوے نشستیں ملیں۔ سراج اوغلو کی جگہ ریپ پیکر وزیر اعظم بنا۔ عصمت انونو دوبارہ صدر منتخب ہوا۔

ستمبر ۱۹۴۷ء کو حسن سقا نے نئی وزارت بنائی۔

پولیس کے اختیارات محدود کر دیئے گئے۔ شہری حقوق بحال کئے گئے۔ مذہبی تعلیم پھر سے سکولوں میں جاری ہو گئی جسے ۱۹۳۳ء میں طریق تعلیم کی اصلاح کے پیش نظر بند کیا گیا تھا۔

۲۴ مارچ ۱۹۵۰ء کو اٹلی کے ساتھ دوستی کا معاہدہ ہوا۔ ۱۴ مئی ۱۹۵۰ء کو عام انتخابات ہوئے اور عدنان مندریس وزیر اعظم بنے۔

نیا ترکی

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ترکی کو مٹا دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یورپ کی ترک دشمنی اور اتحادیوں کی بدعہدی نے ترکی کو شدید نقصان پہنچایا۔ سب سے زیادہ نقصان ترکی کو اس کے مطلق العنان بادشاہوں نے پہنچایا، جنہوں نے اپنے عیش و راحت اور اپنے مفاد کی خاطر غیر ملکی طاقتوں کو ترکی میں اپنے لیے جگہ پیدا کرنے اور غیر ملکی اقتدار پھیلانے کا موقع دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر جنگ عظیم برپا نہ ہوتی اور مصطفےٰ کمال جیسا مدبر، زیرک، محب وطن اور عظیم سیاستدان پیدا نہ ہوتا تو آج ترکی سلطنت کے پرخچے اڑ چکے ہوتے۔ مگر یہ مصطفےٰ کمال ہی کی شخصیت ہے جس نے ترکی کی گئی گذری سلطنت کو اغیار اور دشمنوں کے چنگل سے چھڑا کر ایک دفعہ ترکی کو ان بلندیوں سے ہمکنار کیا جہاں تک پہنچنے کی بظاہر کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ جنگ عظیم کے دوران ترکی کی وہ گت بنی اور اس کی قوت کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ وہ یورپ کا "مرد بیمار" کہلانے لگا۔ لیکن جب اس مرد بیمار نے سنبھالا لیا اور مصطفےٰ کمال نے اس کے بدن میں توانائی کی روح پھونکی تو ترکی کو یورپ کی ان ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا جو کبھی اس کا تمسخر اڑاتی تھیں۔ آج نیا ترکی یورپ کی ایک عظیم طاقت مانا جاتا ہے۔

باب ۱۹ نجد و حجاز

عام کیفیت

حجاز و نجد کا علاقہ جسے "اصلی عرب" کہنا چاہیئے، پہلی جنگ عظیم سے قبل ترکوں کے زیر اثر تھا۔ ترک سلطان "خلیفۃ المسلمین" کہلاتے تھے۔ مگر نظام حکومت کے لحاظ سے ان میں اور خلفائے راشدین کے طرز عمل میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ترکوں کی خلافت خالص مطلق العنان شہنشاہیت تھی۔ جس میں بظاہر اسلام کا نام لیا جاتا مگر حکومت کا جو طریقہ اسلام نے بتایا تھا اور جس پر اسلام کے اولین چار خلیفہ گامزن رہتے تھے ترکی خلافت میں اس کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں میں کئی فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ اسلام کے نام پر کئی فتنے اٹھ رہے تھے جو اسلامی تعلیمات کو مسخ کر رہے تھے۔ کتاب و سنت کے مقابلے میں مذہبی عالموں، پیروں اور مذہبی رہنماؤں کے اقوال کو ترجیح دی جا رہی تھی۔

تحریک وہابیت

ان حالات میں ایک مخلص، پرجوش، باہمت اور باعمل عالم دین، محمد بن عبدالوہاب نے کتاب و سنت کی ترویج اور مسلمانوں کے گمراہ کن عقائد اور اعمال کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے سلطان ترکی کی خلافت کی بھی مخالفت کی۔ عرب کے عوام میں ترکی خلافت کے خلاف نفرت کے آثار پہلے سے موجود تھے۔ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اصلاح مذہب و قوم نے ترکی کی خلافت کی مخالفت کو اور تقویت دی۔ تقریباً سارا عرب محمد بن عبدالوہاب کے ساتھ ہو گیا۔ محمد ابن سعود بھی جو اس وقت عرب کے ایک چھوٹے سے حصے کا حکمران تھا، محمد بن عبدالوہاب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔ غرض سنہ ۱۹۰۲ء تک کل عرب اس تحریک کا حامی بن گیا۔

ترکی کی طرف سے اس تحریک کو دبانے کی کوششیں کی گئیں، مگر بے سود۔ تحریک وہابیت کے نام سے ترکی خلافت کے خلاف ایک مؤثر اور مستقل احتجاج کی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ محمد بن سعود نے حکومت کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ عبدالعزیز اول نے اس کی توسیع کے لیے قدم اٹھایا۔ سعود کبیر نے عرب کے بہت بڑے حصے کو اپنے قبضے میں لے لیا اور حرمین شریفین تک سلطنت عثمانیہ کے قبضے سے نکل گئے۔

محمد علی پاشا خدیو مصر کو سلطانِ ترکی کی طرف سے اس تحریک کو دبانے پر مامور کیا گیا اس نے سنہ ۱۸۱۱ء میں سلطانی افواج کی مدد سے عرب پر حملہ کیا۔ پانچ چھ سال کی شدید جنگ کے بعد باغیوں کی قوت توڑ دی گئی۔ اس وقت ابن عبدالوہاب وفات پا چکے تھے اور عبداللہ اس جماعت کا امیر تھا۔ اسے گرفتار کر کے سزائے موت دی گئی۔

اس کے بعد پھر آہستہ آہستہ نجد میں اس حکومت کا احیاء ہوا، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد خانہ جنگی نے اس کی بنیادیں کمزور کر دیں اور ۱۸۹۱ء میں اس کا بھی خاتمہ ہو گیا اور آخری فرمانروا کو کویت میں پناہ لینی پڑی۔

عبدالعزیز ابن سعود

نجد کے آخری فرمانروا کا ایک بیٹا عبدالعزیز بن عبدالرحمن آل سعود تھا۔ اس کے دل میں آبائی شان و شوکت کو واپس لانے کی لگن تھی۔ چنانچہ اس نے رفیقوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ نجد کے مرکزی شہر ریاض پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر رفتہ رفتہ وسط یورپ میں اپنی طاقت مضبوط کر لی۔

پہلی جنگ عظیم کے وقت حجاز اور اس کے نواحی علاقوں پر ترکوں کی طرف سے شریف مکہ حکمران تھا۔ وسطی عرب کا تمام بڑا علاقہ عبدالعزیز ابن سعود کے قبضے میں تھا اس کے شمال میں حائل کی حکومت خاندان رشید کے قبضے میں تھی۔ یمن پر امام یحییٰ مسلط تھا۔ یہی عرب کی قابل ذکر طاقتیں تھیں۔

عرب میں ترکوں کے خلاف جو بغاوت پھیلی ہوئی تھی، پہلی جنگ عظیم میں وہ اتحادیوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اتحادیوں نے اس بغاوت کو اور ہوا دی۔ ساتھ ہی عربوں کی حمایت کا دم بھرا۔ عرب اتحادیوں کی چالوں میں آ گئے اور برطانیہ نے ابن سعود کو جنگ میں غیر جانبدار رہنے پر رضامند کر لیا۔

اسی جنگ کے دوران عرب بغاوت کی قیادت شریف مکہ اور اس کے بیٹے فیصل اور عبداللہ کے ہاتھ میں تھی اور ان تینوں کی باگ کرنل لارنس کے حوالے تھی ایفائے وعدہ کے وقت فیصل کو پہلے شام پھر عراق، عبداللہ کو شرق اردن اور حسین کو حجاز کی حکومت حوالے کر دی گئی۔ عراق اور شرق اردن کی حکومتیں برطانیہ کے زیر حمایت رہیں اور حجاز کو آزاد حکومت تسلیم کر لیا گیا۔

حسین کے طرز عمل سے حجاز کے لوگ اس سے سخت بددل ہو گئے۔ یہاں تک وہ حسین کی حکومت پر ترکی دورِ حکومت کو ترجیح دینے لگے۔ حسین نے تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر لیے تھے اور مطلق العنانی کا ایسا رسوا کن نمونہ پیش کیا کہ رعایا اسے حکومت سے بے دخل کرنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ عجیب معاملہ یہ ہے کہ حسین عبدالعزیز ابن سعود کو ختم کرنے کی کوشش میں تھا۔ ایک مرتبہ اس کے بیٹے عبداللہ نے نجد پر یورش کی جس کی نہایت بری طرح شکست کھائی۔ ۱۹۲۴ء میں پھر عبداللہ نے چڑھائی کی اور شکست کھائی اب نجدیوں نے پیش قدمی کر کے طائف پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مکہ معظمہ بھی حسین حکومت سے دستبردار ہو گیا اور اس کا بیٹا علی حکمران بنا۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں وہ بھی ختم ہو گیا۔ عبدالعزیز ابن سعود پورے حجاز کا فرمانروا بن گیا۔

حجاز نے ابھی تک جدید سائنسی اعتبار سے کوئی ترقی نہ کی تھی، ابن سعود نے وہاں وائرلیس ٹیلیفون، ڈاکخانے اور ترقیات کے دوسرے شعبے قائم کیے، ملک کی معاشی حالت بہتر بنائی۔ نجدی قبائل کی بغاوت اور ان کی لوٹ مار کا قلع قمع کر کے ملک میں امن قائم کیا۔

سنہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۶ء تک ابن سعود عرب کے مختلف علاقے فتح کرنے میں مصروف رہا۔ رفتہ رفتہ پورا عرب اپنے قبضے میں کر لیا۔ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ سے ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے برطانیہ نے ابن سعود کی اس وقت تک کی تمام فتوحات کو قبول کر لیا اور اسے آزاد ریاست تسلیم کیا۔ ابن سعود کی مملکت کو دولتِ عربیہ سعودیہ کا نام دے کر ابن سعود کو وہاں کا باقاعدہ بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ نجد میں تیل کے نہایت قیمتی چشمے دریافت ہوئے۔ ان سے مملکت کی اقتصادی حالت نہایت اعلیٰ مرتبے پر پہنچ گئی۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں دمام سے ریاض تک ۱۵۰ میل لمبی ریلوے لائن مکمل کر لی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں شاہ نے برطانیہ کو احتجاجی نوٹ بھیجا کہ اس نے اپنے اقرار کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حدود دولتِ سعودی عرب میں تجاوز کیا ہے ۵ اگست کو سعود بن عبدالعزیز ولی عہد کو تمام افواج کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ اکتوبر میں دولت سعودیہ میں وزارت تجویز ہوئی چنانچہ سعود بن عبدالعزیز کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ ۹ نومبر ۱۹۵۳ء کو سلطان عبدالعزیز نے ستر سال کی عمر میں وفات پائی اور مرحوم کے ولی عہد امیر سعود بن عبدالعزیز کی بادشاہی کا اعلان ہوا۔ مرحوم کے بیٹے شاہ فیصل کو ولی عہد قرار دیا گیا۔

۱۹۵۳ء میں نخلستانِ بریمی کے متعلق جو تنازعہ پیدا ہوئی تھی، اس کے بارے میں برطانیہ نے تجویز پیش کی تھی کہ اسے ثالثی کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ ۳۰ جون ۱۹۵۴ء کو ثالثی پر اتفاق ہو گیا۔ چنانچہ پانچ افراد کا ایک کمیشن بنایا گیا، جس میں ایک ممبر برطانیہ کی طرف سے بجانب سلطان مسقط و عمان مقرر ہوا، اور دوسرا ممبر دولتِ سعودیہ کی طرف سے نامزد کیا گیا۔ باقی تین ممبر دونوں نے مل کر انتخاب کیے۔

کمیشن کا اجلاس شروع ہوا تو برطانیہ یہ عذر پیش کر کے الگ ہو گیا کہ فریق ثانی یعنی دولتِ سعودیہ کی طرف سے غیر مناسب طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ جھگڑے کا فیصلہ اب تک نہیں ہوا۔

۲ جون ۱۹۵۴ء کو سلطان نے مصر کو پوری فوجی اور مالی امداد کا یقین دلایا۔

۱۹۵۶ء میں برطانیہ اور فرانس نے مصر پر حملہ کیا تو اکثر دوسری عرب حکومتوں کی طرح دولت سعودیہ کی حکومت نے برطانیہ اور فرانس سے تعلقات منقطع کر لیے۔

جنوری ۱۹۵۶ء میں شاہ سعود ہندوستان گئے۔ پھر پاکستان آئے۔ امریکہ، ہسپانیہ اور مغربی ممالک کا دورہ کیا، اور عرب اتحاد کو مضبوط رکھنے کے لیے سرگرم کوششیں کیں۔

عرب کی سیاسی بیئت

غرض برطانیہ نے عربوں کی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ عرب کے دس لاکھ مربع میل رقبے میں تین لاکھ کے قریب "سعودی عرب" کے نام سے اور ۵۰ ہزار میل کے قریب یمن کے نام سے آزاد ہے۔ باقی تمام حصے پر برطانوی اقتدار چھایا ہوا ہے۔ اور وہ یورپ کی صنعتی طاقت کے نیچے دبا ہوا ہے۔ حضرموت کا ایک لاکھ بارہ ہزار مربع میل علاقہ کئی چھوٹے چھوٹے قبائلی شیخوں کی ماتحتی میں ہے۔ یہ سب شیوخ برطانیہ کی سرپرستی میں دن بسر کر رہے ہیں۔ ان کی مجال نہیں کہ برطانیہ کی سرکشی کی جرأت کریں ۱۹۳۰-۳۹ء میں بعض شیوخ نے برطانوی اقتدار کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ بموں اور مشین گنوں کے ذریعے ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے گئے۔

عدن عرب کا بہترین تجارتی اڈہ ہے۔ جس پر برطانیہ کا مکمل قبضہ ہے۔ مشرقی ساحل پر مسقط اور عمان کا بیاسی مربع میل رقبہ بظاہر ایک سلطان کے ماتحت ہے، مگر اس سلطان کے سر پر ایک ریذیڈنٹ اور ایک ایجنٹ متعین ہے۔ ان دونوں کی مرضی کے بغیر سلطان کوئی کام از خود نہیں کر سکتا۔ مشرقی ساحل پر قطار اور بحرین کے علاقے دو الگ الگ حکمرانوں کے ماتحت ہیں مگر دونوں حکمران برطانیہ کے اقتدار تلے زندگی گزار رہے ہیں۔ بحرین کا ساحلی سمندر دنیا میں موتی پیدا کرنے کا بہترین مقام ہے اور جہاں کبھی عربوں کی اپنی آزاد تجارت تھی، اب اس حصے کی تجارت برطانیہ کے زیر اثر ہے۔ بحرین کے پہلو میں سات اور چھوٹے چھوٹے علاقے ہیں، جن کا مجموعی رقبہ ۸۰ ہزار مربع میل سے کم نہیں۔ یہ سب علاقے ایجنٹ کے ماتحت ہیں۔ ۱۸۸۲ء کے معاہدے کے مطابق یہ علاقے برطانیہ کے سوا کسی دوسری طاقت سے گفت و شنید نہیں کر سکتے۔ کسی دوسری حکومت کے ایجنٹ کو بھی اپنے علاقے میں نہیں رکھ سکتے۔ برطانیہ کے سوا اور کسی کے پاس نہ اپنا علاقہ فروخت کر سکتے ہیں نہ ٹھیکے پر دے سکتے ہیں۔

باب ۲۰: شام

شام ایک زراعتی ملک ہے، جس کا رقبہ اٹھاون ہزار مربع میل سے زیادہ نہیں۔ پہلے شرق اردن اور فلسطین بھی شام میں شامل تھے۔ مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ دونوں علاقے شام سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ آبادی چالیس لاکھ کے قریب ہے۔ لبنان بھی شام ہی کا ایک حصہ ہے۔ مگر وہاں چونکہ عیسائیوں کی اکثریت ہے، اس لیے اسے ایک علیحدہ جمہوریہ بنا دیا گیا ہے۔

ترکوں کے خلاف بغاوت

شام کا ملک وسائل آمد و رفت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بالکل ابتدائی دور میں یورپ اور اقصائے ایشیا سے تجارت میں شام کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ہوائی جہازوں کی ایجاد سے پہلے ایشیا اور آسٹریلیا سے تجارتی تعلقات رکھنے والے ہر یورپی علاقے کو شام ہی کے راستے تجارت کرنی پڑتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل یہ علاقہ سلطان ترکی کے قبضہ میں تھا۔ جنگ عظیم کے بعد شام کے عربوں میں ترکی حکومت کے خلاف بغاوت رونما ہوئی، شام نے ترکوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی ٹھان لی۔

جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور فرانس نے بار بار عربوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر عرب کے تمام ممالک کو آزاد کر دیا جائے گا۔ چنانچہ عربوں کو پورا یقین ہو گیا کہ حصولِ آزادی کے سلسلے میں برطانیہ اور فرانس ضرور ان کی مدد کریں گے۔ پھر جب مصر کے برطانوی ہائی کمشنر نے عرب باغیوں کے لیڈر حسین شریف مکہ سے وعدہ کیا کہ عرب سلطنت کے جو حدود متعین کئے تھے، ان کی آزادی کو تسلیم کیا جائے گا اور عربوں کی جنگ آزادی میں ان کی مدد کی جائے گی تو شامیوں کا حوصلہ اور بڑھا اور انہوں نے ترکوں کے خلاف جنگ کا عزم کر لیا۔

عربوں سے وعدے

شریف حسین نے عدن کو برطانوی تسلط میں رکھنا منظور کر لیا، نیز بصرہ، بغداد، حلب اور بیروت کے اضلاع پر بھی برطانوی اقتدار تسلیم کر لیا۔ عربوں نے یہ سب کچھ اس لیے گوارا کر لیا کہ انہیں ترکوں کے خلاف انگریزوں کی مدد کی توقع تھی مگر جب برطانیہ کے وزیر خارجہ نے فلسطین کے بارے میں اعلان کیا کہ اسے یہودیوں کا مسکن بنایا جائے گا تو عربوں میں انگریزوں کے خلاف ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ جسے ۹ نومبر ۱۹۱۸ء کو برطانیہ و فرانس نے ایک متفقہ اعلان کے ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کی۔ اسی اعلان میں عربوں کو یقین دلایا گیا کہ بلاد عرب کے معاملات میں کوئی دست اندازی نہ کی جائے گی۔

پھر جب فرانس کے چودہ نکات شائع ہوئے تو عربوں کو مزید اطمینان ہو گیا کہ ان کی آزادی کے دن قریب آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ پورا پورا انصاف ہو گا مگر جب صلح کانفرنس میں حجاز سے صرف ایک نمائندہ بلایا گیا اور وہ بھی شریف حسین کا بیٹا فیصل، تو عربوں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں اپنی امیدوں پر پانی پھرتا ہوا محسوس ہوا۔

برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ اعلان میں جو ۱۹۱۹ء میں کیا گیا، اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ جو قومیں ایک عرصے سے ترکی کے پنجہ استبداد سے جکڑی ہوئی ہیں انہیں مکمل آزادی دی جائے اور وہاں ایسی حکومتیں قائم کی جائیں جن کا اقتدار اعلیٰ مقامی باشندوں کی خواہش و مرضی پر منحصر ہو اور وہ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔

انتداب

مگر یہ اعلان بھی برطانیہ اور فرانس کے ذاتی مفادات کی نذر ہو کر رہ گیا۔ انتداب کی نئی اصطلاح وضع کی گئی جس کے مطابق طے پایا کہ وہ نوآبادیاں اور علاقے جو پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں جرمنی اور ترکی حکومت سے آزاد ہو چکے ہیں، انہیں ترقی یافتہ آزاد ملکوں کی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ انہیں دنیا کی کشمکش میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کے قابل بنا دیں اور انجمن اقوام کی طرف سے ان پر حکومت کریں۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں اعلان ہوا کہ عراق پر برطانیہ کا انتداب رہے گا اور شام کے ساحلی علاقے کو (بشمول لبنان) فرانس کے زیر انتداب دے دیا گیا ہے۔ فلسطین اور شرق اردن کے علاقے شام سے کاٹ کر برطانیہ کی نگرانی میں رہیں گے۔ حسین کو حجاز کا، اس کے ایک بیٹے کو عراق اور دوسرے کو شام کا سلطان بنا دیا جائے گا۔ ابھی اسکیم پر پوری طرح عمل نہ ہوا تھا کہ فیصل شام سے نکالا گیا۔ اور برطانیہ نے اسے عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ دوسرے بیٹے عبداللہ کو شرق اردن دے دیا گیا۔

شام پر فرانسیسی تسلط

فرانس کو صرف شام کا ساحل دیا گیا مگر وہ اس پر قانع نہ ہو سکا۔ وہ سارے شام پر اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اگست ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی فوجوں نے دمشق میں داخل ہو کر فیصل کو معزول کر دیا اور خود سارے شام پر قبضہ جما لیا۔

عرب پہلے ہی سے فرانسیسیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس لیے کہ شام میں کچھ آبادی فرانسیسیوں کی بھی تھی۔ چنانچہ فرانس نے ان فرانسیسی باشندوں کی وساطت سے ہمیشہ عربوں کو اپنی تہذیب و معاشرت میں رنگنے اور ان پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے کئی ناجائز طریقے روا رکھے۔ اب کہ فرانس نے شام پر زبردستی قبضہ جما لیا تھا، اہل شام نے ان کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور زبردست بغاوتیں رونما ہو گئیں۔

فرانسیسی فوجوں نے جبر و تشدد سے ان بغاوتوں کو دبا یا۔

شام پر فرانس کا یہ قبضہ صلح کانفرنس کے فیصلوں کے صریحی خلاف تھا مگر کسی نے فرانس سے اس بارے میں بازپرس نہ کی بلکہ دو سال بعد ۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو جمعیت اقوام نے صلح کانفرنس کے سابقہ فیصلوں کے خلاف پورے شام پر فرانسیسی انتداب تسلیم کر لیا۔

شام اور فرانسیسی کشمکش جمعیت اقوام کے اس نئے فیصلے کے باوجود شامیوں نے فرانسیسی حکومت کے زیر اثر رہنے سے انکار کر دیا اور بغاوت زیادہ شدت اختیار کر گئی اور فرانس کے خلاف جنگیں شروع ہو گئیں۔

فرانس نے شام کے اس چھوٹے سے علاقے کو جس میں شرق اردن اور فلسطین پہلے ہی علیحدہ کیے جا چکے تھے، پانچ صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ تقسیم مذہبی اور نسلی تفریق کی بنا پر کی گئی۔ لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت تھی، لہٰذا اسے علیحدہ کر دیا گیا۔ اسی طرح اسکندرونہ میں ترکوں کی آبادی زیادہ تھی، لہٰذا اسے نسلی تفریق کی بنا پر علیحدہ خطہ بنا دیا گیا۔ اسی طرح دمشق اور جبل الدروز بھی بعض اختلافات کے بہانے علیحدہ صوبے بنائے گئے۔

عربوں نے فرانسیسی سامراج کے چنگل سے نکلنے کے لیے بہت کوششیں کیں لیکن بغاوتوں پر بندوقیں، توپیں، ٹینکوں اور مشین گنوں کے بل پر فرانس شام پر حکومت کرتا رہا۔ ۱۹۲۵ء میں کچھ حریت دوست لیڈروں کو صلح کے بہانے بلا کر گرفتار کر لیا۔

عرب کی تحریک آزادی کسی طرح نہ دبی۔ فرانس نے اسے دبانے کے لیے کسی قسم کے تشدد سے گریز نہ کیا۔ دمشق پر مسلسل اڑتالیس گھنٹے بمباری ہوتی رہی۔ ٹینکوں، مشین گنوں اور بموں نے دمشق کے خوبصورت مکانات، بازاروں اور عمارتوں کو تباہ کر دیا۔ شام کے تیس لاکھ نہتے عوام پر گولیاں برسائی گئیں اور انہیں جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ آخر یہ بغاوت تشدد کے طوفان تلے کچھ دیر کے لیے دب گئی۔

تحریک دب جانے کے بعد ۱۹۲۶ء میں فرانسیسی حکومت نے ایک نمائندہ مجلس بنانے کا اعلان کیا جس کے ممبر آزادانہ انتخاب کے ذریعے منتخب کرنے کی تجویز ہوئی۔ طے پایا کہ یہ ممبر اپنی مرضی سے ایک دستور اساسی بنائیں۔ اس دستور کے مطابق حکومت بنائی جائے اور فرانس اس حکومت سے ایک معاہدہ کرے

اس اعلان سے اہل شام کو قدرے اطمینان ہوا مگر دو سال تک یہ اعلان عملی شکل اختیار نہ کر سکا نہ نمائندہ مجلس کے انعقاد کی تاریخ مقرر ہوئی نہ الیکشن کے لیے طریق کار مقرر کیا گیا۔ دو سال کے بعد مجلس بنی، ممبر منتخب ہو گئے، دستور اساسی تیار ہوا۔ اس دستور نے شام کے لیے جو نظام حکومت تجویز کیا، اس میں فرانس کی "سرپرستی" کے لیے گنجائش نہ نکل سکی۔ فرانس اسے کب گوارا کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس دستور کو ماننے سے انکار کر دیا اور مزید چھ سات سال تک جبر و طاقت کے زور سے شام پر حکومت کرتا رہا۔

معاہدے آخر ۱۹۳۳ء میں فرانس نے ایک معاہدہ شام کی اسمبلی کے سامنے رکھا جس میں شام کی پانچ تقسیمیں بحال کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ فرانس کی جو فوجی چھاؤنیاں، عمارتیں، ہوائی اڈے اور فوجی طاقتیں ہیں، وہ بدستور یہاں رہیں گی۔ البتہ اندرونی نظم و نسق میں شامیوں کو تھوڑے بہت اختیارات حاصل رہیں گے۔

معاہدے میں یہ بھی کہا گیا کہ چار سال کے بعد شام کو فرانسیسی انتداب سے آزاد کر دیا جائے گا۔

شام کی اسمبلی نے یہ معاہدہ نامنظور کر دیا اور تحریک آزادی جاری رہی۔ تین سال بعد ۱۹۳۶ء میں فرانس نے دوسرا معاہدہ پیش کیا۔ جس میں شام کی آزادی تسلیم کرتے ہوئے اسے آزاد جمہوریت کی حیثیت سے انجمن اقوام کا رکن بنایا گیا۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط عائد کی گئی کہ فرانس اور شام کے درمیان "دائمی دوستی" قائم رہے گی۔ انطاکیہ اور جبل دروز میں فرانس کی مسلح فوجیں رہیں گی۔

انطاکیہ اور اسکندرونہ شمالی شام کے دو ضلعے تھے جن میں ترک آبادی کی اکثریت تھی چنانچہ اس بنا پر حکومت ترکی فرانس سے ان صوبوں کی واپسی کا مطالبہ کرتی رہی تھی مگر فرانس نے ہمیشہ انکار کیا۔ جب شام کی آزادی کا اعلان کیا گیا تو ساتھ ہی ترکی کے ساتھ فرانس نے ان صوبوں کے بارے میں بھی معاہدہ کر لیا جس کی رو سے شام کے یہ زرخیز صوبے ترکی کو واپس کر دیے۔ شام نے فرانس کی اس جابرانہ حکمت عملی اور غیر منصفانہ اقدام کے خلاف بہت احتجاج کیا مگر اسے ان صوبوں سے ہاتھ دھونے ہی پڑے۔

اس وقت حکومت شام اتنی کمزور تھی کہ اس کے لیے فرانس یا ترکی کے خلاف جنگی اقدام ناممکن تھا لہٰذا وہ خاموش رہی۔ مگر دوسری جنگ کے بعد جب اس نے قوت پکڑی اور اس کی آزادی زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم کی گئی تو ۱۹۲۲ء میں اس نے اپنے علاقوں کی بازیابی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے اس زمانے میں کچھ نہ ہو سکا۔

آزادی دوسری جنگ عظیم میں فرانس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو انگریزوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں جرمن شام میں پہنچ کر شرق اوسط کے لیے مصیبت کا باعث نہ بن جائیں۔ چنانچہ آزاد فرانسیسی فوجوں اور انگریزی فوجوں نے مل کر شام پر قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی یہ اعلان کر دیا کہ جنگ کے بعد شام کو آزادی دے دی جائے گی۔ چنانچہ جنگ ختم ہوئی تو شام کو آزادی ملی۔ مگر اس کے دو حصے کر دیے گئے۔ ایک شام دوسرا لبنان۔ دونوں کی الگ الگ حکومتیں تھیں۔ اب شام اور مصر کا اتحاد ہو گیا ہے۔ یعنی ان دونوں ملکوں کی ایک حکومت بن گئی ہے اور ملک کا نام متحدہ عرب جمہوریہ ہے۔

باب ۲۱ عراق

تعارف عراق وہ زرخیز خطہ ہے جسے دریائے دجلہ و فرات سیراب کرتے ہیں۔ تیل کے چشمے اس ملک کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے اعداد و شمار کے بموجب آبادی ۴۶ لاکھ کے قریب تھی جس میں شیعہ ساٹھ فیصد کے قریب تھے۔ اب آبادی پینتالیس لاکھ سے کم نہیں۔

اہمیت یورپ سے ایشیا اور آسٹریلیا کو جانے والا راستہ عراق ہی سے ہو کر جاتا ہے۔ چنانچہ بصرہ و بغداد بڑے ہوائی اڈے ہیں۔ چونکہ خلیج فارس کا ساحل عراق سے ملحق ہے، اس لیے عرب، ایران اور پاک و ہند کی تجارت کا مرکز عراق ہی ہے۔ ہندوستان پر برطانوی تسلط کے زمانے میں برطانیہ کے لیے عراق کی اہمیت چنداں تشریح کی محتاج نہیں۔ ہندوستان کے مغرب میں برطانیہ کا خط دفاع عراق سے نہر سویز تک پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں جب بغداد ریلوے پر پارلیمنٹ میں بحث ہوئی تو کہا گیا کہ اگر عراق میں کسی غیر برطانوی طاقت کا عمل دخل شروع ہوا تو ہندوستان انگریزوں کے پاس نہ رہ سکے گا۔

سیاسی حالات پہلی جنگ عظیم سے پیشتر عراق سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا مگر وہاں کے عوام میں خلافت عثمانیہ کے خلاف جذبات پیدا ہو چکے تھے اور وہ ترکوں کا طوق غلامی اپنے گلے سے نکال کر ملک کو آزاد کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب جنگ چھڑی تو برطانیہ نے انہیں جھانسا دیا کہ انہیں ترکوں کے

خلاف مدد دی جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب اتحادی فوجیں عراق میں داخل ہوئیں تو ترکوں نے معمولی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ انتظار کرنے لگے کہ جنگ ختم ہونے پر برطانیہ عراق کو آزاد ریاست بنا دے گا۔ مگر یہ امید پوری نہ ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں اختتام جنگ پر عراق کو برطانیہ کی فوجی حکومت کا دست نگر بنا دیا گیا۔ پھر دو سال کے بعد اسے برطانیہ کے انتداب میں دے لیا گیا۔

انتداب نے عراق میں برطانیہ کے خلاف عام بغاوت پھیلا دی۔ جنگ و جدل تک نوبت پہنچی۔ طرفین کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ آخر اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں عراقی لیڈروں کی ایک وزارت مرتب کر دی گئی۔ ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا کہ عراق کا بادشاہ بھی کسی عراقی ہی کو بنایا جائے گا۔ پھر برطانیہ نے شریف حسین شاہ حجاز کے فرزند فیصل کو عوام کی مخالفت کے باوجود شاہ عراق منتخب کیا اور ۲۳ اگست سنہ ۱۹۲۱ء کو باضابطہ طور پر فیصل کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک معاہدہ کی رو سے عراق پر سے برطانوی اقتدار ہٹا کر صرف دوستانہ تعلقات برقرار رہنے دیئے گئے۔ اس معاہدے کے بعد نمائندہ اسمبلی بنائی گئی جس نے دستور اساسی تیار کیا۔ جس کی رو سے بادشاہ کا وجود باقی رکھا گیا، مگر اسے آئین کا پابند بنا دیا گیا۔

یہ آزادی صرف داخلی معاملات میں تھی۔ خارجی معاملات برطانیہ کے اختیار میں تھے اور اس ضمن میں برطانیہ و فرانس کی رقابت زوروں پر تھی۔ عراقی عوام بیرونی معاملات میں برطانوی اقتدار کے خلاف تھے۔ چنانچہ برطانوی انتداب کے خلاف پھر جدوجہد شروع ہو گئی۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ اور عراق کے مابین دوسرا معاہدہ ہوا جس کی رو سے عراق کو آزاد حکومت تسلیم کر لیا گیا اور وعدہ کیا گیا کہ عراق کو انجمن اقوام کا ممبر بنانے کے سلسلے میں برطانیہ سفارش کرے گا۔ پانچ سال بعد عراق انجمن اقوام کا ممبر بنا لیا گیا۔ گویا ساری دنیا نے اسے آزاد ملک تسلیم کر لیا۔ برطانیہ کو عراق میں ہوائی اڈے بنانے اور ان کی حفاظت کے لیے کچھ فوج رکھنے کی اجازت مل گئی۔ نیز طے پایا کہ عراقی حکومت چند انگریزوں کو مشیر کے طور پر رکھے گی۔ یعنی فوجی وزارت کے سر پر ایک برطانوی ملٹری مشن مسلط کر دیا گیا۔ خفیہ پولیس کے محکموں میں بھی چند انگریز عہدیدار رکھے گئے۔

تیل عراق کی سب سے اہم دولت تیل کے چشمے ہیں جن سے پہلے اکیلا برطانیہ فائدہ اٹھاتا تھا۔ بعد ازاں فرانس بھی اس میں شریک ہو گیا۔ یہ تیل بحر روم کی بندرگاہ تک پہنچانے کے لیے جو پائپ لائن بنائی گئی، اس کی ایک شاخ فرانس کی انتدابی علاقے شام سے۔ اور دوسری برطانیہ کے انتدابی علاقے فلسطین سے گزرتی ہے۔ تیل نکالنے، صاف کرنے اور بیچنے کے سارے اختیارات "اینگلو ایرانین کمپنی" کو حاصل ہو گئے اس نام میں ایران کا لفظ اس لیے آیا کہ ایران کے تیل کا ٹھیکہ بھی اسی کمپنی کے پاس ہے۔ یہ نہیں کہ عراق کے تیل میں ایران بھی حصہ دار تھا۔

ایک برطانوی آئل کمپنی کے ساتھ، عراق کا یہ معاہدہ بھی ہو گیا کہ وہ عراق کی حدود میں تیل کے مزید چشمے دریافت کرے گی جو چشمے وہ دریافت کرے ان سے تیل نکالنے کا اجارہ اسی کمپنی کو دیا جائے گا۔

جمہوریت فیصل کے انتقال پر اس کا بیٹا غازی بادشاہ بنا۔ اس کے ساتھ ملک و قوم کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں، مگر وہ موٹر کے حادثے میں اچانک مارا گیا اور اس کے کم سن بچے فیصل ثانی کو بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ فیصل کا ماموں امیر عبداللہ بن امیر علی، ابن شریف حسین شاہ حجاز، نائب السلطنت قرار پایا۔ جنگ کے زمانے میں بعض آزادی دوست عناصر نے بغداد پر قبضہ کر لیا تھا، مگر انہیں بہت جلد سب کچھ چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور امیر عبداللہ کا تسلط پھر بحال ہو گیا۔ اس اثنا میں نوری السعید نے وزیر اعظم کی حیثیت میں ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے بہت کچھ کیا مگر وہ انگریزوں اور دوسری مغربی طاقتوں کا حامی تھا۔ جسے اکثر عرب پسند نہ کرتے تھے سنہ ۱۹۵۸ء کے موسم گرما میں اچانک ایک فوجی دستے نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ شاہ فیصل، امیر عبداللہ اور نوری السعید مارے گئے۔ فوجی دستے کے انقلابی افسر حکومت کے مالک بن گئے۔ عراق میں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔

باب ۲۲ — مصر

اہمیت قدیم ترین تہذیب و تمدن کے گہوارے کی حیثیت سے مصر کی تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ فراعنہ مصر اور اہرام مصر کے حوالے سے یہ ملک ایک عالمگیر شہرت کا حامل ہے۔ صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کے لحاظ سے افریقہ میں مصر سے زیادہ زرخیز اور دولت مند علاقے موجود نہیں۔ خود افریقہ کی نوآبادیوں میں مصر سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس اہمیت کا زیادہ احساس دنیا کو اس وقت ہوا جب انیسویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب ظہور میں آیا۔ مصر ایک ایسے مقام پر واقع ہے جو صنعتی دنیا میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے۔ دنیا کے بازاروں اور منڈیوں پر قبضہ جمانے کی غرض سے جب یورپی تاجروں نے بیرونی ملکوں کا سفر کیا تو اس وقت مصر کی اہمیت ایک حقیقت بن کر سامنے آئی۔ مصر ایک ایسا مقام ہے جسے یورپ اور ایشیا کا درمیانی دروازہ کہا جا سکتا ہے۔ اور جہاں سے ہو کر مشرق اور مغرب کا راستہ گذرتا ہے۔

نپولین بونا پارٹ سب سے پہلا شخص تھا جس نے مصر کی اہمیت کے پیش نظر سنہ ۱۷۹۸ء میں اس پر حملہ کیا اور کئی سال تک اس کی فوجیں یہاں پڑی رہیں۔ نپولین نے مصری زبان، مصری رسم و رواج اور مصری معاشرت سے یورپ کو روشناس کرایا۔ نپولین مصر کو مستقل طور پر فرانس کے زیر اقتدار لے آتا، مگر وہ تین چار سال سے زیادہ یہاں نہ ٹھہر سکا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۵ء میں سلطان ترکی کی طرف سے محمد علی نے مصر کو فتح کیا اور پاشا کا خطاب پا کر مصر کا والی بنا۔

مصر میں یورپی اقتدار یورپی طاقتیں مصر پر اپنا اپنا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں لگی رہتی تھیں، چنانچہ محمد علی پاشا کے عہد میں فرانس اور برطانیہ مصر میں اپنا اپنا اقتدار بڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ پھر انیسویں صدی کے اوائل میں برطانیہ اور فرانس کے مابین ایک خفیہ معاہدے کے ذریعے فرانس نے مصر سے اپنا اقتدار اس شرط پر ہٹا لیا کہ برطانیہ مراکش کے معاملے میں فرانس سے نہیں الجھے گا۔

محمد علی پاشا نے سوڈان کو فتح کر کے مصر میں شامل کر لیا۔ عرب کا کچھ علاقہ بھی اس نے مصر کی حدود میں داخل کر لیا۔ جس سے مصر کی ترقی اور خوشحالی میں اضافہ ہو گیا۔ محمد علی پاشا کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم پاشا مصر کا والی بنا، مگر دو ماہ بعد انتقال کر گیا۔ پھر اس کا بیٹا عباس پاشا مصر کے تخت پر بیٹھا، چار سال بعد وہ مارا گیا۔ اس کے بعد محمد علی پاشا کے چھوٹے لڑکے سعید پاشا کو حاکم بنایا گیا۔ سعید پاشا سے سنہ ۱۸۶۳ء میں اس کے بھتیجے اسماعیل پاشا نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ سلطان ترکی کی طرف سے اسے خدیو کا لقب ملا جو مصر کے ہر والی کا لقب ٹھہرا اور وہ صرف رسمی طور پر ترکی

سے وابستہ تھے، عملاً بالکل آزاد مانے جاتے تھے۔ اسماعیل پاشا کے عہد کا مشہور واقعہ نہر سویز کی تعمیر ہے، جو فرانسیسی انجینیروں نے بنائی۔ ۱۸۶۹ء میں یہ نہر مکمل ہوئی۔

اسماعیل پاشا نے جو سلطان ترکی کی طرف سے اس کے والی یا گورنر کے طور پر نہیں بلکہ آزاد اور مختار حاکم کے طور پر مصر کی زمام حکومت سنبھالے ہوئے تھا، ملک کی ترقی کے لیے بہت سے کام کیے، مثلاً ریلوں، سڑکوں، تاروں وغیرہ کا جال بچھایا۔ پل بنائے ڈاک خانے، تعلیمی ادارے اور عدالتیں وغیرہ جاری کیں۔ پورٹ سعید، سویز اور اسکندریہ کی بندرگاہوں کی مرمت کرائی۔

بہت زیادہ مصارف سے جب بجٹ غیر متوازن ہوگیا تو خدیو نے برطانیہ اور فرانس سے قرض لینا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مصری آمدنی کے خاص خاص شعبے انگلستان اور فرانس کے ہاتھوں گرو ہوگئے۔ دونوں حکومتوں نے مل کر مصر کے پورے مالیے پر قبضہ کر لیا اور ایک مخصوص رقم خدیو کو دی جانے لگی۔ مصر پر اجنبی قبضے کی ابتدا اسی طرح ہوئی۔ قرضے اتارنے کی غرض سے خدیو اسماعیل نہر سویز کے وہ حصے فروخت کر دینا چاہتا تھا جو خود اس کی ملکیت تھے۔ برطانیہ نے ایک لاکھ، ہزار چالیس گنی میں خرید لیے۔ سویز کے ان حصوں کی فروخت انگلستان کے لیے مصر پر اقتدار قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی اور نہر سویز کی حفاظت کے بہانے انگریز فوجوں نے مصر میں آنا شروع کر دیا۔

مصر کی پہلی قومی تحریک

مصر میں مغربی طاقتیں جس طرح اپنا جال پھیلا رہی تھیں، اس سے عوام غافل نہ تھے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ سلطان ترکی کو مصریوں سے ہمدردی نہیں بلکہ وہ مغربی طاقتوں کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ اس بنا پر وہ سلطان ترکی کے تابع رہنا نہ چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں ان میں قومیت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ جس کا بیج سید جمال الدین افغانی نے بویا تھا اور سید موصوف دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی تحریک آزادی کے بانی بنے۔ انہیں کی پیدا کی ہوئی فضا میں مختلف جوانوں نے پرورش پائی اور آزادی کا بیڑا اٹھایا۔ انہیں میں ایک جوان عرابی پاشا بھی اٹھا، جس کی قیادت میں مصریوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی۔

عرابی پاشا ایک معمولی گھرانے کا فرد تھا جو اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث مصر کی وزارت جنگ کے عہدے تک پہنچا۔ ۱۸۸۲ء میں اس نے مصر کو انگریزوں اور ترکی دونوں کے اقتدار سے آزاد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس نے خدیو مصر سے مطالبہ کیا کہ وزارت تبدیل کر کے فوج کی تعداد بڑھائی جائے۔ تمام مصری فوجیوں نے عرابی پاشا کا ساتھ دیا۔ وہ صرف حریت پرور افواج کا لیڈر تھا، بلکہ ایک لحاظ سے مصر کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ مصری افواج نے اس کی سرکردگی میں برطانوی فوجوں کے ساتھ باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔ فرانس، ترکی اور خدیو مصر تینوں نے برطانیہ کی مدد کی اور سب نے مل کر اس تحریک کو کچلنا چاہا۔ ابتدا میں عرابی پاشا کا پلہ بھاری رہا۔ بعد ازاں مخالف فوجوں کی قوت میں ہندوستانی فوجوں کی آمد سے اضافہ ہوگیا۔ تو انہیں شکستیں ہونے لگیں۔ برطانیہ نے اسکندریہ پر شدید بمباری کی دو ماہ کی جنگ کے بعد عرابی پاشا کو شکست ہو گئی۔ اسے گرفتار کر کے سیلون میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں ۱۹ سال بعد ۱۹۰۱ء میں اسے رہا کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں مصر مکمل طور پر انگریزی اقتدار میں آچکا تھا۔ عرابی پاشا نے ۲۱ ستمبر ۱۹۱۱ء کو وفات پائی۔

مہدی سوڈانی

مسلمانوں میں ایک عقیدہ پایا جاتا ہے کہ مہدی آکر انہیں بعض مصائب سے نجات دلائیں گے۔ اس عقیدہ سے سوڈان کے ایک شخص محمد احمد نامی نے فائدہ اٹھایا اور مصر کی بغاوت اور بے چینی کے دور میں سوڈانیوں کو منظم کیا۔ سید محمد احمد بہت ہی نیک عبادت گزار و پاکباز شخص تھا۔ عوام میں اسے بہت احترام حاصل تھا۔ کامیابی کے بعد عام لوگ اسے مہدی پکارنے لگے۔ غرض معتقدوں کی بہت بڑی جماعت مہدی کے علم کے نیچے جمع ہو گئی۔ اس طرح جب ایک مضبوط فوج تیار ہو گئی تو سوڈان کے علاقے فتح کرنے شروع کر دیئے۔

مہدی کی یہ سرگرمیاں بھلا انگریزوں کو کیسے برداشت ہو سکتی تھیں، انگریزوں کے علاوہ خدیو مصر اور ترکی کا بھی سوڈان پر تسلط تھا۔ مگر موخر الذکر دونوں طاقتیں مہدی کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ سوڈان آزاد ہو گیا، وہاں مہدی نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ ابھی ابتدائی انتظامات بھی نہ ہو سکے تھے کہ مہدی نے چند روز بیمار رہ کر وفات پائی اور اس کا خلیفہ عبداللہ جانشین بنا۔ اس کی حکومت عام طور پر درویش حکومت کہلاتی تھی۔

۱۸۹۶ء میں انگریزوں نے مصر سے حملہ کیا۔ کچنر کے زیر کمان مہدی کے جانشینوں پر چڑھائی کر دی۔ دو سال کی جدوجہد کے بعد کچنر کی فوجیں پورے سوڈان پر قابض ہو گئیں۔

۱۸۹۹ء میں برطانیہ اور مصر کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت مصر میں حکومت کی نگرانی کے لیے ایک برطانوی گورنر جنرل کا رہنا قرار پایا اور سوڈان کی حکومت انگریزوں کے سپرد ہو گئی۔ مصر کا پہلا گورنر لارڈ کچنر مقرر ہوا۔

جمال الدین افغانی

سید جمال الدین افغانی کا ذکر اختصار سے پہلے بھی آچکا ہے یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ مصر کی سیاسی ابتری، معاشی بدحالی اور اندرونی و بیرونی چیرہ دستیوں کے زمانے میں عالم اتحادِ اسلامی کے قائد جمال الدین افغانی وہاں وارد ہوئے۔ مصری عوام اسماعیل پاشا کی فضول خرچیوں، سرکاری شعبوں کی رشوت ستانیوں اور حکومت کی بدعملیوں سے نالاں ہو چکے تھے۔ نوجوانوں کی خفیہ انجمنیں بن رہی تھیں۔ حکومت سخت قوانین نافذ کر کے ہر ایسی انجمن کو حکومت کی بدعنوانیوں کے خلاف احتجاج کرنے سے روکنے میں مصروف تھی۔ جمال الدین افغانی نے حریت کا نعرہ لگایا۔ اپنی تحریر اور تقریر کے ذریعے عوام و خواص کے دلوں میں آزادی کی صحیح تڑپ پیدا کر دی۔ غیر ملکی اقتدار کا جوا اتار پھینکنے کے لیے انہیں سر دھڑ کی بازی لگانے کو ابھارا، مصر کی سب سے قدیم اور دنیائے اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی جامع ازہر کے بہت سے طلباء ان کے ساتھ ہو گئے چنانچہ انہوں نے ایک سیاسی جماعت بنالی۔ جب اسماعیل پاشا کا بیٹا توفیق پاشا حکمراں بنا تو اس نے جمال الدین افغانی کو اپنی حکومت کے لیے خطرہ تصور کرتے ہوئے انہیں ملک بدر کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ بعد ازاں کئی اور مصری رہنما ملک سے نکالے گئے۔

جمال الدین افغانی مصر سے نکل کر پیرس پہنچے۔ وہاں سے ایک اخبار نکالا۔ جس کے ذریعے اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرتے تھے۔ انہوں نے جس بات کا زیادہ پروپیگنڈا کیا وہ یہ تھی کہ یورپ کی قومیں حرص و آز کا مجسمہ ہیں یہ قومیں دوست بن کر دوسرے ملکوں میں جاتی ہیں۔ میٹھی میٹھی باتوں سے وہاں کے باشندوں کو پھانس لیتی ہیں کہیں وہ بادشاہ کی محافظ بن کر آتی ہیں۔ کہیں اپنی آمد کا باعث ملک کی مالی حالت سدھارنا بتاتی ہیں۔ کہیں حکومت کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے مہمان بنتی ہیں۔ غرض جہاں جاتی ہیں، اسی طریقے سے جاتی ہیں۔ مگر جلد ہی ملک کی سیاست اور حکومت پر اختیار در

قبضہ حاصل کر لیتی ہیں۔

جمال الدین افغانی کی ایسی تحریروں نے مصری نوجوانوں میں سیاسی بیداری کی روح دوڑا دی۔ مصر کو انگریزی اقتدار سے چھڑانے کے لیے جمال الدین افغانی نے انگلستان کی پارلیمنٹ کے کئی وزراء سے ملاقاتیں کیں۔ اس وقت گلیڈسٹون انگلستان کا وزیر اعظم تھا جو ملکوں کی آزادی کے حق میں تھا مگر مصر سے انگریزوں کا انخلا اسے قبول نہ ہوا۔ انگریز بدستور مصر کے سیاہ وسفید کے مالک بنے رہے۔

مصر برطانوی تصرف میں

جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو برطانیہ نے مصر کو ملک معظم کی حمایت میں لینے کا اعلان کیا۔ مطلب یہ کہ اگر مصر پر حملہ کیا گیا تو برطانیہ مصر کی حمایت کرے گا ملک کے اندرونی نظم ونسق میں کوئی دخل نہ دیا گیا، بلکہ خدیو کو سلطان کا لقب دیا گیا اور اس امر کی وضاحت کی گئی کہ برطانیہ کی یہ سرپرستی اور حمایت صرف جنگ کی مدت تک کے لیے ہے مصر کی برطانوی سلطنت کا جزو بنانا مقصود نہیں، بلکہ یہ آزاد رہے گا۔

اس برطانوی اعلان کے باوجود جنگ کے دوران مصریوں سے برطانیہ نے ہر قسم کی فوجی اور غیر فوجی خدمات لیں۔ لڑائی میں خاصا نقصان بھی اٹھایا۔ مصر کی فوجوں کو ترکوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو مصریوں کی آس بندھی کہ اب اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا مگر جب صلح کانفرنس میں مصری نمائندہ طلب کرنے سے انکار کیا گیا تو مصریوں نے محسوس کر لیا کہ اب وہ برطانیہ کے اقتدار کے نیچے دب چکے ہیں اور آزادی کی نعمت سے علانیہ طور پر محروم کر دیئے گئے ہیں۔

سعد زاغلول پاشا

انگریزوں کے اس طرز عمل نے مصریوں کی اس جنگ آزادی کا افتتاح کیا، جس میں سعد زاغلول پاشا مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مصر کا یہ بطل حریت ۱۸۶۰ء میں ایک کسان کے گھرانے میں پیدا ہوا۔ جامعہ ازہر میں تعلیم پائی ۱۸۸۲ء میں عرابی پاشا کی تحریک آزادی میں پیش پیش رہے۔ اسی سلسلہ میں گرفتار اور پھر رہا ہوئے۔ بعد ازاں وکالت شروع کی۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کے باعث جج بنے، پھر مصر کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ پھر عدل و انصاف کا قلمدان انہیں سونپا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد حب الوطنی اور حریت پسندی کے جرم میں دو مرتبہ انہیں جلاوطن کیا گیا۔ ان کی "وفد پارٹی" کا مقابلہ پارلیمانی انتخاب میں کوئی دوسری پارٹی نہ کر سکی۔ اور ہر مرتبہ یہی وزیر اعظم بنے، مگر ہر مرتبہ برطانوی مداخلت کے باعث انہیں اس عہدہ سے محروم کیا گیا اور وہ استعفیٰ دینے پر مجبور ہوئے۔

سعد زاغلول پاشا کی "وفد پارٹی" نے مطالبہ آزادی منوانے کے لیے مصر میں ایک تہلکہ برپا کر دیا۔ جس سے گھبرا کر برطانیہ نے مارچ ۱۹۱۹ء میں زاغلول پاشا کو ان کے رفیقوں سمیت گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا۔ اس پر مصری اور برہم ہوئے۔ چونکہ لیڈر گرفتار ہو چکے تھے اور عوام سے باضابطہ طریق پر کام لینے والا کوئی باقی نہ رہا تھا اس لیے توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑی جانے لگیں۔ ٹیلیفون کے تار کاٹے جانے لگے۔ ہر برطانوی مستقر دنیا سے منقطع کر دیا گیا۔

اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے لارڈ ایلن بی مصر آیا یہ جنگ عظیم کا وہ کامیاب کمانڈر تھا جس نے ترکوں کو فلسطین میں شکست دی تھی۔ اس نے تشدد کے بجائے مفاہمت کی پالیسی اختیار کی۔ زاغلول پاشا اور اس کے تینوں رفیقوں کو جلاوطنی سے واپس بلا لیا۔ ایک کانفرنس کی جس میں امن بحال کرنے کے لیے مشورے کیے گئے، پھر اعلان کیا کہ برطانیہ مصر کے مطالبہ آزادی پر غور کرنے کو تیار ہے۔ بعد ازاں ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کو برطانیہ نے مصر کو خود مختار مطلق آزاد ملک تسلیم کر لیا اور شرائط یہ لگائیں کہ مندرجہ ذیل امور برطانوی اختیار میں ہوں گے۔

۱۔ سلطنت برطانیہ کے مصری ذرائع آمد و رفت کی نگرانی۔
۲۔ مصر پر حملہ یا مداخلت کرنے والی ہر بدیسی طاقت کا مقابلہ خواہ براہ راست ہو یا بالواسطہ۔
۳۔ اقلیتوں کی حفاظت اور خارجی معاملات کا تصفیہ۔
۴۔ سوڈان کی حکومت۔

یہ شرائط مصریوں کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ تاہم اس اعلان آزادی کے بعد اپریل ۱۹۲۳ء میں ایک جمہوری دستور حکومت کا اعلان ہوا۔ اس دستور کے مطابق پارلیمنٹ کا جو پہلا انتخاب ہوا۔ اس میں وفد پارٹی کے نمائندے بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور سعد زاغلول پاشا نے وزیر اعظم کی حیثیت سے وزارت بنائی۔

چونکہ برطانوی اعلان آزادی جن شرائط کے ساتھ مربوط تھا، وہ مصریوں کو کسی طرح قبول نہ تھیں، اس لیے عوام اس آزادی پر کاملاً مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ ملک میں انگریزوں کے خلاف شورش کا طوفان پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں مصری افواج کا کمانڈر انچیف اور سوڈان کا گورنر جنرل مارے گئے۔ پھر استبداد کا دور شروع ہوا۔ شاہ فواد نے حکومت براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس خود مختارانہ دور میں مصریوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے ۱۹۲۶ء تک یہی کیفیت رہی پھر الیکشن آیا تو مصری آئین کے خلاف وفد پارٹی کو حکومت کی مسندوں سے دور رکھا گیا۔ ۱۹۲۷ء میں سعد زاغلول پاشا کا انتقال ہو گیا۔

۱۹۲۹ء میں برطانیہ نے مصر سے ایک مفاہمت کی۔ مگر اس کی شرائط بھی مصری پارلیمنٹ نے مسترد کر دیں جس پر شاہ فواد نے ۱۹۲۳ء کے آئین کو منسوخ کر کے پارلیمنٹ کو معطل کر دیا۔ اب عوام کا حکومت کے ایوان میں کوئی دخل نہ رہا۔

شاہ فواد نے صدقی پاشا کو وزیر اعظم بنا لیا اور عوام کو پابندیوں پر جکڑ کر ان کی سیاسی بیداری کو فنا کرنے کی کوششیں کیں۔

نحاس پاشا

اب وفد پارٹی کی قیادت نحاس پاشا کرنے لگے۔ جگہ جگہ بلوے ہونے لگے۔ آزادی کی تحریک پھر پورے جوش و خروش سے ابھر آئی۔ آخر ۱۹۳۶ء میں برطانیہ سے نئے معاہدے ہوئے جن کی رو سے طے پایا کہ

۱۔ برطانیہ مصر سے اپنی فوجیں نکال لے گا۔
۲۔ جب تک مصری خود نہر سویز کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ نہر کی حفاظت کے لیے کچھ برطانوی فوج مصر میں رہے گی۔
۳۔ سوڈان کی حکومت انگریزوں کے پاس رہے گی۔
۴۔ مالی قوانین کے سلسلے میں حکومت مصر ایسا کوئی قانون پاس نہ کرے گی جس کا اطلاق غیر مصریوں پر ہو۔

۱۹۳۶ء میں فواد مرا تو اس کا بیٹا شاہ فاروق تخت نشین ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں جب برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو مندرجہ بالا معاہدے کے مطابق مصر کے تعلقات جرمنی اور اس کے حلیف اٹلی سے منقطع کرا دیئے گئے۔ مصر میں اٹلی کا جو سرمایہ لگا ہوا تھا وہ ضبط کر لیا گیا اور سترہ ہزار کے قریب جرمنی اور اطالوی جو مصر میں مقیم تھے، نظر بند کر دیئے گئے۔ پھر وہاں فوجی قانون نافذ کیا گیا۔ برطانیہ کی کوششوں کے باوجود مصریوں نے اختتام جنگ سے چند ماہ پیشتر تک اپنی غیر جانبداری کو ہاتھ

سے نہ جانے دیا۔

جمہوریت

جنگ کے بعد مصر کے انتظامی حالات ابتر ہوتے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ فاروق کو ملکی معاملات سے زیادہ دلچسپی نہ رہی تھی اور وہ اپنے آرام و راحت یا اپنے چند درباریوں ہی کو خوش رکھنے کی فکر میں رہتا تھا ۱۹۵۲ء میں یکایک ایک فوجی دستے نے انقلاب کا علم بلند کیا۔ جس کے لیڈر جنرل نجیب اور جمال عبدالناصر تھے۔ ایک ہی شب میں قاہرہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ پھر فاروق کو ملک سے رخصت کر دیا گیا اور مبران حکومت کا اعلان ہوگیا۔ کچھ مدت جنرل نجیب صدر رہے۔ پھر وہ الگ ہوئے تو پورا کاروبار جمال عبدالناصر نے سنبھال لیا ۱۹۵۶ء میں دستور بنا اور جمال عبدالناصر کو صدر جمہوریت منتخب کر لیا گیا۔ اس نے نہر سویز کو قومی ملکیت بنانے کا اعلان کیا۔ انگریز اور فرانسیسی اس پر بہت بگڑے۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں اسرائیل، برطانیہ اور فرانس نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا۔ لیکن اقوام عالم نے اس پر ایسی شدید نفرت اور غم و غصہ کا اظہار کیا کہ برطانیہ اور فرانس کو وہم و گمان بھی نہ تھا انجمن اقوام متحدہ نے انہیں واپسی پر مجبور کر دیا ——— بعد ازاں مصر اور شام کے اتحاد کا اعلان ہوگیا۔

باب ۲۳ فلسطین

تمہید

فلسطین دس ہزار مربع میل کا ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں، تینوں کے نزدیک اس لیے مذہبی تقدس کا درجہ رکھتا ہے کہ اس میں بیت المقدس (یروشلم) واقع ہے جو ان تینوں مذاہب کے نزدیک ایک مقدس مقام ہے۔ چنانچہ ہر قوم نے اس پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کی اور گیارھویں صدی سے چودھویں صدی تک یہ علاقہ صلیبی جنگوں کا مرکز بنا رہا۔ یہ جنگیں اس پاپائیت کا بھی نتیجہ تھیں جس کے اثرات اہل یورپ کے دل و دماغ پر چھا چکے تھے۔ یورپ کے کونے کونے سے عیسائی جمع ہو کر یہاں آتے اور صلیبی جنگوں میں حصہ لیتے رہے۔ رچرڈ شاہ انگلستان کی سرکردگی میں دنیا بھر کے عیسائیوں نے جمع ہو کر سلطان صلاح الدین کے خلاف نبرد آزمائیاں کیں۔ بالآخر سلطان نے انہیں پیہم شکستیں دے کر ان کا رخ پھیر دیا۔ صلیبی جنگوں کی تباہی ختم ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ یورپ میں تحریک اصلاح مذہب نے پاپائیت کے اقتدار کو ختم کر کے ان ذہنیتوں کو بھی بدل دیا تھا جو پاپائیت کے باعث یورپ کے عیسائیوں میں پیدا ہو چکی تھیں۔

یہودیت

یہودی ایک نسل کا نام ہے یعنی بنی اسرائیل کی اولاد۔ جنہیں حضرت موسیٰ نے فرعون کے پنجہ استبداد سے نجات دلائی تھی۔ یہودی چونکہ کسی خاص ملک میں نہیں بستے۔ بلکہ وہ ہر جگہ بین الاقوامی طور پر آباد ہیں۔ اس لیے قومیت و وطنیت کی تحریکوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ اسی بنا پر ہر قوم انہیں ناپسند کرتی ہے۔ چنانچہ یہودیوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ انہیں بھی کسی جگہ کو اپنا وطن بنا کر رہنا چاہیے ۱۸۹۷ء میں انہوں نے طے کیا کہ فلسطین کو اپنا گھر بنانا چاہیے اس مقصد کے لیے یروشلم کی ایک پہاڑی صیہون کے نام پر یہودیوں نے صیہونیت تحریک چلائی اور اس کے لیے ممبر بھرتی کرنے شروع کر دیے۔

رفتہ رفتہ یہودیوں نے فلسطین میں زمینیں خریدنی شروع کر دیں اور کچھ یہودی مستقل طور پر فلسطین پر آباد ہوگئے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران یہودیوں نے اتحادیوں سے سازباز کی کہ اگر فلسطین کو ان کا وطن بنا دیا جائے تو وہ جنگ میں اتحادیوں کی مالی امداد کریں گے۔ اتحادیوں نے اسے قبول کر لیا اور یہودی انہیں مالی مدد دیتے رہے جب اتحادیوں نے فلسطین فتح کر لیا تو اعلان کر دیا گیا کہ فلسطین کو یہودیوں کا مسکن بنا دیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ عربوں کے معاشی و سیاسی مفاد کو نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔

عرب یہودی کش مکش

۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو فلسطین شام سے علیحدہ کر کے برطانوی انتداب میں دے دیا گیا عربوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ہوئے ہوئے لوٹ مار ہوئی برطانیہ نے شورش کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی، پھر ۱۹۲۳ء میں اعلان ہوا کہ اہل فلسطین کی ایک وزارت بنائی جائے گی۔ اس وزارت کے لیے عام انتخابات کیے گئے، مگر عربوں نے اس کا بھی بائیکاٹ کر دیا۔

۱۹۲۵ء میں برطانیہ کی طرف سے فلسطین کا جو نیا ہائی کمشنر مقرر ہوا، اس نے ۱۹۲۶ء میں ایک آرڈیننس کے ذریعے یہودیوں کو بحیثیت قوم فلسطین میں اپنی تنظیم کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے علاوہ یہودی اکثریت کے علاقوں کو داخلی خود مختاری بھی عطا کر دی۔ ان مراعات کے طفیل فلسطین میں یہودیوں کی حیثیت مضبوط ہوگئی اور ان کے حوصلے بہت بلند ہوگئے۔ مگر ہائی کمشنر کے یہودیوں سے تنگ آ کر ۱۹۲۹ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ برطانوی حکومت نے بھی وقت کی سنگینی کا احساس کر لیا اور سوچا کہ عربوں کی شکایت دور کیے بغیر فلسطین میں امن قائم کرنا مشکل ہے چنانچہ اب تحقیقاتی کمیشن بھیجا گیا۔ اسی کی تحقیقات کے نتیجے میں پارلیمنٹ نے ایک اعلان شائع کیا جس میں کہا گیا کہ فلسطین میں یہودیوں کی آمد کے سیلاب پر پابندی لگا دی جائے گی اور ان کا داخلہ محدود کر دیا جائے گا۔

یہودیوں نے اس اعلان کے خلاف احتجاج کیا جس سے برطانوی حکومت دب گئی اور برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کے بیان نے برطانیہ کے پہلے اعلان کو کالعدم کر دیا۔

دنیا بھر کے یہودیوں کی صیہونی انجمن (ZIONIST ORGANISATON) کو حکومت برطانیہ نے یہودیوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا۔ اس جماعت کی مدد سے دنیا کے مختلف خطوں سے یہودی فلسطین میں آ کر بسنے لگے۔ ۱۹۲۲ء کے اعداد و شمار کی رو سے فلسطین میں ان کی آبادی ایک لاکھ سے بھی کم تھی۔ ۱۹۳۱ء میں دو لاکھ ہوگئی ۱۹۳۵ء میں تین لاکھ اور ۱۹۴۲ء میں پانچ لاکھ سے بھی بڑھ گئی۔

یہودیوں کے اس رویے نے عربوں کو ان کے خلاف محاذ بنانے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ خفیہ اور علانیہ تحریکیں شروع ہوگئیں۔ فلسطین کے طول و عرض میں دہشت انگیزی پھیل گئی۔ آخر ۱۹۳۷ء میں شاہی کمیشن نے تحقیقات کے بعد اپنی جو رپورٹ حکومت برطانیہ کو بھیجی اس میں لکھا کہ فلسطین کی اقتصادی حالت کے پیش نظر یہودیوں کی بے روک آمد پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے اور ایک محدود تعداد یہاں بسنی چاہیے لیکن عربوں کا مطالبہ یہ تھا کہ فلسطین کو فوراً آزاد کیا جائے اور یہودیوں کو بسانے کا مسئلہ صرف مقامی لوگ طے کریں۔ مگر یہودیوں نے فلسطین کی آزادی کی مخالفت کی اور اپنے داخلے پر پابندی لگانے کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔

تقسیم کا منصوبہ

آزادی کے سلسلے میں یہودیوں نے یہ تجویز پیش کی کہ یہودی اکثریت کے علاقوں کو فلسطین سے علیحدہ حکومت بنا دیا جائے۔ عربوں نے یہودیوں کی اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ مگر برطانیہ نے اسے سراہا۔ ۱۹۳۸ء میں اس مسئلے کے حل کے لیے ایک اور کمیشن بھیجا گیا۔ جس نے اپنی رپورٹ میں یہودیوں کی طرف سے

پیش ہونے والی تجویز کو پسندیدہ قرار دیا۔

یہ تقسیم چونکہ فوری طور پر ممکن العمل نہ تھی، اس لیے ایک مبہم سی پالیسی کا اعلان کر دیا گیا پھر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگِ عظیم چھڑی تو عرب لیڈر امین الحسینی کے کہنے پر فلسطین کے معاملے میں عربوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

نظم و نسق

حکومت برطانیہ کے زیر انتداب اہل فلسطین کو ایک حد تک آزادی تھی۔ کمیٹیوں کو بجٹ، ٹیکس یا زرِ ضمانت کی منظوری حکومت برطانیہ سے لینی پڑتی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے مذہبی امور فیصلہ کرنے کے لیے شرعی عدالتیں قائم تھیں۔ قاضیوں کی اپیل عدالت عالیہ کے صدر کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ جو مفتی اعظم کہلاتا تھا۔ یہودیوں کے مذہبی معاملات ان کے علماء طے کرتے تھے۔ دونوں قوموں کے تمام فوجداری اور دیوانی مسائل انگریزی عدالتوں میں طے پاتے تھے۔ انگریزی، عربی اور عبرانی تینوں دفتری زبانیں تھیں۔

دو سال کی مسلسل سکونت کے بعد کوئی شخص فلسطین کا باشندہ بن سکتا تھا ۱۹۴۴ء کے اعداد و شمار کے لحاظ سے کل آبادی سولہ لاکھ تھی جس میں ایک لاکھ عیسائی تھے۔ معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے مسلمان اور عیسائی ایک تھے۔ زبان بھی دونوں کی عربی تھی۔ دونوں کے مدارس میں ذریعہ تعلیم بھی عربی تھا۔ یہودیوں کا ذریعہ تعلیم عبرانی تھا۔

تل ابیب، حیفہ اور یافہ میں یہودی آبادی زیادہ تھی۔

تقسیم

۱۹۴۸ء میں فلسطین کو تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصے میں یہودیوں نے اسرائیل کے نام سے اپنی حکومت قائم کر لی۔ دوسرا حصہ شرقِ اردن سے ملا دیا گیا۔ ایک چھوٹا سا حصہ مصر کو دے دیا گیا۔ اس پر عربوں اور یہودیوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ بہت سے عربوں کو یہودیوں کے علاقے سے جلاوطن کر دیا گیا۔ برطانیہ امریکہ اور فرانس نے اسرائیل کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ اس وقت سے عرب دنیا کو مغربی طاقتوں کے خلاف شکایت چلی آتی ہے اور تمام عرب حکومتیں یہودیوں کی سخت دشمن ہو گئی ہیں۔ عرب کے مسائل میں یہ مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور جب تک یہ عربوں کے اطمینان کے مطابق طے نہ ہو جائے، اس وقت تک شرقِ اوسط میں امن کا قیام مشکل نظر آتا ہے۔ حق و انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان عرب جلا وطنوں کو جن کی تعداد دس لاکھ سے کم نہیں، ان کے گھروں میں آباد کیا جائے اور ان کی جائدادیں واپس دلائی جائیں۔

باب ۲۴ برما

جغرافیائی کیفیت

برما برطانوی ہندوستان کا ایک صوبہ تھا۔ ۱۹۳۷ء میں اسے علیحدہ کر دیا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران یہاں انگریز گورنر مقرر تھا۔ ۱۹۴۲ء میں جاپانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور برما کی حکومت ہندوستان آ گئی۔ ۱۹۴۷ء میں دستور ساز اسمبلی نے برما میں جمہوریت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اگلے سال یعنی ۱۹۴۸ء میں یہاں جمہوریت قائم ہو گئی۔

برما کا رقبہ دو لاکھ چون ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ آٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ رنگون دار الحکومت ہے۔ مانڈلے، بھوسو، مولمین، بسین اور اکیاب مشہور شہر ہیں۔ ایراوتی، سیانگ اور سالوین تین مشہور دریا ہیں جو سیراب کرتے ہیں۔ چاول، جوار، کپاس اور تل یہاں کی مشہور پیداوار ہے۔ معدنیات میں پٹرولیم اور قیمتی پتھر نکلتے ہیں۔ یہاں کے لوگ لکڑی اور ہاتھی دانت تراشنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں چاول کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے جابجا چاول صاف کرنے کے کارخانے قائم ہیں۔ لکڑی کاٹنے کے کارخانے بھی عام ہیں۔

برما اور ملایا کی حدیں پاکستان اور ہندوستان دونوں سے ملتی ہیں مگر نسلی اور جغرافیائی لحاظ سے یہاں کے باشندے اپنے مشرقی پڑوسی چین اور ہند چینی سے زیادہ قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں کو ہمیشہ ہندوستان سے الگ سمجھا گیا۔

سیاسی کوائف

انیسویں صدی میں جب انگریزوں نے اس علاقے کو فتح کیا تو اسے ہندوستان ہی کا ایک صوبہ قرار دے دیا۔ چنانچہ پچاس ساٹھ برس تک برما ہندوستان کا صوبہ سمجھا جاتا رہا۔ برما کے لوگ نسل کے لحاظ سے ہند چینی ہیں اور بدھ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ تہذیب و تمدن میں چین اور ہند چینی سے مشابہت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اہل برما ہمیشہ یہی مطالبہ کرتے رہے کہ ان کے ملک کو ہندوستان سے الگ رکھا جائے۔

۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ نے اصلاحات کی ایک رپورٹ شائع کی جس میں برما کو ہندوستان کے ماتحت رکھنے کی سفارش کی گئی۔ اس پر اہل برما برہم ہوئے آخر تین چار سال کی مسلسل کوششوں اور احتجاج کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۲۳ء میں چند خاص سرکاری محکمے برما وزیروں کے اختیار میں دے دیئے گئے۔

جب ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دینے کا سوال اٹھا تو برما میں بھی تحریک اٹھی کہ برما کو ہندوستان سے الگ کر دیا جائے پھر ۱۹۲۹ء میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو اس نے بھی اپنی رپورٹ میں لکھا کہ برما کو ہندوستان سے الگ کر دیا جائے چنانچہ برما کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک گول میز کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کے فیصلے کے مطابق برما کو ہندوستان سے الگ کر کے اسے جدا آئینی حکومت دے دیا گیا۔

برما کی آزادی

بڑے بڑے پہاڑوں نے برما کو پاکستان اور ہندوستان سے جدا کر رکھا ہے۔ ان پہاڑوں کے باعث برما اور ہندوستان پاکستان کے درمیان آج تک ریلوے کا سلسلہ جاری نہیں ہو سکا اور برما اہل ہند میں تہذیبی اور معاشرتی فرق کے باعث بھی یہی بلند اور ناقابل عبور پہاڑ ہیں۔

جاپان نے نئے نظام کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں برما ملک کا علاقہ شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب جاپانی فوجیں برما کے حدود میں داخل ہوئیں تو اہل برما نے زیادہ شدت سے ان کا مقابلہ نہ کیا تھا بلکہ کئی برمی ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اسی جنگ کے دوران اہل برما میں یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا کہ جاپان کو شکست ہو یا وہ فتح حاصل کرے دونوں صورتوں میں برما کسی کا غلام بن کر نہ رہے بلکہ آزادی حاصل کر کے دم لے گا۔

چنانچہ جاپان کی شکست کے بعد برما میں آزادی کی تحریک نے زیادہ شدت اختیار کر لی۔ برطانیہ نے اس تحریک کو سختی سے دبانے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے یہ پراپیگنڈا کیا کہ برما کی یہ جدوجہد جاپان کی امداد کے بل پر ہو رہی ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے اعتدال پسند لیڈروں کی جو وزارت بنائی تھی۔ عام لوگ اس کے اس قدر خلاف تھے کہ جولائی ۱۹۴۷ء میں مخالف گروہ نے ان ساتوں وزیروں کو ہلاک کر دیا۔

برما کی تاریخ میں یہ واقعہ بڑا ہولناک تھا مگر اس واقعے نے برطانیہ پر واضح کر دیا کہ پچھلے دور کو دوبارہ واپس نہیں لایا جا سکتا چنانچہ تھوڑے ہی عرصے بعد برما کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔

جن لوگوں پر وزراء کے قتل کا شبہ کیا گیا انہیں انگریزوں نے کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی لیکن کارن تھاکن نے اس کے بعد بھی بغاوت کا سلسلہ جاری

رکھا۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ برطانوی تعلقات کے رہے سہے نقوش بھی مٹا دیے جائیں۔ نئی حکومت نے گوریلا دستوں کی ان سرگرمیوں کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ دہشت انگیزی کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

باب ۲۵ جرمنی

جرمن قوم کی برتری

یورپ کی تمام قوموں میں جغرافیائی، نسلی اور معاشرتی اتحاد کے لحاظ سے جرمن قوم سب سے بڑی ہے اور سپاہیانہ خصائص اور مادی قوت کے لحاظ سے بھی یورپ کی دوسری قوموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ روم کے جلیل القدر فرمانروا، سیزر اور آگسٹس سے ٹکر لینے کا فخر بھی اسی قوم کو حاصل ہے۔ مارٹن لوتھر جس نے اصلاح مذہب کی تحریک چلائی، جرمنی ہی کا رہنے والا تھا۔ علمی، فنی، تحقیقی اور سائنسی تخلیقات اور کارناموں کے لحاظ سے بھی جرمنی کو یورپ میں خاص برتری حاصل ہے۔ غرض جرمن اپنے آپ کو یورپ کا معلم اوّل سمجھتے ہیں۔

جرمنی کی کامیابیاں

انیسویں صدی کے اوائل میں جب جمہوریت اور قومیت کے جذبات زیادہ ابھرنے لگے اور صنعتی انقلاب نے یورپ کی کایا پلٹنی شروع کی تو جرمنی نے محسوس کیا کہ فرانس اور برطانیہ کے مقابلے میں جرمنی کی اہمیت کم ہو رہی ہے۔ فرانس اور برطانیہ نے مختلف علاقوں میں کئی نوآبادیاں قائم کریں اور جرمنی ان کے مقابلے میں ایسا نہ کر سکا۔ جمہوری انقلاب کے بعد فرانس نے جرمنی کو اپنا شکار بنانا چاہا۔ چنانچہ جرمنی میں جمہوریت قائم کرنے کے بہانے ۱۸۷۰ء میں فرانس نے جرمنی سے ٹکر لی۔ مگر زبردست شکست کھائی۔ اس جنگ نے جرمنوں میں قومی اتحاد کے جذبات کو اور زیادہ فروغ دیا اور انہوں نے مل کر ایک وسیع جرمن سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء میں ولیم اوّل کو جرمنی کا شہنشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ جرمنی کی حیثیت ایک وفاق کی سی ہو گئی۔ جس میں چھبیس ریاستیں شامل تھیں اور جرمنی کو حکومت کا مرکز قرار دے دیا گیا۔

سمجھوتے اور معاہدے

۱۸۶۶ء میں جرمنی نے آسٹریلیا کو زبردست شکست دی تھی اور وہ بدلہ لینے کی فکر میں تھا۔ مگر فرانس کی شکست نے آسٹریلیا پر واضح کر دیا کہ جرمنی کو شکست دینا آسان نہیں۔ لہٰذا آسٹریا نے یہی مناسب سمجھا کہ جرمنی کے ساتھ تعلقات بہتر بنائے۔ اس مقصد کے لیے آسٹریا اور جرمنی کے بادشاہ ۱۸۷۲ء میں تین دفعہ ملے۔ ۱۸۷۳ء میں زار روس بھی برلن پہنچ گیا اور تینوں میں بات چیت ہوئی۔ زار کو خدشہ تھا کہ کہیں آسٹریا اور جرمنی کے تعلقات اتنے مضبوط نہ ہو جائیں کہ روس کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اسی کانفرنس میں مشرق قریب کے متعلق بات چیت ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ اس وقت جو صورت حال تھی، اسے برقرار رکھا جائے۔

مئی ۱۸۷۳ء میں شہنشاہ جرمنی، پرنس بسمارک اور مالٹکے روس گئے۔ وہاں باہم یہ طے ہوا کہ اگر فریقین میں سے کسی پر کسی یورپی طاقت نے حملہ کیا تو دوسرا فریق دو لاکھ فوج سے اس کی مدد کرے گا۔

جرمنی اور فرانس

روس اور آسٹریا کے درمیان بھی اسی قسم کا سمجھوتہ ہو گیا۔ ان سمجھوتوں کو تین شہنشاہوں کی لیگ (جمعیت) قرار دیا جاتا ہے۔ ان سمجھوتوں کا مقصد یہ تھا کہ آزاد خیال گروہوں کے مقابلے میں بادشاہت کا تحفظ کیا جائے۔ اور اگر جرمنی اور فرانس کے درمیان خطرناک صورت حال پیدا ہو، تو جرمنی کی مدد کی جائے۔

۱۸۷۱ء سے جرمن فوجیں فرانسیسی علاقوں میں مقیم تھیں ۱۸۷۳ء میں ان فوجوں نے تمام فرانسیسی علاقے خالی کر دیئے۔ اب فرانس نے روس کے ساتھ اتحاد کی کوششیں شروع کر دیں۔ اپریل ۱۸۷۵ء میں اخبار "برلن پوسٹ" میں ایک مقالہ شائع ہوا جس کا عنوان تھا "کیا جنگ ہونے والی ہے؟" اس مقالے میں فرانسیسی فوج کے بے نئے قانون کی طرف اشارے کئے گئے تھے اور فرانس میں اس مقالے سے بڑی سراسیمگی پھیلی۔ فرانس نے برطانیہ اور روس سے مدد طلب کی۔ چنانچہ ان دونوں ملکوں نے جرمنی کو متنبہ کیا۔ اب بسمارک نے اندازہ کر لیا کہ شہنشاہوں کی لیگ کمزور ہو گئی ہے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر جرمنی نے جنگ روکنے کے لیے فرانس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو روس اور برطانیہ بھی چپ نہ بیٹھیں گے۔

یہ کشمکشیں اور رقابتیں بڑھتی گئیں۔ فرانس، برطانیہ اور روس جتنا قریب ہوتے گئے جرمنی کے لیے خطرہ اتنا ہی بڑھتا گیا۔ چنانچہ جنگ کو روکنے کے لیے آسٹریا، ہنگری اور ترکی سے رشتۂ اتحاد مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ آخر انیسویں صدی کے اوائل میں یہی رقابتیں جنگ عظیم کا باعث بنیں۔ اس جنگ کا حال ایک باب میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

اس جنگ کے بعد دوسری جنگ عظیم تک جرمنی میں جتنی تبدیلیاں ہوئیں، سب فرانس کی رہین منت ہیں۔ صدر ولسن کے نکات واصولوں نے جرمن عوام کو اپنے آقاؤں سے باغی کر دیا تھا اور قیصر ولیم کی بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت قائم کر لی تھی۔ لیکن جنگ میں جرمنی پر جو ضرب پڑی تھی، اس نے انتظامی حالت بہت خراب کر دی تھی۔ بعض علاقوں میں جداگانہ جمہوریتیں قائم کرنے کا رجحان زور پکڑ گیا۔ فرانس مدت سے رائن لینڈ کے علاقے پر نظر لگائے بیٹھا تھا، وہ اس علاقے کی لوہے اور کوئلے کی کانوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں لینا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے جرمنی پر اتنا بڑا تاوان جنگ لاد دیا جس کا وہ متحمل نہ ہو سکا۔ آخر ۱۱ر جون ۱۹۲۳ء کو فرانس نے رائن لینڈ پر حملہ کر دیا۔ جرمنی کارخانوں کے تمام ڈائریکٹر گرفتار کر لیے گئے اور ہر شے پر فرانس قابض ہو گیا۔ اس سے جرمنی کی حالت اور ابتر ہو گئی مگر تاوان جنگ کا جھگڑا جرمنی اور فرانس کے درمیان بدستور چلتا رہا۔ فرانس نے رائن لینڈ میں ایک الگ جمہوری حکومت بنا دی۔

نومبر ۱۹۲۳ء میں نازی پارٹی کے لیڈر ہٹلر نے جنرل لوڈنڈارف کی مدد سے میونخ میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ مگر اسے قید کر دیا گیا۔ اپریل ۱۹۲۵ء میں جنرل ہنڈن برگ کو جرمنی کا صدر منتخب کیا گیا۔ اسے جرمنی میں بڑی عظمت حاصل تھی۔ نئے صدر کے دور میں جرمنی نے اصلاح و ترقی کا کام شروع کر دیا۔

ستمبر ۱۹۳۰ء کے انتخابات میں نازی پارٹی کو ایک سو سات نشستیں ملیں۔ حالانکہ اس سے قبل کے انتخابات میں اسی پارٹی کو صرف بارہ نشستیں حاصل ہوئی تھیں۔ کمیونسٹوں اور نازیوں کے درمیان تصادم کے واقعات بھی رونما ہوئے۔

۱۹۳۲ء کے انتخابات میں ہنڈن برگ دوبارہ صدر منتخب ہوا۔ اس انتخاب میں ہٹلر بھی امیدوار بنا اور خاصے ووٹ حاصل کیے۔ جولائی ۱۹۳۲ء میں جرمن پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے تو نازی پارٹی نے دو سو تیس نشستیں حاصل کریں۔ ہٹلر کی طاقت مضبوط ہو گئی۔ ہنڈن برگ نے ہٹلر سے درخواست کی کہ وہ فان پاپن کے ماتحت وائس چانسلر کا منصب سنبھال لے، مگر اس نے انکار کر دیا اور پورے اختیارات سنبھالنے کا مطالبہ کیا۔ آخر فان پاپن نے استعفیٰ دے دیا اور ۳۰ نومبر ۱۹۳۲ء کو ہٹلر نے

اس شرط پر چانسلر کا عہدہ قبول کیا کہ اسے پورے اختیارات دے دیئے جائیں۔ آخر ۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو اس کا مطالبہ مان لیا گیا اور اسے چانسلر یعنی وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ فان نے نائب وزیر اعظم کا منصب سنبھالا۔

آئندہ انتخابات میں نازیوں نے پارلیمنٹ کی ۲۸۸ نشستیں حاصل کیں اور چوالیس فیصد ووٹ ہٹلر نے حاصل کیے۔ کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون قرار دے دی گئی اور ہٹلر جرمنی کا مختار کل بن گیا اور پوری انتظامی مشینری نئے سانچے میں ڈھلنے لگی۔ ہٹلر نے اپنے مخالفوں کو مختلف الزامات میں قتل کر دیا ۲ اگست کو ہنڈن برگ نے وفات پا لی تو ہٹلر نے صدارت کا عہدہ بھی سنبھال لیا اور فیوہرر یعنی لیڈر کا لقب اختیار کیا۔

ہٹلر کے دور مختاری میں جو واقعات پیش آئے۔ ان کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۵ء میں سار[1] کے علاقے میں جمعیت الاقوام نے رائے عامہ کا انتظام کیا۔ جرمنی کے الحاق کے حق میں نوے فیصد ووٹ ڈالے۔ چنانچہ یہ علاقہ جرمنی کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ہٹلر نے عہد نامہ وریائی کی ان تمام دفعات سے اختلاف کیا۔ جن کے تحت جرمنی کی فوجی حیثیت پر پابندیاں عائد کر دی گئیں تھیں۔ جرمنی نے لوکارنو کانفرنس کی مذمت کی۔ رائن لینڈ پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے ہسپانیہ میں فرانکو کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں جرمنی نے آسٹریا کو جرمنی میں شامل کر لیا اس طرح ساٹھ لاکھ مزید جرمن نازی جرمنی میں شامل ہو گئے۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ تفصیلات اس جنگ کے علیحدہ باب میں دیکھیے۔

باب ۲۶ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ

جغرافیائی حالات

آسٹریلیا دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے اور سب سے چھوٹا براعظم ہے۔ جو ایشیا کے جنوب مشرق میں واقع ہے اور بحرالکاہل و بحر ہند کے پانیوں سے گھرا ہوا ہے رقبہ ۲۹ لاکھ ۷۰ ہزار پانچ سو اکیاسی مربع میل اور آبادی ۴۰ لاکھ سے زائد ہے۔

یہ براعظم ۱۷۷۰ء میں جہازران کیپٹن کک نے دریافت کیا۔ اس وقت اس کی زرخیزی کا کسی کو علم نہ تھا اور اسے ویران اور بنجر براعظم جان کر اہل برطانیہ ان قیدیوں کو جنہیں سزا دینا مقصود تھا۔ یہاں بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کی زرخیزی کا سراغ اس وقت لگا جب ۱۸۵۱ء میں یہاں سونے کی کانیں دریافت ہوئیں۔ تب دوسرے ملکوں سے لوگ خود بخود یہاں آکر آباد ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں خوب آبادی ہو گئی۔ زراعت اور کھیتی باڑی کے باعث پیداوار اور زرخیزی بڑھنے لگی۔ یہاں بہترین چراگاہیں ہیں جن پر مویشی اور بکریاں خوب پلتی ہیں۔ اون، دودھ، مکھن اور پنیر کی تجارت نے آسٹریلیا کو دنیا بھر میں مشہور کر دیا۔ اون کی پیداوار کے لحاظ سے آسٹریلیا دنیا میں دوسرے درجے پر ہے۔ آسٹریلیا کے جانور دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ کنگرو یہاں کا خاص جانور ہے جس کی چھاتی کے نیچے ایک تھیلی سی بنی ہوتی ہے، جس میں یہ اپنے بچے اٹھائے پھرتا ہے۔ بچے اسی تھیلی میں پڑے دودھ پیتے رہتے ہیں تاوقتیکہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔

نوآبادیاں

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی تعداد چند لاکھ سے زیادہ نہیں جب انگریزوں نے یہاں قدم رکھا اور نوآبادیاں بسائیں تو ان میں آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کو سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ گورے اور کالے کا نسلی امتیاز پہلے پہل آسٹریلیا ہی میں پیدا ہوا اور آج تک یہ پالیسی قائم ہے۔ آسٹریلیا کی لاکھوں مربع میل زمین خالی پڑی تھی، مگر جب کبھی انڈونیشیا، ہند، چینی یا دوسرے ایشیائی ممالک کے باشندوں کی نظریں اس ملک کی طرف اٹھیں اور انہوں نے اس میں آباد ہونا چاہا۔ انگریزوں نے انہیں اس امر کی اجازت نہ دی اور اس براعظم کی سرزمین کے علاوہ اس کے تمام زرعی اور معدنی وسائل کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ غرض آسٹریلیا کی سیاست شروع ہی سے دو اصولوں کے تابع ہے۔ ایک یہ کہ آسٹریلیا میں صرف گوری نسل کو آباد ہونے دیا جائے۔ کسی دوسری نسل اور رنگ کے آدمی کو یہاں نہ گھسنے دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ گوروں کی آبادی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے تاکہ ملک اپنے دفاع کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنا سکے۔ اس مقصد کے لیے صرف یورپ امریکہ کے نوآبادکاروں کو یہاں بسایا جاتا ہے۔

شروع میں آسٹریلیا براہ راست برطانیہ کا مقبوضہ سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں دولت مشترکہ کا نیا نظام نافذ کیا گیا تو آسٹریلیا کو بھی داخلی و خارجی خود اختیاری دی گئی۔ اب آسٹریلیا چھ ریاستوں کی وفاقی یونین اور دولت مشترکہ میں شامل ہے۔ چھ ریاستوں کے نام یہ ہیں۔ نیو ساؤتھ ویلز، وکٹوریہ، کوئنز لینڈ، تسمانیہ، مغربی آسٹریلیا، جنوبی آسٹریلیا، کیپرا دارالحکومت ہے۔

نیوزی لینڈ

نیوزی لینڈ کا جزیرہ آسٹریلیا سے بارہ سو میل مشرق میں واقع ہے۔ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ شمالی نیوزی لینڈ اور جنوبی نیوزی لینڈ۔ کل رقبہ ایک لاکھ چھبیس ہزار مربع میل کے قریب اور آبادی تقریباً ساڑھے اٹھارہ لاکھ ہے جس میں ستر ہزار کے قریب قدیم نسل کے باشندے ہیں۔

نیوزی لینڈ کو ۱۶۴۲ء میں ڈنمارک کے ایک جہازران تسمان نے دریافت کیا اسی لیے اس جزیرے کو نیوزی لینڈ کا نام دیا مگر اس کے بعد یورپ سے یہاں آباد ہونے کے لیے کوئی نہ آیا۔ نوآبادی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب کیپٹن کک یہاں پہنچا۔ کک کے بعد برطانوی پادریوں نے سب سے پہلے نیوزی لینڈ کا رخ کیا اور یہاں آکر آباد ہوئے ۱۸۶۱ء میں جنوبی جزیرے میں سونے کی کانیں ملیں تو بھاری تعداد میں یورپ سے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ پھر آسٹریلیا کی طرح نیوزی لینڈ میں بھی نوآبادیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

نیوزی لینڈ کو بھی آسٹریلیا کی طرح درجہ نوآبادیات حاصل ہے اور یہاں بھی سیاست کا نقطۂ نگاہ وہی ہے جو آسٹریلیا میں ہے یعنی سفید نسل کے علاوہ کسی اور کو یہاں نہ بسنے دیا جائے۔ جنوبی جزیرہ بڑا ہے مگر آبادی شمالی جزیرے میں زیادہ ہے

---

[1] سار دراصل فرانس اور جرمنی کی سرحد پر ایک صنعتی علاقے کا نام ہے جس کے متعلق عدم تصفیہ کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تعلقات دیر سے خراب چلے آتے تھے۔ یہ علاقہ لوہے اور کوئلے کی کانوں کے باعث بہت مشہور ہے۔ فرانس کو ہمیشہ یہ خطرہ رہا کہ اگر یہ جرمنی کے قبضے میں چلا گیا تو اس کی طاقت بہت مضبوط ہو جائے گی چنانچہ ۱۹۲۰ء میں اس علاقے کو پندرہ برس کے لیے لیگ آف نیشنز کے سپرد کر دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں یہاں عام رائے شماری ہوئی اور مقامی باشندوں نے جرمنی سے الحاق کا فیصلہ کیا مگر ۱۹۴۶ء کی رائے شماری میں سارے لوگوں نے فرانس کے ساتھ اقتصادی الحاق کی حمایت کی جسے جرمنی نے تسلیم نہ کیا اس علاقے کا رقبہ ۷۴۴ مربع میل ہے اور دوسری جنگ عظیم سے قبل اس کی آبادی ۸½ لاکھ کے قریب تھی۔ بعد ازاں ایک نیا معاہدہ ہوا جس میں جرمنی نے فرانس کے بہت پرانے مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے دریائے موسیل سے نکلنے والی نہروں میں اضافہ کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔

اور دو بڑے شہر بھی شمالی جزیرے ہی میں واقع ہیں۔
نیوزی لینڈ میں برطانوی گورنر جنرل رہتا ہے۔

باب ۲۷ — امریکہ

۱۴۹۲ء تک امریکہ کے متعلق دنیا کو کچھ علم نہ تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ بحر اوقیانوس کے اس پار ایک سرسبز و شاداب ملک بھی موجود ہے، جس کا رقبہ ایشیا کے برابر ہے اور قطب شمالی اور قطب جنوبی تک پھیلا ہوا ہے۔

۱۴۹۲ء میں کرسٹوفر کولمبس نے پہلی بار اس کے متعلق انکشاف کیا۔ امریکہ کے بعض ٹکڑے اس نے دریافت کیے۔ پھر پورے علاقے کا سراغ لگایا گیا۔ یہاں تک کہ سترھویں صدی میں ملک کا چپہ چپہ دریافت کر لیا گیا اور برطانوی نوآبادکار یہاں آکر بسنے لگے۔

۱۷۷۶ء تک یہ ملک براہ راست انگلستان کے ماتحت تھا۔ پھر ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی جس نے امریکہ کو انگلستان کی غلامی سے آزاد کرنے کا نعرہ لگایا۔ اس اعلان آزادی کے ساتھ اعلانِ جنگ بھی ناگزیر تھا۔ چنانچہ ایک عرصے تک اہل برطانیہ اور امریکی نوآبادکاروں کے درمیان ہلاکت خیز جنگ جاری رہی۔ بالآخر اہل امریکہ کو فتح ہوئی اور ۱۷۸۹ء میں جارج واشنگٹن کو آزاد امریکی جمہوریت کا پہلا صدر بنایا گیا۔

انقلاب امریکہ

جنگ آزادی کے دوران ہی امریکیوں میں باہمی رقابتیں بھی شروع ہو گئیں۔ بڑے بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں کی خواہش تھی کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں رہے اور عوام کو حکومت کے کاروبار میں کوئی دخل حاصل نہ ہو۔ یہ کشمکش حصولِ آزادی کے بعد بھی جاری رہی اور عرصے تک امریکہ میں خانہ جنگی کا بازار گرم رہا۔ بالآخر ایک صدی بعد ۱۸۶۵ء میں یہ گرم بازاری ختم ہوئی۔

امریکہ شاہراہِ ترقی پر

امریکہ نے سیاسی نظام وفاق بنایا اور علاقوں کو تقسیم کر کے ریاستیں بنائیں جو اپنے داخلی معاملات میں خود مختار رہتیں اور مرکزی فیڈریشن سے تعلق توڑ لینے کا حق بھی رکھتی ہیں۔ ان ریاستوں کی تعداد آج اڑتالیس ہے۔ دفاع، غیر ملکی تعلقات، خارجی معاملات، ریلوے اور ڈاک وغیرہ کے مسائل مرکز کے ہاتھ میں رہے۔ صدر کی میعاد چار سال رکھی گئی، جس کا انتخاب براہ راست عام ووٹر کرتے تھے۔ غرض پورے ملک کو ایک مضبوط مرکز کے ساتھ باندھ دیا گیا جس کے نتیجے میں ملک کی پوری آبادی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئی۔ قدرتی ذخائر کی مدد سے امریکہ نے معاشی اور اقتصادی لحاظ سے خوب ترقی کی۔ ملک بھر میں ریلوں کا جال بچھ گیا۔ سینکڑوں قسم کے کارخانے کھل گئے۔ اسلحہ سازی میں اہل امریکہ نے کمال کر دکھایا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے وقت امریکہ کا شمار دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں میں ہوتا تھا۔ امریکہ دنیا بھر کا سامان بنانے کی بڑی فیکٹری بن گیا۔

پہلی جنگ عظیم اور امریکہ

۱۹۱۷ء میں امریکہ نے بھی جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور اس طرح جنگ عظیم میں ایک فریق کی حیثیت اختیار کر لی۔ آسٹریلیا اور ہنگری سے سفارتی تعلقات توڑ لیے۔ ترکی سے بھی تعلق منقطع کر لیا۔ اکیس سے اکتیس سال تک کے باشندوں کی عام بھرتی شروع ہو گئی اور پچانوے لاکھ چھیاسی ہزار افراد بھرتی کیے گئے۔ ۲۶ جون ۱۹۱۷ء کو پہلا فوجی ڈویژن فرانس بھیجا۔ ایک جنگی بورڈ بنایا جسے تمام جنگی سامان مہیا کرنے کے اختیارات دیے گئے۔ ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو امریکہ کے صدر وڈرو ولسن نے اپنے چودہ نکات پیش کیے، جن میں امریکہ کے مقاصد جنگ کا اعلان کیا گیا تھا اور پچاس کروڑ ڈالر کے سرمائے سے ایک ماری کمیشن قائم کیا گیا۔

جنگ کے دوران امریکی فوجوں نے چھ زبردست حملوں میں حصہ لیا جن میں دو حملوں کا پورا بوجھ امریکی فوجوں پر پڑا۔ ان حملوں میں بارہ لاکھ امریکی سپاہیوں نے حصہ لیا۔ جنگ کے محاذ پر امریکی سرگرمیوں کی تفصیل جنگ عظیم کے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد

جنگ کے دوران امریکی ریلوں کا انتظام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جنگ کے اختتام پر (مارچ ۱۹۲۰ء) یہ تمام ریلیں مالکوں کے حوالے کر دی گئیں۔ اسی سال نیویارک اور سان فرانسسکو کے درمیان ہوائی ڈاک کا سلسلہ جاری کیا گیا اور ریڈیو کے ذریعے نشر و اشاعت کا سلسلہ عمل میں لایا گیا۔

وارن ہارڈنگ امریکہ کا انتیسواں صدر منتخب ہوا۔ بحری اسلحہ کی تخفیف کے لیے واشنگٹن میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں چار طاقتوں کے معاہدے کی اور بعد ازاں پانچ طاقتوں کے بحری معاہدہ کی تصدیق ہوئی۔ جنگ کے دوران امریکہ نے مختلف طاقتوں کو دس ارب پچیس کروڑ ڈالر قرضہ دیا تھا۔ اب اس رقم کی واپسی کے متعلق فیصلہ کیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں ہارڈنگ نے وفات پائی تو اس کی جگہ کولج کو عارضی صدر بنایا گیا پھر ۱۹۲۴ء کے انتخابات میں اسے مستقل صدر چن لیا گیا۔

مارچ ۱۹۳۳ء کو فرینکلن روزویلٹ نے صدارت کا منصب سنبھالا۔ اس کے زمانے میں دنیا کی اقتصادی حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ روزویلٹ نے مختلف قسم کے اصلاحی پروگرام اور قوانین بنائے۔ جن کے طفیل بیشتر ملکوں کی حالت اچھی ہو گئی۔ وادی ٹینیسی کی مشہور سکیم بھی انہیں اصلاحی سکیموں میں سے ایک ہے، جو امریکہ کا بہت بڑا تعمیری کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

۱۹۳۶ء کے انتخابات میں دوبارہ بھاری اکثریت سے روزویلٹ صدر منتخب ہوا۔ اس مرتبہ امریکہ میں بہت سی ہڑتالیں ہوئیں مگر صدر نے بڑی خوش اسلوبی سے اصلاحی اور تعمیری کاموں کو جاری رکھا۔ ۱۹۳۹ء میں اس نے پچپن کروڑ ڈالر کی رقم دفاعی کاموں کے لیے منظور کرائی۔ فرانس کو بہت سے جنگی جہاز خریدنے کی اجازت دی اور وسیع پیمانے پر جنگی جہاز تعمیر کرائے۔ اس نے سارے یورپ میں امن قائم رکھنے کی کوششیں کیں۔ جنگ کے انسداد کے لیے کئی تدبیریں کیں مگر جب کوششیں ناکام رہیں تو امریکہ کی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔[1]

کینیڈا

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے شرکت کا اعلان کیا تو کینیڈا بھی شریک ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۱۷ء میں جبری فوجی خدمت کا قانون بنا اور بیس سال سے پینتالیس سال تک عمر کے افراد کے لیے فوجی خدمت لازمی قرار دی گئی۔ جنگ میں کینیڈا نے چھیاسٹھ لاکھ ہزار ڈالر دیے اور ڈیڑھ ارب ڈالر کے قریب خرچ کیا۔ جنگ کے خاتمے پر زرعی کاموں کی طرف توجہ دی۔ ۱۹۳۰ء میں بے روزگاری بہت بڑھ گئی تو حکومت نے امور عامہ کے کئی محکموں کو تعمیری کاموں کے لیے کثیر رقمیں دیں اور بے روزگاروں کے لیے روزگار کا بندوبست کیا۔

کینیڈا میں گندم بہت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں جمہوریہ امریکہ، آسٹریلیا، ارجنٹائن اور سوویٹ روس نے گندم کے بارے میں ایک معاہدہ کیا۔ کینیڈا بھی اس معاہدے میں شریک تھا۔ اس معاہدے کے مطابق ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں گندم برآمد

---

[1] مزید تفصیل کے لیے باب دوسری جنگ عظیم دیکھیں۔

کرنے کے لیے ایک خاص مقدار کا تعین کیا گیا اور طے ہوا کہ آئندہ گندم کی کاشت کے رقبے یا پیداوار میں مزید پندرہ فیصد تخفیف کر دی جائے گی۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں کینیڈا نے معاشی اصلاح کے لیے کئی قوانین وضع کیے۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو کینیڈا نے بھی برطانیہ کی امداد کے لیے بندوبست کر لیا۔

جنوبی امریکہ

جنوبی امریکہ کا رقبہ شمالی امریکہ سے ایک چوتھائی کم ہے، لیکن زرعی اور معدنی لحاظ سے جنوبی امریکہ شمالی امریکہ سے زیادہ دولت مند ہے خصوصاً جنوبی امریکہ کا آخری حصہ بہت سرسبز و شاداب ہے اور معدنی دولت سے مالا مال ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء تک جنوبی امریکہ کے معاملات میں شمالی امریکہ کا دخل کم تھا۔ لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو ریاست ہائے متحدہ نے جنوبی امریکہ پر پورا معاشی تسلط جما لیا اور پھر خاصا اقتدار قائم کر لیا۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر جنوبی امریکہ کے اکثر ممالک نے جمہوریہ امریکہ کے ایما پر جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا اور بعض نے جرمنی سے سیاسی تعلقات منقطع کر لیے تھے مگر ان ملکوں میں سے کسی نے بھی میدان جنگ میں اپنی فوج نہ بھیجی چونکہ سارے علاقے میں ہر قسم کا خام مال بکثرت موجود تھا اس لیے جنگ کے دوران جنوبی امریکہ کے ممالک نے اپنا مال بیچ کر خوب روپیہ کمایا۔ سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۹ء تک خوب معاشی اور تجارتی ترقی کی۔ صنعت و حرفت بھی عروج کو پہنچ گئی۔ جمہوریہ امریکہ کے زیر اقتدار جنوبی امریکہ کے تمام ملکوں نے امریکی اتحاد کے لیے کوششیں کیں۔ البتہ میکسیکو ایسی پالیسی پر کاربند رہا جو جمہوریہ امریکہ کی پالیسی سے ٹکراتی تھی۔ تاہم اس سے کوئی نمایاں خرابی رونما نہ ہوئی۔

مارچ سنہ ۱۹۳۸ء میں میکسیکو نے برطانیہ اور امریکہ کی تیل کی کمپنیوں کے املاک اپنے قبضے میں کر لیے جس پر جمہوریہ امریکہ نے میکسیکو سے چاندی نہ خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ برطانیہ نے بھی میکسیکو سے سیاسی تعلقات توڑ لیے۔ آخر نومبر سنہ ۱۹۳۸ء میں فیصلہ ہوا کہ حکومت میکسیکو ہر سال دس لاکھ ڈالر جمہوریہ امریکہ کو دیتی رہے گی۔ یہاں تک کہ سارے معاوضے پورے ہو جائیں۔ البتہ تیل کے متعلق سنہ ۱۹۳۹ء تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

باب ۲۸ ہسپانیہ

اسلامی عہد رفتہ

سپین یا ہسپانیہ یورپ کا وہ ملک ہے جس پر مسلمانوں نے تقریباً آٹھ صدیوں تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور اس طویل مدت میں عربی تہذیب و تمدن کا جو نظام تیار ہوا تھا وہ بالآخر سنہ ۱۴۹۲ء میں ہسپانوی دستبرد کی نذر ہو گیا۔ آخر مسلمان فرمانروا سپین سے نکال دیا گیا اور مسلمانوں کو اس بری طرح تباہ کیا گیا کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی مسلمان وہاں نہ ملتا تھا۔ مسلمانوں کو حکم دے دیا گیا کہ یا تو عیسائی ہو جائیں یا سپین چھوڑ دیں۔ غرض مسلمانوں کی تباہی کے ساتھ ان کی مشہور عام درسگاہیں، علوم و فنون کے مراکز، لائبریریاں اور علم و حکمت کے نوادرات بھی برباد ہو گئے۔ غرناطہ کا قصر "الحمرا" قرطبہ کی مسجد اور اشبیلیہ کا منارہ آج بھی مسلمانوں کے جاہ و جلال کی داستانیں زبان حال سے سنا رہے ہیں اور اسی شاندار عہد رفتہ کی یاد دلا رہے ہیں۔

جب عرب سلطنت مٹی اور عیسائیت کا دور شروع ہوا تو پاپائیت نے اپنا اثر جمانا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سارا سپین اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ مذہب کے نام پر پادریوں نے دولت کے انبار جمع کر لیے۔ رہبانیت اور ترک دنیا کی فضا نے عیسائی ذہنوں پر قفل لگا دیے۔ مذہبی تنگ نظری کے ساتھ ساتھ، ذہنی و معاشی بدحالی زور پکڑتی گئی اور اٹھارویں صدی کے آخر تک اہل ہسپانیہ بالکل مردہ اور بے حس قوم بنے رہے۔

آخر یورپ میں وہ انقلاب عظیم اٹھا جسے دنیا انقلاب فرانس کے نام سے یاد کرتی ہے اس انقلاب نے یورپ کی کئی سلطنتوں کو تہہ و بالا کر دیا۔ سپین میں کوئی دم خم نہ تھا اس لیے نپولین اعظم نے آسانی سے اس پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ کو معزول کر کے بھائی کو سپین کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا۔ پھر جب نپولین کا ستارۂ اقبال غروب ہو گیا تو اس کے بھائی کو بھی سپین کی بادشاہت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ نپولین کی شکست پر فرڈی نینڈ ہفتم سپین کے تخت پر بحال کر دیا گیا اور اس نے سنہ ۱۸۳۳ء میں وفات پائی۔ فرڈی نینڈ ہفتم کے عہد میں بغاوتیں ہوئیں اور اس کا دورِ حکومت مسلسل بدامنی اور بے چینی کا شکار رہا۔

اگرچہ سپین کی مالی حالت اچھی نہ تھی اور عوام بدحالی کا شکار تھے، تاہم اٹھارویں صدی کے آخر میں سمندر پار ملکوں میں سپین نے بعض نوآبادیاں قائم کر لی تھیں اور ان کے طفیل کچھ دولت سپین میں آنے لگ گئی تھی۔ مگر جلد ہی ان آبادکاروں نے سپین کے خلاف بغاوتیں شروع کر دیں اور جگہ جگہ اپنی آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم کر دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سپین معاشی بدحالی کے شکنجے میں بری طرح جکڑا گیا۔ اس بدحالی نے عوام کو شورش پسندی کا عادی بنا دیا۔ مگر حکومت ہر شورش کو جبر و تشدد سے دباتی رہی۔ فرڈی نینڈ کے مرنے پر جب اس کی بیٹی آئزابلا دوم تخت نشین ہوئی تو لوگوں میں بادشاہت کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ رائے عامہ آئزابلا کو تخت پر بٹھانے کے خلاف تھی چنانچہ آئزابلا کو مسلسل بدامنی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر بیٹے کے حق میں دست بردار ہو گئی۔ نیا بادشاہ کم عمر تھا، اس لیے ایک فوجی کو نائب السلطنت مقرر کیا گیا اور وہی ملک کے نظم و نسق کو چلاتا رہا۔ بالآخر سنہ ۱۸۷۳ء میں جمہوریت قائم کر دی گئی جب آئزابلا کا بیٹا بڑا ہو گیا تو وہ دوبارہ بادشاہت کو بحال کرنے میں لگ گیا۔

چونکہ ملک کی معاشی حالت ابتر تھی، اور دولت کے ذخائر ختم ہو چکے تھے، اس لیے جمہوریت بھی لوگوں کو مطمئن نہ کر سکی۔ لوگوں کی معاشی حالت اتنی پست ہو چکی تھی کہ جمہوری لائنوں میں سازگار حالات پیدا کرنے کا ان میں شعور ہی نہ تھا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے جمہوریت کے نام پر اقتدار سنبھالا تھا، وہ دراصل بادشاہت ہی کا انداز اختیار کیے ہوئے تھے یہ صورت حال آئزابلا کے بیٹے کے لیے سازگار تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۶ء میں اس نے دوبارہ بادشاہت قائم کر لی۔ ایک پارلیمنٹ بنائی گئی۔ حکومت کا دستور اساسی مرتب ہوا۔ جو محض دکھاوے کے لیے تھا، اصل اختیارات بادشاہ کے ہاتھ میں رہے ایسے نظام کے نفاذ کا جو نتیجہ ہوا کرتا ہے، وہی ہوا۔ یعنی رائے شماری محض دکھاوے کے لیے ہوتی ہے سرکاری اہلکار اپنی مرضی کے مطابق پرچے گھٹا بڑھا دیتے تھے۔ رشوتوں سے کام نکالا جاتا ووٹوں میں گڑبڑ کی جاتی سرکاری اثر و رسوخ کی مشینری حرکت میں لائی جاتی، عوام کو دھوکے اور فریب میں ڈالا جاتا۔ چونکہ اہل سپین میں پہلے ہی سے شعور کا فقدان تھا۔ اس لیے "دستوری شاہی" کے تمام حربے کامیاب رہتے تھے اور یہ حکومت ایک مدت تک برسر کار رہی۔

معاشی خوشحالی اور بدحالی

جب سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم چھڑی تو سپین نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا۔ اس طرز عمل سے سپین کو فائدہ پہنچا۔ متحارب گروہوں کے ہاتھ اس نے خوب سامان بیچا، جس سے اس کی صنعت و حرفت ترقی کرنے لگی۔ بے روزگاری کا طویل دور اچانک ختم ہو گیا۔ نئے نئے کارخانے کھل گئے۔ سپینی تاجر اپنی چیزوں کے منہ مانگے دام لیتے۔ غرض سپین کی مالی حالت بہت حد تک سدھر

گئی۔ مگر یہ دور عارضی تھا۔ جونہی جنگ عظیم ختم ہوئی سپین کی معاشی خوشحالی نے دوبارہ دم توڑ دیا۔ جمے جمائے کاروبار اکھڑ گئے۔ کارخانے بند ہو گئے۔ سپین کے تجارتی اور صنعتی مال کا کوئی گاہک نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے روزگاری دوبارہ عود کر آئی، مزدوروں نے جلسے اور ہڑتالیں شروع کر دیں۔ سپین کے طول و عرض میں ہنگاموں کا دور دورہ ہو گیا۔

نئی تدبیر

اس وقت اسپین کے تخت پر الفانسو[1] متمکن تھا جو نہایت زیرک اور موقع شناس حکمران تھا وہ جانتا تھا کہ ملک کی معاشی ابتری ہی لوگوں میں باغیانہ جذبات پیدا کرنے کا باعث ہے اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو ملک میں امن و سکون کی صورت پیدا ہو سکتی ہے مگر معاشی بدحالی کو خوشحالی میں بدلنا آسان نہ تھا۔ ملک میں بے روزگاروں کی جو بہت بڑی فوج تیار ہو چکی تھی اس تمام فوج کو روزگار مہیا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ اگر لوگوں کا دھیان کسی اور طرف لگا دیا جائے تو ان کی شورشیں ختم ہو جائیں گی۔ اس مقصد کے لیے اس نے لوگوں کے مذہبی رجحانات سے فائدہ اٹھایا اور انہیں مذہبی جنگ کے نام پر مراکش کے بربر قبائل کے خلاف ابھارا، جو مسلمان تھے اور مراکش کے اس حصے میں آباد تھے جسے ریف کہا جاتا ہے۔

کشمکش

مگر بربر لوگ بڑے شجاع اور جنگجو ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کی غلامی قبول نہ کی تھی مگر چونکہ سیاسی ہتھکنڈوں سے ناآشنا ہیں، اس لیے اسپین کے محکوم ہو گئے ہیں۔ بظاہر وہ اپنے سلطان کے ماتحت تھے مگر خارجی معاملات میں اسپین کے زیر اثر تھے یہ محکومی بھی انہیں کبھی گوارا نہ تھی، چنانچہ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے غازی عبدالکریم کی سرکردگی میں سپین سے بغاوت کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا شاہ سپین الفانسو نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اہل سپین کے مذہبی تعصبات کو ابھارا اور صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا۔ مذہب کے نام پر اہل سپین مرنے مٹنے کو تیار ہو گئے اور یوں الفانسو کے لیے اپنی رعیت سے نجات کی صورت پیدا ہو گئی۔[2]

اہلِ ریف سے جنگ

ادھر الفانسو نے صلیبی جنگ کا بگل بجایا ادھر مجاہدینِ ریف سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکل آئے۔ ۱۹۲۱ء میں اسپین نے ریف پر حملہ بول دیا مگر ریف کے قدرتی ذرائع اور ان کے سرفروشانہ جذبات دونوں نے مل کر اہل سپین کو شکست دی، دس ہزار سپینی قتل ہوئے۔ اس سے کچھ کم قیدی بنا لیے گئے۔ سپین کے کمانڈر نے خودکشی کر لی اور سارا ساز و سامان مجاہدین کے ہاتھ آ گیا۔

جنگ کے نتائج

الفانسو کا خیال تھا کہ جنگ طول پکڑے گی اور اپنی شکست کا تو اسے مطلق شبہ تک نہ تھا مگر نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ چنانچہ اس ہولناک شکست سے نہ صرف اہل اسپین کے دل اکھڑ گئے بلکہ وہ الفانسو کے خلاف ہو گئے۔ ان میں حکومت کے خلاف غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی۔

الفانسو نے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا کہ جنگ میں ناکامی کے اسباب کا پتہ لگائے۔ مگر عوام حکومت کے اس پھندے میں نہ آئے اور اس بربادی کا باعث الفانسو ہی کو قرار دے دیا گیا۔ جب الفانسو نے دیکھا کہ اس کے خلاف بغاوت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں تو اس نے ایک اور چال چلی۔

رے وِیرا

اسی زمانے میں رے ویرا نام ایک عوامی لیڈر بہت مقبول ہو رہا تھا۔ الفانسو نے اس کے ذریعے سے اپنا کام نکالنا چاہا۔ چنانچہ حکومت کا کاروبار اس کے سپرد کر دیا[3] اور ۱۳ ستمبر ۱۹۲۳ء کو رے ویرا نے اپنی ڈکٹیٹری کا اعلان کر دیا۔

رے ویرا بھی مراکش کی اس جنگ میں شریک تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس نے اور بھی کئی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ وہ لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر فائز تھا اب اسپین کا ڈکٹیٹر بننے پر اسے وہی طاقت و اقتدار حاصل ہو گیا جو اٹلی میں مسولینی کو حاصل تھا اور اس نے مسولینی ہی کے فسطائی اصولوں پر کاربند ہونا شروع کر دیا وہ سات سال تک سپین کا ڈکٹیٹر رہا مگر اسی دوران میں کوئی قابل ذکر سیاسی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ اتنا ضرور ہوا کہ ۱۹۲۶ء میں اس نے فرانس کی مدد سے غازی عبدالکریم سے اطاعت منوالی۔

رے ویرا سے لوگوں کو بہت سی توقعات تھیں مگر ایک بھی پوری نہ ہوئی۔ چنانچہ عوام میں اس کے خلاف بھی بددلی پیدا ہو گئی۔ رے ویرا کو بھی اپنی ناکامی کا احساس تھا مگر وہ از خود اقتدار سے دستبردار نہ ہونا چاہتا تھا۔ آخر ۱۹۲۹ء کی عالمگیر کساد بازاری اسپین پر بھی اثر انداز ہوئی۔ جس نے رے ویرا کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور بادشاہ نے پھر تاج و تخت سنبھال لیا۔

شورشیں روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ جمہوریت پسندوں نے طے کیا کہ حکومت پر فوجی دھاوا بول دیا جائے مگر اس سازش کا انکشاف ہو گیا اور بات رہ گئی جمہوریت پسندوں نے انتخابی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ادھر حکومت ایسے لوگوں کو گرفتار کرنے لگی۔ مشتبہ جمہوریت پسندوں کو قتل کیا جانے لگا اور جیلیں ان قیدیوں سے بھر گئیں۔

حکومت کے اس تشدد نے عوام کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ ملک میں ان گرفتاریوں کے خلاف احتجاج ہوا۔ بغاوت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ "جیل پروگرام" کے نام سے ایک سیاسی پروگرام مرتب کیا گیا، جس کا مقصد قیدیوں کو جیل سے رہا کرانا تھا۔ مگر اسے روبہ عمل لانے کا وقت نہ آیا۔ حکومت نے خود ہی تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ساتھ ہی پارلیمنٹ کے انتخاب کا اعلان کر دیا گیا۔ جمہوریت پسندوں کو زبردست اکثریت حاصل ہوئی۔ پارلیمنٹ میں تو طے پایا کہ سپین کی بادشاہی ختم کر کے جمہوری نظام قائم کیا جائے۔ بادشاہ کو اسپین سے جلاوطن کر دیا گیا اور وہ رات کی تاریکی میں کچھ ذاتی سامان لے کر سپین سے چلا گیا۔ غرض یہ عظیم الشان انقلاب بڑے پرامن طریقے سے انجام پایا۔

کلیسا

چونکہ عوام نے ارباب کلیسا کے ہاتھوں بہت تکلیف اٹھائی تھی اور وہ انہیں تمام مصائب کا ذمہ دار گردانتے تھے، لہٰذا نئے دور حکومت میں کلیسا کے ارباب اقتدار سے اس کا انتقام لیا گیا۔ ان کے گھر جلا دیئے گئے۔ جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ گرجے تک خاکستر کر دیئے گئے، مگر پادریوں کو قتل نہ کیا گیا۔

نئی جمہوری حکومت نے جمہوری انداز پر نیا آئین بنایا۔ بین الاقوامی تعلقات جو اس سے قبل خراب ہو چکے تھے۔ از سر نو استوار کیے۔ کلیسا کی خواہش تھی کہ اس کے اقتدار کو بھی تسلیم کیا جائے۔ لیکن لوگ ایسا کرنے کو تیار نہ تھے۔ البتہ پادریوں کو اپنے مذہبی کاموں میں مصروف رہنے اور گرجا گھر تعمیر کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ ملک کی تعلیم میں حصہ لینے سے انہیں محروم کر دیا گیا۔ حکومت کی طرف سے وظیفہ پا جاگیر بھی انہیں نہ مل سکتی تھی۔

---

[1] یہ الفانسو سیزدہم تھا جس نے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۳۱ء تک حکومت کی۔

[2] حکومت اسپین اور بربر قوم کی کشمکش کا اجمالی تذکرہ مراکش کے ضمن میں بھی بیان ہوا ہے۔

[3] بظاہر یہ سپردگی اس طرح عمل میں لائی گئی کہ لوگ سمجھتے تھے رے ویرا نے بزور طاقت حکومت پر قبضہ کر لیا ہے مگر یہ سارا کام الفانسو ہی کے ایماء پر ہوا جسے اپنے تاج و تخت کو بچانے کا یہی طریقہ نظر آیا ہے۔

اندرونی خلفشار

اگرچہ نئی حکومت کے قیام سے حالات میں قدرے تبدیلی اور سکون پیدا ہو گیا مگر کلیسا چونکہ مطمئن نہ تھا اس لیے بے چینی باقی رہی۔ اشتراکیت پسند لیڈروں اور مزدوروں کو بھی نئی حکومت سے پرخاش تھی چنانچہ ہڑتالیں اور ہنگامے ہونے لگیں۔ اسپین کے بعض صوبوں میں خودمختاری کی تحریکیں شروع ہو گئیں اور بہت سے لوگ، اشتراکیت پسند لیڈروں اور مزدوروں کے ساتھ مل کر حکومت کی مخالفت میں لگ گئے۔ غرض مختلف صوبوں میں حکومت سپین سے علیحدگی کا رجحان زور پکڑ گیا۔

بغاوت

اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کسانوں کو مطمئن کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، کیونکہ سپین زرعی ملک ہے اور اس میں اکثریت کسانوں کی ہے اور ان کا تعاون حکومت کے لیے زیادہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے، مگر کسانوں کو زیر اثر لانے کے لیے بڑے بڑے زمینداروں سے مخالفت مول لینی پڑتی تھی۔ اس لیے اس تدبیر پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ اب حکومت کے پاس تشدد کے سوا کوئی اور ہتھیار نہ تھا۔ چنانچہ اسے استعمال کیا جانے لگا جس نے حالات کو اور زیادہ تشویشناک بنا دیا۔ جمہوری حکومت کے خلاف اشتراکیت پسندوں اور مزدوروں نے جو محاذ بنا رکھا تھا اس میں اب مراکش اور ریف کے عرب اور بربر بھی شامل ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں کچھ فوجی بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اور مشترکہ محاذ نے حکومت کے خلاف اعلانیہ بغاوت کر دی۔

فرانکو کا اقتدار

انہیں دنوں جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کا آفتاب ترقی پورے عروج پر تھا اور یورپ میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔ سپین میں ان دنوں فرانکو نام کا ایک فوجی جرنیل عوامی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ اس لیے کہ وہ قومی سربلندی کا داعی تھا اور عوام کا نعرہ بھی یہی تھا۔ فرانکو ہٹلر اور مسولینی کے فلسفہ پر عمل پیرا تھا۔ چنانچہ اٹلی اور جرمنی نے فرانکو کی ہر ممکن مدد کی۔ روس فرانس اور برطانیہ کو فرانکو کے طرز عمل سے خوف لاحق ہو گیا مگر فرانکو کو اسپین میں اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ جمہوریت یا اشتراکیت کے حامی بے بس ہو کر رہ گئے۔ فرانکو نے دو سال کی مسلسل کوششوں اور خونریزیوں کے بعد کامیابی حاصل کر لی۔ اس نے نئی حکومت قائم کر دی اور اسے اسپین میں وہی اختیارات حاصل ہو گئے جو جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کو حاصل تھے۔ اس نے اسپین کی تمام سیاسی جماعتوں کا خاتمہ کر دیا اور اپنی مضبوط جماعت بنا کر سپین کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد

فرانکو کو اختیارات سنبھالے ایک سال ہی گزرا تھا کہ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ چونکہ ہٹلر اور مسولینی ہی کی مدد سے فرانکو کو اقتدار حاصل ہوا تھا، اس لیے اس جنگ میں فرانکو ان کے خلاف کارروائیوں میں حصہ نہ لینا چاہتا تھا۔ مگر اپنی حالت بھی اتنی مضبوط نہ تھی کہ ان کی مدد کرتا لہٰذا اس نے غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا تاہم جب جنگ ختم ہوئی اور اتحادیوں نے مسولینی اور ہٹلر کا اقتدار خاک میں ملا دیا تو فرانکو کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہ کیا۔

جنگ کے بعد سپین کے اقتصادی حالات بہت خراب ہو گئے تھے اور باہر سے قرضے لینا ضروری ہو گیا۔ اس دوران میں ڈان جون نے تخت کا دعویٰ پیش کر دیا۔ سپین نے جرمنی سے تعلقات توڑ لیے مگر جرمنی کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد کو پناہ دے دی۔ اتحادیوں نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر سپین نے انہیں دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ سان فرانسسکو کی کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ سپین کو اقوام متحدہ کی رکنیت سے علیحدہ رکھا جائے۔ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء میں فرانس برطانیہ اور امریکہ نے سپین کے باشندوں سے اپیل کی کہ جنرل فرانکو کو ملک سے نکال دیا جائے تاکہ جمہوریت کے لیے راستہ صاف ہو جائے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں فرانکو نے اعلان کر دیا کہ سپین میں بادشاہی حکومت قائم کی جائے گی۔ بادشاہ کے انتخاب کا مسئلہ فرانکو کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ جس جمہوری گروہ نے فرانکو سے پہلے سپین میں حکومت قائم کر رکھی تھی، وہ فرانکو کے برسر اقتدار آنے پر باہر نکل گیا تھا مگر انہوں نے باہر بھی اپنی حکومت قائم رکھی سنہ ۱۹۴۶ء میں وہ حکومت ختم ہو گئی۔ فرانکو کی حمایت کا اعلان کر دیا گیا۔

لاطینی امریکہ کی حکومت کے زیر اثر انجمن اقوام متحدہ میں وہ قرارداد منسوخ ہو گئی جس کے مطابق فرانکو کو انجمن کی رکنیت سے باہر رکھا گیا تھا۔ نومبر سنہ ۱۹۵۵ء میں اس کے لیے اقوام متحدہ کی رکنیت کا دروازہ پھر کھل گیا۔ اب اسپین میں مکمل آمریت پھر قائم ہے، جس میں صرف ایک پارٹی یعنی فیلنگے پارٹی کی حکومت قائم ہے۔

باب ۲۹ یونان

اٹھارویں صدی کے آخر میں یونانیوں نے بحیرۂ اسود میں غلے کی تجارت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ کریا اور ریگاس کے باعث ان کی ثقافت بھی ازسرنو زندہ ہو گئی۔ ادھر روس انہیں انگیخت دے رہا تھا۔ ادھر نپولین کی سازشوں نے یونانیوں میں بغاوت کے جذبات مشتعل کر رکھے تھے۔ سنہ ۱۸۱۴ء میں آڈیسہ کے مقام پر ہیتریا فیلکی کے نام سے ایک خفیہ انقلابی جماعت کا قیام عمل میں آ گیا۔ اس جماعت کا اس سے گہرا تعلق تھا۔ کاونٹ کپوڈی اسٹریا زار روس کا گہرا دوست تھا اور ایگزنڈر ہپسی لانٹی جو اس بغاوت کا سرغنہ تھا الامیریا کے ایک بااثر خاندان کا فرد اور روسی فوج میں ممتاز عہدے پر فائز تھا۔

فروری سنہ ۱۸۲۱ء میں ولیشیا میں ترکوں اور یونانیوں کی حکومت کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ مارچ سنہ ۱۸۲۱ء کو ہپسی لانٹی نے مالڈویا میں علم بغاوت بلند کر دیا اور زار روس سے مدد طلب کی۔ مگر زار نے اعلان کر دیا کہ وہ اس بغاوت کا حامی نہیں، چنانچہ ہپسی لانٹی نے ہمت ہار دی اور ترک فوج نے اسے شکست دی۔ وہ بھاگ نکلا مگر آسٹرویوں نے پکڑ کر قید کر دیا۔

اسی دوران میں جنوبی یونان میں بھی بغاوت ہو گئی اور بعض جزیروں نے بھی بغاوت میں شرکت کر لی۔ ان علاقوں میں ترک بہت تھوڑی تعداد میں بکھرے ہوئے تھے۔ باغیوں نے انہیں بڑی بے دردی سے قتل کیا اور بغاوت کی تحریک سارے یونان میں پھیل گئی۔ ترکوں نے اس ظلم کے بدلے میں یونان کے لاٹ پادری کو پھانسی پر لٹکا دیا اور قسطنطنیہ کے یونانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس پر روس نے احتجاج کیا اور جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

روس نے الٹی میٹم دے دیا کہ مسیحی کلیسا کو بحال کیا جائے اور مسیحی مذہب کی حفاظت کا یقین دلایا جائے۔ ترکوں نے اس الٹی میٹم کو رد کر دیا اور روس سے تعلقات ٹوٹ گئے۔

یونانیوں نے جنوبی یونان کے سب سے بڑے ترکی قلعہ پر ٹریپولیٹا پر قبضہ کر لیا۔ دس ہزار ترک مارے گئے۔ ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۲۲ء کو یونانیوں نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ ایک دستور بنایا۔ جس کے مطابق نظامِ حکومت پارلیمنٹ اور پانچ ڈائریکٹروں کے حوالے کر دیا گیا۔

ترکی نے ہیدرا پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کے بادشاہ علی کا دورِ حکومت ختم ہو گیا اور اب ترک اطمینان سے یونانیوں کے خلاف سرگرم عمل ہو گئے۔

اپریل ۱۸۲۲ء میں ترکی بیڑے نے جزیرہ خیوس پر قبضہ کر لیا۔ یونانی قتل ہو گئے یا قیدی بنا لیے گئے۔ مگر دو ماہ بعد یونانیوں نے ترکی بیڑے کو تباہ کر دیا۔ جولائی میں تیس ہزار ترکوں نے یونانیوں پر زبردست حملہ کیا اور خارج کارنتھ کا شہر مسمار برباد کر دیا یونانی حکومت بھاگ گئی۔ جنوری ۱۸۲۳ء کو ترک پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ مگر یونانی باہمی مناقشوں میں الجھے رہے اس لیے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔

سلطان ترکی نے اپنے طاقتور باجگزار محمد علی پاشا والی مصر سے امداد طلب کی۔ محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے جنوبی یونان میں فوج بھیج دی اور بڑی سرعت سے جزیرہ نما پر قبضہ کر لیا۔ پھر ترکوں نے شمال کی طرف سے یونان پر حملہ کر دیا اور مسولونگھی کو فتح کر لیا۔

ترکوں اور مصریوں کی ان فتوحات نے یورپ میں سراسیمگی پھیلا دی۔ جرمنی، فرانس، انگلستان اور سوئٹزرلینڈ کی حکومتوں نے سینٹ پیٹرز برگ میں سفیروں کی ایک کانفرنس بلائی جس میں یہ تجویز زیر بحث لائی گئی کہ یونان میں تین خود اختیاری مگر باجگزار حکومتیں قائم کی جائیں۔ یونانیوں نے مسولونگھی کے سقوط کے بعد برطانیہ سے مدد کی اپیل کی۔ انگلستان اور روس نے ترکوں اور یونانیوں کے درمیان ثالث بننے پر آمادگی ظاہر کی اور طے پایا کہ ترکی سیادت کے ماتحت یونانیوں کو مکمل اندرونی خود مختاری دی جائے۔

اپریل ۱۸۲۷ء میں یونان کی متحارب جماعتوں نے اس امر پر اتفاق کر لیا کہ کیپو دی استریا کو سات سال کے لئے صدر بنا لیا جائے، اور مئی کو ایک دستور مرتب ہوا جس کے مطابق ہیئت حاکمہ کے تمام اختیارات چھین کر ایوان (سینٹ) کے حوالے کر دیے گئے۔ ۵ جون کو ایکروپولیس نے ترکوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

۶ جولائی ۱۸۲۷ء کو لندن میں معاہدہ ہوا کہ اگر ترک متارکہ سے انکار کریں تو روس، انگلستان اور فرانس یونان کی امداد کریں گے۔ پھر باب عالی میں جنگ روک دینے کی یادداشت بھیجی، مگر ترکی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

تینوں طاقتوں نے اپنے بحری بیڑے کو ہدایت کر دی کہ باہر سے کوئی فوجی کمک یا رسد یونان میں نہ جانے دی جائے۔ چنانچہ جب مصری بیڑا سامان لے کر ناورینو پر لنگر انداز ہوا تو مداخلت کی گئی۔ برطانیہ، فرانس اور روس کے بیڑے بندرگاہ میں داخل ہو گئے۔ مصری جہازوں پر گولہ باری کر کے انہیں فنا کر دیا گیا۔ جس سے ترکوں میں غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ تینوں طاقتوں کے سفیر قسطنطنیہ سے چلے گئے۔

اپریل ۱۸۲۸ء میں روس نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ برطانیہ نے مخالفت کی اور فرانس نے حمایت۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے محمد علی سے ایک معاہدہ کر کے یہ مصری فوج کو یونان سے نکال کر مصر پہنچا دیا جائے۔ فرانسیسی فوج نے انکا یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ روس نے وارنا پر قبضہ کر لیا۔ مگر موسم سرما میں اس کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔

۲۲ مارچ ۱۸۲۹ء کو سفیروں کی ایک کانفرنس میں ایک میثاق تیار ہوا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ یونان کا جو خلیج وولو اور خلیج آرٹا کے خط کے جنوب میں ہے وہ اور نیگرو پونٹ اور سائیکلیڈز خود مختار ہوں گے، مگر سلطان ترکی کو خراج ادا کرتے رہیں گے۔

۳۰ نومبر ۱۸۲۹ء کو لندن کانفرنس میں طے پایا کہ یونان کو کامل آزادی دے دی جائے مگر سرحد پیچھے ہٹا دی گئی۔ مگر یونان نے اسے رد کر دیا۔ اسی دوران میں کپودی استریا یونان کا ڈکٹیٹر بن کر کاروبار چلاتا رہا۔ اکتوبر ۱۸۳۱ء میں وہ مارا گیا تو اس کے بھائی اور مخالفوں میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ ۱۸۳۲ء میں بویریا کے شہزادے آٹو کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ چونکہ اس کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔ اس لیے ابتدائی سالوں کے لیے حکومت کا کاروبار ایک نیابتی کونسل کے سپرد رہا جس میں بویریا کے تین افراد شامل تھے۔ انہوں نے ایک ایسا دفتری اقتدار قائم کیا جس میں اختیارات مرکز کے ہاتھ میں تھے۔ یہ نظام ملکی حالات کے لیے قطعاً موزوں نہ تھا چنانچہ آٹو ہر دلعزیزی حاصل نہ کر سکا اور خانہ جنگی جاری رہی۔ اقتصادی حالت خراب ہوتی گئی اور دستور کے لیے عام مطالبہ شروع ہو گیا۔ آٹو نے بنیادی قانون منظور کرتے ہوئے دو ایوانی پارلیمانی حکومت بنا دی۔

جب جنگ کریمیا شروع ہوئی تو یونانیوں نے تھسلی اور ایپیرس کے ترکی علاقوں پر حملے شروع کر دیئے۔ برطانیہ اور فرانس نے ایتھنز کے قریب ایک جزیرے پر قبضہ کر لیا اور یونان کو مجبوراً جنگ سے ہاتھ روکنا پڑا۔

۲۳ فروری ۱۸۶۲ء کو فوج نے آٹو کے خلاف بغاوت کر دی اور اسے معزول کر کے ملک بدر کر دیا۔ پارلیمنٹ نے وکٹوریہ کے بیٹے شہزادہ الفریڈ کو اپنا بادشاہ چن لیا مگر برطانیہ نے اسے نامنظور کر دیا۔ چنانچہ ڈنمارک کے ایک شہزادے جارج کو یورپی طاقتوں کی رضامندی سے بادشاہ بنایا گیا اور وہ جارج اول کے لقب سے ۱۸۶۳ء سے ۱۹۱۳ء تک حکمران رہا۔

۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء کے نئے دستور کے مطابق ایک ایوان کی پارلیمنٹ بنائی گئی اور تمام بالغوں کو حق رائے دیا گیا۔ ۱۸۶۶ء سے ۱۸۶۹ء تک کریٹ میں ترکوں کے خلاف بغاوت جاری رہی۔ ۱۸۷۷ء میں جب روس اور ترکی کے درمیان جنگ چھڑی تو سارے یونان کے اندر بے چینی پھیل گئی۔ تھسلی میں ہنگامے شروع ہو گئے اور یونان نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ مگر یورپی طاقتوں نے یونان کو جنگ سے روک دیا۔ ۱۸۸۱ء میں تھسلی کے علاوہ ایپی رس کا ایک حصہ یونان کو مل گیا۔

۱۸۸۵ء میں مشرقی رومیلیا میں انقلاب آیا تو یونانی بھی جنگ پر کمربستہ ہو گئے، مگر یورپی طاقتوں نے انہیں الٹی میٹم دے کر ان کی ناکہ بندی کر کے جنگ سے روک دیا۔

۱۸۹۶ء میں کریٹ میں نازک صورت حال پیدا ہو گئی اور کئی سال تک بدامنی کا دور دورہ رہا۔ آخر ۱۹۰۸ء میں اہل کریٹ نے یونان سے الحاق کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۱۳ء میں جارج اول مارا گیا اور اس کا بیٹا کانسٹنٹائن بادشاہ بنا۔ وہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۲ء تک تخت نشین رہا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۲۴ء کو ایک دستور ساز اسمبلی نے یونان میں جمہوری حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ مگر ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں پھر بادشاہت قائم ہو گئی اور جارج دوم پھر تخت پر بحال ہو گیا۔ دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے کے بعد ۱۹۴۰ء میں جرمنی کے حلیف اٹلی نے یونان پر حملہ کر دیا لیکن یونانیوں نے برطانیہ کی مدد سے انہیں ملک سے نکال باہر کیا۔ پھر یونانی فوجیں البانیہ میں داخل ہو گئیں۔ ۶ اپریل ۱۹۴۱ء کو پھر جرمنی، اٹلی اور بلغاریہ کی فوج کا تسلط قائم ہو گیا۔ مگر یونان کی گوریلا فوجوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور اکتوبر ۱۹۴۴ء میں یونان پھر محوری تسلط سے آزاد ہو گیا۔ بعد ازاں یونان میں طویل خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اسی دوران میں اگست ۱۹۴۵ء میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی نگرانی میں عام انتخابات ہوئے جن میں ۳۵۴ ارکان پر مشتمل ایک نیا ایوان نمائندگان بنا۔ یکم ستمبر ۱۹۴۶ء میں منصوبے عام کے بعد جارج دوم کو یونان کے تخت پر دوبارہ بحال کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں کمیونسٹ گوریلوں نے یونان میں سراسیمگی پھیلا دی اور یونان کے باغی لیڈر جنرل مارکوس نے ایک آزاد یونانی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس کی پالیسی یہ تھی کہ سوویٹ روس اور بلقان اشتراکی ریاستوں سے دوستانہ تعلقات استوار کیے جائیں۔

باب ۳۰ آسٹریا

آسٹریا وسطی یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے جو چاروں طرف سے جرمنی، اٹلی، رومانیہ اور پولینڈ سے گھرا ہوا ہے۔ رقبہ ۳۲،۳۷۵ مربع میل اور آبادی ۶۹ لاکھ جو بیس ہزار کے قریب

ہے۔ باشندوں کی زبان جرمن ہے۔ ملک کا بیشتر حصہ پہاڑی ہے جس میں گھنے درخت ہیں اور ان سے لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ دریائے ڈینیو کی وادی میں گندم، آلو اور چقندر کاشت کیا جاتا ہے۔ عمدہ چراگاہیں بھی ہیں جن میں مویشی پالے جاتے ہیں اور کثیر مقدار میں دودھ اور مکھن حاصل کیا جاتا ہے۔ یہی دو چیزیں آسٹریا کی بڑی تجارت ہیں۔ دارالصدر مقام اور آسٹریا کا سب سے بڑا شہر ہے جو مدت سے سائنس، آرٹ اور دیگر علوم و فنون کا مرکز چلا آتا ہے جرمنی کا ڈکٹیٹر ہٹلر، آسٹریا ہی کا رہنے والا تھا۔ یہیں اس کے والدین کی قبریں تھیں چنانچہ مارچ ۱۹۳۸ء میں جب آسٹریا پر حملہ کر کے اسے فتح کیا تو فتح کی خوشی میں والدین کی قبروں پر پھول چڑھائے۔

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے خاتمے تک آسٹریا اور ہنگری علیحدہ علیحدہ حکومتیں تھیں جو ایک ہی بادشاہ کے زیر نگیں تھیں۔ بوہیمیا، موراویا اور سائیلیشیا کے صوبے بھی اس میں شامل تھے۔ جنگ کے بعد آسٹریا اور ہنگری علیحدہ علیحدہ جمہوریتیں بن گئیں اور مذکورہ صوبے ایک نئی جمہوریہ چیکوسلواکیہ کے نام سے وجود میں آئے۔

پہلی جنگ کے خاتمے پر ۱۹۱۹ء میں سینٹ جرمین کے مقام پر جو صلح نامہ مرتب ہوا اس کی رو سے آسٹریا کی جو نئی حدیں مقرر کی گئیں ان سے آسٹریا کی حالت ہی بالکل بدل گئی اور آبادی بہت گھٹ گئی۔ یعنی پانچ کروڑ سے کم ہو کر صرف ۶۵ لاکھ رہ گئی۔ پھر بیسیوں بڑے بڑے کارخانے بھی نئی ریاستوں کے ساتھ ہی چلے گئے اور آسٹریا مفلوج ہو کر رہ گیا۔ ملک کے معاشی ذرائع اتنے محدود ہو گئے کہ لوگوں کی معیشت تباہ ہو کر رہ گئی۔ مزدوروں کے علاوہ پروفیسر، ڈاکٹر، سائنسدان اور بڑے بڑے کارخانہ دار تک بے کار و بے روزگار ہو گئے۔ حالت یہ تھی کہ ویانا کا شہر جو تہذیب و اخلاق، علم و فن اور دولت کے لحاظ سے یورپ میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا، وہاں لوگ فاقہ کشی کرنے لگے۔ وہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ ناچار لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس بدحالی کا واحد علاج یہ ہے کہ جرمنی سے الحاق کر لیا جائے۔ مگر صلح نامہ کی رو سے اس بات کی اجازت نہ تھی پھر جب انہوں نے اٹلی کے ساتھ کرنسی اور چنگی کے محصول پر متحد ہونا چاہا تو اس امر کی اجازت بھی نہ دی گئی۔ کسانوں اور کاشتکاروں کے پاس غلہ کافی تھا مگر انہیں فروخت کے لئے منڈیاں نہ ملتی تھیں۔ غرض آسٹریا کو مجبور ہو کر دوسرے ملکوں سے قرض لینا پڑا تاکہ کام چل سکے چنانچہ اس وقت کے سب سے بڑے سیٹھ یعنی امریکہ کے سامنے دستِ سوال دراز کیا گیا۔ امریکہ پہلے ہی سے اس کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ آسٹریا کو قرض دے دیا گیا۔ آسٹریا جانتا تھا کہ یہ قرض اس کی آزادی کو تباہ کرنے کا موجب ہو گا۔ مگر لوگ فاقوں مر رہے تھے اور خزانہ خالی تھا۔ لہٰذا قرض لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ قرض کی ادائیگی کی کیا صورت ہو گی؟ آسٹریا کو اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

۱۹۲۹ء تک قرضوں سے کام چلایا گیا۔ اس کے بعد ملک کے بنک فیل ہو گئے منڈیاں سونی ہو گئیں۔ کاروبار معطل ہو گئے۔ کارخانوں اور صنعتی اداروں میں خاموشی چھا گئی۔ آسٹریا کی حالت اس مریض کی سی ہو گئی جس پر نزع کا وقت آ پہنچا ہو۔ ورسیلز اور سینٹ جرمین کے معاہدوں نے آسٹریا کا بال بال شکنجے میں جکڑ رکھا تھا اور وہ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اس دام سے نجات حاصل نہ کر سکتا تھا۔

اس دوران میں جرمنی میں نازی پارٹی بہت طاقت پکڑ رہی تھی اور ہٹلر کا آفتاب اقبال پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا ۱۲ مارچ ۱۹۳۸ء کی صبح کو جرمن فوجوں نے آسٹریا پر قبضہ بول دیا اور دنیا یہ سمجھی کہ جرمنی نے آسٹریا کو اپنا صوبہ بنا لیا ہے یہ تبدیلی آسٹریا کی موجودہ مشکلات کو حل کرنے کے لئے سازگار تھی۔ چنانچہ آسٹریا نے اسے آسانی سے قبول کر لیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد آسٹریا کے ساتھ بھی جرمنی ہی جیسا سلوک کیا گیا جرمنی میں برلن کو چار حصوں میں بانٹ گیا تو آسٹریا کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ چار حصے امریکہ، برطانیہ فرانس اور روس کے تصرف میں چلے گئے اور ایک حصہ یعنی ویانا کا علاقہ بین الاقوامی رہا۔ پوٹسڈام کے معاہدے کے بموجب روس نے آسٹریا کے تمام جرمن سرمایہ پر اپنا حق جتلا رکھا ہے۔ یعنی تقریباً تین سو کارخانوں پر روس کا قبضہ ہے اور وہ روس کے زیر نگرانی کام کر رہے ہیں۔ پیٹرول اور تیل کے چشمے بھی روس کے اختیار میں ہیں۔ آسٹریا کا نظم و نسق آسٹریا کے شہریوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے البتہ اس پر دوسرے ملک کی نگرانی قائم ہے۔

نومبر ۱۹۴۵ء میں آسٹریا کا پہلا الیکشن ہوا جس میں پیپلز پارٹی کو ۴۹ فیصد ووٹ ملے۔ سوشلسٹوں نے ۴۴ فیصد اور کمیونسٹوں نے ۵½ فیصد ووٹ حاصل کیے۔ چنانچہ وہاں ایک مخلوط وزارت قائم کر دی گئی۔ جس میں دونوں پارٹیاں برابر کی شریک تھیں آسٹریا کے مستقبل کا فیصلہ ابھی تک معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔ کئی مرتبہ صلح نامہ مرتب کرنے کی کوششیں ہوئیں مگر باہمی رقابتوں کی وجہ سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔

باب ۳۱

ہنگری

ہنگری وسطِ یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کا رقبہ ۳۵۹۰۲ مربع میل اور آبادی چورانوے لاکھ ہے۔ شمال میں چیکوسلواکیہ، مشرق میں رومانیہ، مغرب میں آسٹریا اور جنوب میں یوگوسلاویہ کی ریاستیں ہیں۔ زیادہ تر میگیار نسل کے لوگ آباد ہیں۔

ہنگری کا ملک پہلے آسٹریا ہنگری کے علاقے میں شامل تھا اور آسٹریا ہنگری کا صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر ۱۸۶۷ء میں ایک آئین کی رو سے ہنگری کے نظم و نسق میں خود مختاری مل گئی اور وہ عملاً اپنے آپ کو آزاد سمجھنے لگا۔ پہلی جنگ عظیم میں ہنگری نے آسٹریا کا پورا پورا ساتھ دیا مگر اسی سلطنت میں رہنے والی دوسری قوموں کو آزادی دینے کا وعدہ کر کے اتحادیوں نے ان میں خانہ جنگی کی صورت پیدا کر دی۔ بعد ازاں ٹریانون کے صلح نامے کے بموجب جب میگیار قوم کی ایک تہائی تعداد یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی حدود میں شامل کر دی گئی تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی، میگیار قوم ان تینوں نسلوں کو اپنے سے کمتر جانتی تھی اور اسی لیے ان کی آقائی تسلیم کرنے سے عاری تھی۔ پھر ان قوموں کی طرف سے میگیار قوم پر سختیاں کی جاتی تھیں۔ چنانچہ لاکھوں کی تعداد میں میگیار لوگ بوڈاپسٹ میں پناہ گزین بن کر آ گئے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر ہنگری کی نئی حکومت کے وزیر اعظم نے استعفیٰ دے دیا اور اس کے چند روز بعد بیلاکن نام ایک سوشلسٹ لیڈر نے ہنگری میں اشتراکی جمہوریت قائم کر دی۔

اشتراکی حکومت کا قیام کسی سرمایہ دار ملک کے لئے قابل برداشت نہیں۔ چنانچہ اتحادی گھبرا اٹھے۔ خصوصاً فرانس بہت پریشان ہوا اور اس نے رومانیہ کو ہنگری پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار کیا۔ رومانوی سپاہیوں نے ہنگری میں داخل ہو کر خوب تباہی مچائی اور اشتراکیت کا خاتمہ کر دیا۔ مگر اس قتل و غارت کی ذمہ داری اشتراکیوں ہی پر ڈال دی گئی۔ اشتراکی لیڈر اس کے ذمہ دار قرار دیے گئے۔ ہنگری کے عوام اتحادی مکروں کے دام میں آ گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اشتراکی ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اشتراکیوں کا لیڈر بیلاکن یہودی تھا۔ اسی لیے اہل ہنگری یہودیوں کے خلاف جوش انتقام سے بھر گئے اور چن چن کر یہودیوں کو قتل کرنے لگے۔

چونکہ ہنگری کی تقسیم سے میگیار نسل کے بہت سے افراد دوسرے علاقوں میں بھیج دیئے

گئے تھے۔ پھر یہ کہ ۱۹۲۰ء کے صلح نامہ کی رو سے سابق شاہی خاندان میں سے کسی کو ہنگری کا بادشاہ نہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس لیے اہلِ ہنگری اتحادیوں سے ناراض تھے اسی دوران میں دوسری جنگ عظیم کے آثار نمودار ہوئے تو اعلانِ جنگ سے چند ماہ قبل فروری ۱۹۳۹ء میں ہنگری نے جرمنی کے ساتھ مل کر روسی اشتراکیت کے ایک معاہدے پر دستخط کر دیے۔ پھر ۱۹۴۰ء میں جرمنی، اٹلی اور جاپان کے ساتھ دوستی اور اتحاد کا معاہدہ کر لیا۔

جرمنی کی خواہش تھی کہ ہنگری بھی اعلانِ جنگ کر دے مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ بالآخر ۱۹۴۴ء میں جرمن فوجوں نے ہنگری پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی کی شکست اور دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر ہنگری کمیونسٹوں کے زیرِ اقتدار آ گیا اور پورا انتظام کمیونسٹوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں عام انتخابات کا اعلان ہوا۔ انتخابات میں کمیونسٹوں کو ایوان میں اکثریت حاصل ہو گئی اور انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق وزارت بنالی۔ ۱۹۴۸ء میں جاگیرداروں کی ذاتی ملکیت ختم کر کے انہیں قومی ملکیت بنا دیا گیا۔

باب ۳۲ پہلی جنگ عظیم

بنیادی وجوہ

یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد جہاں قومی آزادی کا جذبہ شدت اختیار کر گیا تھا وہاں تجارتی منڈیوں، نوآبادیوں، اور اہم تجارتی اڈوں پر غلبہ اور اقتدار حاصل کرنے کا رجحان بھی یورپ کی تمام قوموں میں جڑ پکڑ چکا تھا اور ان مقاصد کے لیے تمام قومیں مختلف حربوں سے آپس میں نبرد آزما تھیں۔

یورپ اگرچہ فکری، تہذیبی، تجارتی اور صنعتی لحاظ سے دنیا کے دوسرے ملکوں سے بہت آگے نکل چکا تھا، تاہم یورپ کی سرزمین معدنی یا نباتی لحاظ سے زیادہ زرخیز نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں افریقہ اور ایشیا کے ملک ان تمام قدرتی ذخائر سے مالا مال تھے۔ جن کی ضرورت یورپ محسوس کر رہا تھا۔ ان براعظموں کی سرزمین میں سونا اگلنے کی جو صلاحیت تھی، وہ یورپ کی تمام قوموں کو اپنی طرف مائل کر رہی تھی اور ہر ایک قوم ان ملکوں میں اپنا اقتدار قائم کرنے کی خواہاں تھی۔

ایک طرف اہلِ یورپ کو قدرتی ذخائر والے علاقوں کی تلاش اور ان پر قبضہ کرنے کی خواہش تھی تو دوسری طرف ان دولت مند علاقوں یعنی ایشیا اور افریقہ میں بسنے والوں کی یہ کیفیت تھی جیسے وہ ان ذخائر کی حفاظت کرنے یا ان سے استفادہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ اس صورتِ حال نے یورپی اقوام کی اس رقابت کو جو ابھی تک چند منڈیوں یا شاہراہوں کے حصول کی جدوجہد تک محدود تھی اور زیادہ وسیع اور شدید کر دیا۔ چنانچہ دولت کے ان گراں بہا خزینوں پر قوت کے بل قبضہ کرنے کے لیے یورپ کی ہر قوم مضطرب ہو گئی۔

سیاسی حالات

انگلستان اور فرانس اس ضمن میں دوسری قوموں سے سبقت لے جا چکے تھے۔ ان کے پاس خاصی تعداد میں نوآبادیات موجود تھیں جن میں وہ اپنے مال کی تجارت کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس دوسری قومیں ان فائدوں سے محروم تھیں۔ آسٹریا اور ہنگری کے پاس کوئی نوآبادی نہ تھی۔ جرمنی کے پاس چند نوآبادیات تھیں، مگر ان تک پہنچنے کے راستے دشوار گذار تھے۔ بحرِ روم کے اہم ناکے جبل طارق سے مالٹا، نہر سویز، عدن، سنگاپور، خلیج فارس اور ہانگ کانگ تک کے راستے پر انگریزی اقتدار تھا۔ امریکہ میں انگلستان کے بعد جمہوریہ امریکہ نے قبضہ کر رکھا تھا۔ روس میں زارِ روس کی شہنشاہیت بہت خطرہ میں تھی اور وہ اپنے تحفظ کے لئے ترکی، ایران اور چین کے ساحلوں تک اپنی سلطنت کی حدود وسیع کرنے کی کوشش میں تھا۔

سلطنت عثمانیہ کی تمام منڈیوں پر یورپی سرمایہ داروں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ زرِ مبادلہ اور سکے تمام کاروبار یورپ والوں کے ہاتھ میں تھا۔ تمام بڑے بنکوں میں یورپین سرمایہ لگا ہوا تھا۔ تمام کچا مال یورپ جاتا تھا۔ جہاں مشینوں میں مال تیار ہو کر ترکوں، اور عربوں کے پاس فروخت کیا جاتا۔ غرض سلطنتِ عثمانیہ پورے انتشار اور غیر ملکی اقتدار کے شکنجے میں تھی جس سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کے یورپی مقبوضات یکے بعد دیگرے علمِ بغاوت بلند کر رہے تھے۔ بلقان و یونان کے معرکے شروع ہو چکے تھے۔ افریقہ کے شمال میں مراکش، الجزائر، طرابلس، تیونس اور مصر کے علاقوں پر یورپی اقوام قبضہ کر چکی تھیں۔

یورپ کے وسطی اور مشرقی علاقوں میں کئی قومیں آباد تھیں یہ سب اپنی آزادی اور خود مختاری کا تہیہ کئے بیٹھی تھیں اور اس مقصد کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھیں۔

جرمنی نے سلطان ترکی کی اجازت سے ۱۸۹۹ء میں بغداد تک خشکی کا نیا راستہ بنانے کا کام شروع کر دیا تھا تاکہ ایشیا کی تجارت کا راستہ مل سکے اور عرب اور ترکی کی تجارتی منڈیوں میں اسے غلبہ حاصل ہو جائے۔ جرمنی نے اس راستے پر ریل کی پٹڑیاں بچھانی شروع کر دی تھیں۔ برطانیہ کو جرمنی کی ان سرگرمیوں سے خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں وہ مشرق میں برطانوی اقتدار کو چیلنج نہ کرنے لگ جائے۔

فرانس کی سرحدیں جرمنی سے ملتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جرمنی کے فلسفیوں اور حکماء نے اہلِ جرمنی میں نسلی برتری کا شدید احساس پیدا کر دیا کہ وہ دنیا کی منتخب اور برگزیدہ نسل ہیں۔ ان کی تہذیب دنیا کی سب تہذیبوں سے افضل ہے۔ اس لیے ان کا فرض ہے کہ ساری دنیا کو اپنے اقتدار کے ماتحت لے آئیں اور اسے مہذب اور متمدن بنائیں۔ یورپ کی دوسری قوموں کو اہلِ جرمنی کے ان جذبات نے مزید خوفزدہ کر دیا کہ کہیں وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی ایسا طوفان نہ کھڑا کر دیں جس کے نتیجے میں وہ سب پر غلبہ حاصل کر جائیں۔

جنگ کے محرکات

جنگ عظیم کا بڑا سبب وہ کدورت ہے جو انیسویں صدی کے اوائل میں مراکش کے مسئلہ پر فرانس، جرمنی اور برطانیہ کے درمیان پیدا ہو چکی تھی۔ بعض وجوہ کی بنا پر افریقہ کا یہ شمال مشرقی گوشہ اہلِ یورپ کے لیے تجارتی اور سیاسی لحاظ سے بہت اہم تھا۔ اس لیے جرمنی، برطانیہ اور فرانس کی نگاہیں خاص طور سے اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ مراکش کی اہمیت یوں تھی کہ وہ جزائر کے عین بالمقابل ہونے کے باعث برطانیہ کے بحرِ روم والے راستہ میں حائل تھا، اور اس کا ساحل بحرِ اوقیانوس پر واقع ہونے کے باعث وہ جنوبی افریقہ کو جانے والے جہازوں کے لیے خطرہ بن سکتا تھا مراکش کی مشرقی سرحد الجزائر سے ملتی ہے جو فرانس کے قبضے میں تھا۔ علاوہ ازیں اس میں لوہے کی کانیں ہیں اور اس کے باشندوں کو فوجی لحاظ سے کام میں لایا جا سکتا ہے۔

برطانیہ کی یہ خواہش تھی کہ مراکش اس کے قبضے میں آ جائے تاکہ ہندوستان جانے کا راستہ محفوظ رہے۔ یہی خواہش فرانس کی تھی۔ اس سلسلے میں برطانیہ اور فرانس کے درمیان جوڑ توڑ ہوتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ رقابت بڑھتی رہی۔ بعد ازاں جرمنی بھی اس جوڑ توڑ اور رقابت میں شریک ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں مراکش کے سوال پر جرمنی اور فرانس میں ایک جھڑپ ہوئی۔ دوسرے سال اختلافات ختم ہو گئے مگر تینوں طاقتوں کے درمیان کدورت پیدا ہو چکی تھی۔

مراکش کے علاوہ طرابلس کا مسئلہ بھی اس صورت سے جنگ عظیم کا محرک بن کر انیسویں صدی کے نصف آخر میں فرانس، تیونس پر پورا اقتدار حاصل کر چکا تھا۔ اب اس نے طرابلس کو زیرِ اثر لانا چاہا۔ مگر اٹلی جو بحیرۂ روم میں اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا، طرابلس پر قبضہ کرنے

کا خواہاں تھا، چنانچہ اس نے جرمنی سے معاہدہ کر لیا کہ اگر فرانس نے مراکش یا طرابلس میں اپنا اقتدار بڑھانے کی کوشش کی تو دونوں مل کر مزاحمت کریں گے۔ اٹلی نے ایک خفیہ معاہدے کے ذریعے برطانیہ سے یہ گٹھ جوڑ کر لیا کہ وہ طرابلس میں اٹلی کی مداخلت پر خاموش رہے تو اٹلی بھی مصر میں برطانیہ کی مداخلت پر چشم پوشی سے کام لے گا۔ پھر اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر کے وہاں اطالوی جھنڈا گاڑ دیا۔ جرمنی، روس اور آسٹریا ہنگری اٹلی کی اس حرکت پر سیخ پا ہو گئے۔

روس، ترکی اور آسٹریا ہنگری ایک مدت سے بلقان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے چلے آ رہے تھے، چنانچہ یہ علاقہ ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گیا۔ آسٹریا ہنگری اور روس کی رقابت زیادہ شدت پر تھی۔ ۱۹۱۱ء میں روس نے اپنی فوجی طاقت میں زبردست اضافہ کر کے اپنی مغربی سرحدوں پر خالص جنگی اغراض کے پیش نظر طویل ریلوے لائنیں بچھا دیں۔ سربیا نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ اگرچہ جنگ کے لیے تیار نہیں، تاہم جنگ کی صورت میں خاموش نہ رہے گا۔

۱۸۹۹ء میں حکومت ترکی نے قسطنطنیہ سے بغداد تک جو ریلوے لائن تعمیر کی اس کا سارا کاروبار جرمنی، فرانس اور برطانیہ مل کر چلاتے رہے۔ بعد ازاں اسے کمل فریب قرار دے کر ۱۹۰۳ء میں برطانیہ اس سے علیحدہ ہو گیا۔ کہا یہ گیا کہ اس سے برطانوی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے اور اس کے برعکس جرمنی کو فائدہ۔ جرمنی اس راستے سے ایشیائے کوچک میں اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بعد ازاں ریلوے کی یہ اسکیم واحد جرمنی کے تصرف و اختیار میں رہ گئی۔

روس کو بھی اس ریلوے کے خطرہ لاحق تھا۔ مگر جرمنی نے شمالی ایران میں اس کا حلقۂ اثر مان لینے کے بعد وعدہ کیا کہ وہ ایران میں کوئی تجارتی مراعات حاصل نہ کرے گا۔ جرمنی کے اس رویے نے روس کو مطمئن کر دیا، مگر ساتھ ہی برطانیہ کی تشویش بڑھا دی، کیونکہ ہندوستان کی وجہ سے ایران کی اہمیت اس کے نزدیک بہت زیادہ تھی اور وہ اس میں روسی اثر و رسوخ کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔

ڈکنس کے الفاظ میں "جنگ عظیم کا ایک بڑا سبب ترکی کی وسیع مگر غیر ترقی یافتہ، غیر محفوظ اور غیر منظم سلطنت پر اقتدار حاصل کرنا تھا۔" ترکی سلطنت اٹھارویں صدی سے روبہ انحطاط ہوتی چلی آ رہی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں وہ یورپ کی ایک بالکل گئی گذری سلطنت سمجھی جاتی تھی اور ہر یورپی طاقت اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی۔

غرض جنگ عظیم سے پہلے دنیا کی حالت ایک ایسے بارود خانے کی سی ہو چکی تھی جو فقط ایک چنگاری کی منتظر ہو۔ قدرت نے اس چنگاری کا بھی اہتمام کر دیا جو سربیا کے صدر مقام سراجیوو سے اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے امن عالم کو خاکستر کر کے رکھ دیا۔

جنگ کی چنگاری

ہوا یہ کہ آسٹریا کے شہزادے فرڈیننڈ کو سربیا کے ایک مقام سراجیوو میں کسی نے قتل کر دیا۔ بس اسی حادثے کو بہانہ بنا کر جنگ کا آغاز کر دیا گیا۔ آسٹریا نے سخت شرائط کے ساتھ سربیا کو الٹی میٹم دے دیا۔ سربیا کے انکار پر ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو آسٹریا نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ایک خوفناک جنگ کے آتش خیز شعلے پہلے تمام یورپ ہی میں بھڑک اٹھے پھر سارے براعظم اس کی لپیٹ میں آ گئے۔

روس سربیا کی مدد پر اتر آیا۔ پھر روس کا حلیف فرانس بھی جنگ میں شریک ہو گیا۔ ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو انگلستان اور اس کے حلیف جاپان نے جرمنی کے خلاف جنگ میں شمولیت کر دی۔ ادھر جغرافیائی اعتبار سے ترکی بھی جرمنی کی مدد پر مجبور تھا۔ ۱۹۱۵ء میں اٹلی انگریزوں سے مل گیا۔ امریکہ ابھی غیر جانبدار تھا، لیکن جب ۱۹۱۷ء میں جرمنی کی آبدوز کشتیوں نے اس کے تجارتی جہازوں کو تباہ کیا تو وہ بھی جرمنی کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑا۔ گویا ایک طرف جرمنی، ترکی، آسٹریا اور بلغاریہ تھے تو دوسری طرف انگلستان، روس، فرانس، بلجیم، جاپان، اٹلی، سربیا اور امریکہ۔ مختصر یہ کہ اس جنگ میں یورپ کی تمام طاقتوں نے شرکت کی۔

تفصیلی واقعات

جنگ عظیم کے واقعات بہت طویل ہیں۔ یہاں صرف ان کا اجمالی خاکہ پیش کیا جائے گا۔ جرمنی نے سب سے پہلے بلجیم پر حملہ کیا اور اسے تباہ کر کے فرانس کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ مارن کی لڑائی میں فرانس نے جرمن فوجوں کو پسپا کر دیا پھر بحیرۂ شمالی سے سوئٹزرلینڈ تک خندقیں کھود کر تین سال تک لڑتے رہے لیکن کسی کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔

ادھر روسی فوجوں نے آسٹریا اور پرشیا (جرمنی) کا کچھ علاقہ فتح کر لیا مگر بعد میں جرمن جرنیل ہنڈن برگ نے روسیوں کو شکست دی۔

جرمنی اور آسٹریا کی متحدہ فوجوں نے پیش قدمی کر کے وارسا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں جمہوریت پسند (بالشویک) برسر اقتدار آئے تو انہوں نے جرمنی سے صلح کر لی۔

ترکی نے نومبر ۱۹۱۴ء میں جنگ میں شرکت کی اور جرمنی کے حلیف بن گئے۔ جزیرہ نمائے گیلی پولی میں انہوں نے اتحادی فوجوں کو پسپا کر دیا۔

اتحادیوں نے قط العمارہ اور بغداد فتح کرنے کے بعد یروشلم اور اس کے آس پاس کے علاقے فتح کر لیے۔ اس اثنا میں عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور انگریزوں نے عراق، عرب، شام اور فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ ترکوں نے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی۔

یورپ سے باہر جرمنی مقبوضات مثلاً کیمرون، ٹوگولینڈ، جرمن مشرقی افریقہ اور جرمن جنوبی افریقہ، جزیرہ کیوچو پر اتحادیوں نے قبضہ کر لیا۔

بحری جنگ میں اول جرمنی نے بہت کامیابی حاصل کی، اور کئی برطانوی اور امریکی جہاز غرق کر دیے مگر بعد ازاں مئی ۱۹۱۶ء میں جوٹ لینڈ کی بحری لڑائی میں انگریزی بیڑے نے اسے زبردست شکست دی۔

۱۹۱۸ء کے شروع میں جرمنی نے زبردست قوت کے ساتھ پیش قدمی کر کے فرانسیسی فوجوں کو پیچھے دھکیل دیا اور جرمن فوجیں دریائے مارن تک جا پہنچیں مگر اتحادیوں نے جن میں اب امریکی فوجیں بھی شامل ہو چکی تھیں، فرانسیسی جرنیل فوش کی سرکردگی میں جرمنی کو شکست دی۔

اس شکست کے بعد جرمنی کو پیہم شکستیں ہونے لگیں اور اس کے حلیفوں کو بھی جا بجا نقصان پہنچنے لگا۔ چنانچہ ۲۸ ستمبر ۱۹۱۸ء کو بلغاریہ نے اور ۴ نومبر کو آسٹریا نے ہار مان لی اکتوبر میں ترکی نے ہتھیار ڈال دیے۔ قیصر جرمنی ہالینڈ چلا گیا۔ اب جرمنی نے صلح کی درخواست کی اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو عارضی صلح نامے کی رو سے جنگ ختم ہو گئی۔

عہد نامۂ ورسائی

۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو ورسائی کے مقام پر صلحنامہ مرتب کیا گیا جس میں جرمنی کے نمائندوں نے دستخط کیے شرائط یہ تھیں۔

۱۔ السس اور لورین کے صوبے فرانس کو واپس دیے گئے اور طے پایا کہ دریائے رائن کے کنارے پر جرمنی نہ اپنی فوجیں رکھے گا اور نہ قلعہ بندی کرے گا۔

۲۔ جرمنی کا بحری بیڑا چھین کر اس کی بری فوج میں کمی کر دی گئی۔

۳۔ جرمنی سے اس کے تمام مقبوضات اور نوآبادیات لے لیے گئے۔ افریقہ میں تمام جرمن مقبوضات پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔

۴۔ سار کا علاقہ جس میں کوئلے کی کانیں ہیں، پندرہ سال کے لیے فرانس کو دے دیا گیا۔

۵۔ ہنگری اور آسٹریا کے کچھ حصے بوہیمیا کے ساتھ ملا کر چیکوسلواکیہ کے نام سے ایک نئی خود مختار سلطنت قائم کی گئی۔

۶۔ جرمنی پر گیارہ ارب پونڈ کی رقم تاوان جنگ کے طور پر ڈال گئی جسے اس نے قسطوں میں ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

۷۔ روس جرمنی اور آسٹریا کے کچھ حصوں کو ملا کر ایک نیا خود مختار ملک پولینڈ بنایا گیا۔ جرمنی کی بندرگاہ ڈینزک کو آزاد کر کے تجارتی اغراض کے لیے پولینڈ کو دے دیا گیا

۸۔ ترکی کو شام، فلسطین اور عراق کے علاقوں سے محروم کر دیا گیا۔ شام فرانس کے قبضے میں چلا گیا اور فلسطین و عراق پر انگریزی قبضہ ہو گیا۔ دردانیال انجمن بین الاقوام کے ماتحت رکھا گیا اور نہایت مختصر سا علاقہ ترکی کے پاس رہ گیا۔

۹۔ آئندہ دنیا کی مختلف قوموں کے جھگڑے فیصلہ کرنے اور دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے انجمن اقوام قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

نتیجہ

آسٹریا ہنگری :۔ اس جنگ کے نتیجے میں نہ صرف جرمنی کی تمام نوآبادیاں چھن گئیں، بلکہ یورپ میں بھی اس کا بہت سا علاقہ کاٹ کر دوسری سلطنتوں میں شامل کر دیا گیا۔ یعنی یورپ میں ۲۷ ہزار دو سو پچاس مربع میل رقبے اور بیرون یورپ ۱۱ لاکھ اٹھارہ ہزار مربع میل رقبے سے جرمنی کو ہاتھ دھونا پڑے علاوہ ازیں نقصانات کی تلافی کے لیے ایک بہت بڑی رقم تاوانِ جنگ کے طور پر ادا کرنی پڑی۔

آسٹریا ہنگری کے شاہی خاندان کو معزول کر کے جمہوریت نافذ کی گئی آسٹریا اور ہنگری کی حکومتیں الگ کر دی گئیں۔ ان کے کچھ علاقے کاٹ کر دوسری حکومتوں کو دے دیے گئے۔ آسٹریا میں اگرچہ ۹۰ فیصد جرمن آبادی ہے تاہم اس پر قید لگا دی گئی کہ وہ جرمنی کے ساتھ کسی قسم کا اتحاد نہ کرے گا۔ ہنگری کو پابند کیا گیا کہ نہ وہاں شاہی خاندان کا کوئی فرد تخت نشین کیا جائے گا اور نہ آسٹریا سے کسی قسم کا کوئی تعلق رکھا جائے گا۔

ترکی :۔ معاہدہ سیورے کی رو سے ایشیائے کوچک کے سوا باقی سب علاقے ترکی سے علیحدہ کر دیے گئے۔ ایشیائے کوچک کے شمال میں بحر اسود کا ساحلی علاقہ اتحادی کمیشن کے سپرد ہوا۔ سمرنا اور اس کے گرد و نواح کا ایک وسیع علاقہ یونان کو ملا۔ جنوبی ساحل کا ایک زرخیز ٹکڑا اٹلی کو دے دیا گیا۔ تھریس یونان میں شامل کر دیا گیا۔ اس تقسیم کے بعد جو بنجر بے آب و گیاہ اور بے کار قسم کا علاقہ بچا، وہ ترکی کے پاس نہ رہنے دیا۔

بلادِ عرب

نجد کا علاقہ بدستور ابن سعود کے پاس رہنے دیا گیا باقی علاقوں کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ عرب کے مشرقی ساحل پر کویت اور عمان کے صوبے اور عراق و مصر برطانیہ کے سپرد کر دیے گئے۔ شام فرانس کے زیر اثر آگیا۔ فلسطین کو شام سے الگ کر کے اسے برطانیہ کے قبضے میں دے دیا گیا تاکہ یہودیوں کا وطن بنا دیا جائے۔ حجاز کی ساحلی پٹی پر شریف حسین کی حکومت تسلیم کی گئی۔

یورپ

یورپ کا نقشہ بھی بدل دیا گیا۔ روس سے اس کے صوبے فن لینڈ، اسٹونیا، لٹویا اور لتھوانیا لے کر انہیں چار آزاد ریاستیں بنا دیا گیا۔ علاوہ ازیں روس اور جرمنی سے مزید علاقے لے کر پولینڈ کے نام سے ایک اور آزاد حکومت قائم کر دی گئی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔ آسٹریا ہنگری کی سابق سلطنت کو دو علیحدہ علیحدہ ریاستیں بنا کر چون ہزار مربع میل کا ایک اور علاقہ اس سے علیحدہ کر کے چیکوسلواکیہ کے نام سے ایک جداگانہ حکومت بنائی گئی۔ رومانیہ کو آسٹریا، ہنگری، روس اور بلغاریہ کے کچھ علاقے دے کر اس کی وسعت دگنی کر دی گئی۔ سربیا کو بھی آسٹریا ہنگری کے کچھ صوبے دے دیے گئے۔ مانٹی نیگرو کی حکومت بھی سربیا میں شامل کر دی گئی اس طرح یوگوسلاویہ کے نام سے ایک اور ریاست قائم ہو گئی۔ یونان کو بلغاریہ کا کچھ علاقہ مل گیا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد دو تین سال کے اندر اس تقسیم کے طفیل دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ بظاہر فاتح اقوام نے دنیا کی جمہوریت کو محفوظ کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن باطن میں انسانی حریت و آزادی کو کند چھری سے ذبح کرنے کا کام بخیر انجام دیا تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس تقسیم کے خلاف دنیا کے مختلف گوشوں سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ تاریخ میں آئندہ رونما ہونے والے واقعات جنگ عظیم کے فاتحین کی انہیں چیرہ دستیوں کا نتیجہ تھے۔ جن کا مظاہرہ انہوں نے معاہدہ ورسائی اور ملکوں کی تقسیم کی شکل میں کیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم

تمہید

پہلی جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں کی طرف سے جو اعلانات کیے گئے ان کی روشنی میں امید کی جاتی تھی کہ فاتحین مفتوحین کے ساتھ عدل و انصاف کریں گے۔ علاوہ ازیں امریکہ کے صدر ولسن نے جو چودہ نکات پیش کیے، ان میں بھی انصاف اور امن و صلح کا واضح پتہ چلتا تھا۔ دنیا کے ہر کونے میں ان چودہ نکات کا خیر مقدم کیا گیا۔ ولسن کے نکات میں چند ایک یہ تھے کہ آئندہ کبھی کوئی خفیہ معاہدہ نہ کیا جائے۔ بلکہ ہر معاہدہ اعلانیہ ہو۔ امن اور جنگ دونوں حالتوں میں ہر ملک اپنے ارد گرد کے سمندروں کے علاوہ دنیا کے تمام سمندروں میں آزادانہ جہاز رانی کر سکتا ہے دنیا کی معاشی اور تجارتی ترقی میں حائل ہونے والے ہر موانع کو دور کیا جائے۔ اسلحہ بندی کم کر دی جائے۔ صرف ملک کی اندرونی ضروریات کے مطابق اسلحہ بنایا جائے۔ روس کے مفتوحہ علاقے اسے واپس کیے جائیں۔ آسٹریا ہنگری کے باشندوں کو آزاد اور خود مختار رہ کر ترقی کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ ترکوں کو آزاد اور خود مختار حکومت بنانے کا موقع دیا جائے۔ قوموں کی ایک عمومی انجمن بنائی جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ تمام چھوٹی بڑی قوموں کو مکمل سیاسی آزادی کے مواقع دیے جائیں اور وہ دوسروں کی دستبرد سے محفوظ رہیں۔

ولسن نے دنیا کی مشکلات کا صحیح حل پیش کر دیا تھا اور دنیا کی تمام قومیں اس سے متفق تھیں چنانچہ عمومی انجمن بنانے کے سلسلے میں بھی دنیا کی بیشتر قوموں نے اس کا ساتھ دیا اور ۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو انجمن اقوام عالم وجود میں آگئی۔ چند ہی سال میں [illegible] ملک اس انجمن کے ممبر بنے جن میں فرانس، جرمنی، انگلستان، اٹلی، جاپان، روس اور امریکہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس مجلس کے اغراض و مقاصد یہ تھے:۔

۱۔ دنیا بھر کے ملکوں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کر کے جنگ کو روکنا۔

۲۔ مخالف قوموں میں سمجھوتہ کرانا۔

۳۔ ملکی تنازعات کے لیے ایک بین الاقوامی عدالت قائم کرنا۔

۴۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مزدوروں کی اصلاح کے لیے قوانین مرتب کرنا۔

۵۔ فوجوں کی تعداد اور سامانِ اسلحہ میں کمی کرنا تاکہ جنگ کا امکان نہ رہے۔

۱۰۔ حفظانِ صحت، تعلیم اور دوسری بنیادی ضروریات کے سلسلے میں اقوامِ عالم کی مدد کرنا۔

ابتدا میں اس انجمن نے بعض مفید کام کیے، مثلاً سویڈن اور فن لینڈ کے جھگڑے چکائے۔ سار کے متعلق جرمنی اور فرانس کے درمیان تصفیہ کرا دیا۔ اٹلی اور یونان کے مابین صلح کرائی۔ اسی طرح سامان اسلحہ کم کیا اور مزدوروں کی اصلاح کے لیے کچھ کام کیا۔ مگر نہ تو دنیا نے ولسن کے چودہ نکات پر عمل کیا، نہ انجمن اقوام اس بنیادی فرض سے عہدہ برا ہو سکی۔ جس پر انجمن کی عمارت تعمیر کی گئی تھی یعنی جلد ہی قومیں امن پسندی سے تنگ آ گئیں اور جنگ و جدال کے آثار نمودار ہونے لگے۔

دراصل پہلی جنگ عظیم ختم نہیں ہوئی تھی، بلکہ معرض التوا میں پڑ گئی تھی۔ اس لیے کہ معاہدہ ورسیلز نے ثابت کر دیا تھا کہ فرانس، برطانیہ اور امریکہ نے ملکوں کی تقسیم کے سلسلے میں خودغرضانہ رویہ اختیار کیا ہے اور مفتوحین کے حقوق کو بے دردی سے کچلا ہے۔ اس عہد نامے میں مفتوح کے مفاد پر غور کرنا تو درکنار اسے یہ موقع ہی نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے نظریات کی وضاحت کر سکے۔ جرمنی نے اس عہد نامے پر بہ رضا و رغبت دستخط نہیں کیے تھے بلکہ زبردستی کرائے گئے تھے۔ چنانچہ یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ جرمنی کی حالت اگرچہ کمزور پڑ چکی تھی تاہم انتقامی جذبہ دلوں میں جوش پیدا کر رہا تھا۔ اسی جوش نے ہٹلر کو نئی تاریخ پر ابھارا اور دنیا ایک مرتبہ پھر عالمگیر جنگ کی ہولناکیوں سے ہمکنار ہو گئی۔

جنگ کے اسباب

دوسری جنگ عظیم کا بڑا سبب جرمنی کے ساتھ اتحادیوں کا وہ غیر منصفانہ اور نا روا سلوک ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کی کمزوری کے پیش نظر اس سے روا رکھا گیا اور جس کا ثبوت معاہدہ ورسیلز ہے۔ علاوہ ازیں اس جنگ کے اسباب میں بعض دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے۔ ان سب کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ معاہدہ ورسیلز کی دفعہ ۲۳۱ میں جنگ کا سارا الزام جرمنی پر عائد کیا گیا، مگر اتحادیوں نے کوئی ایسا پروگرام وضع نہ کیا جس سے جرمنی اپنے قصور کا اعتراف کرکے بطریق احسن اس کی تلافی کر سکتی بلکہ اس کے برعکس ہر جائز ناجائز طریقے پر اسے دبائے رکھنے کی کوششیں جاری رہیں۔

۲۔ جرمنی ہتھیار ڈال چکا تھا، مگر اس کے باوجود اس کی معاشی ناکہ بندی جاری رہی جس نے جرمنی کے عوام کے دلوں میں اتحادیوں کے خلاف نفرت کا بیج بو دیا۔

۳۔ جرمنی پر تاوانِ جنگ کے طور پر جو رقم واجب الوصول قرار دی گئی وہ بہت ہی زیادہ تھی۔ اتحادیوں کا مقصد اس سے یہ تھا کہ جرمنی سالہا سال تک تاوان کی رقم ادا کرتا رہے گا تو اس کی معاشی حالت خراب ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا چند سال تک جرمنی یہ تاوان ادا کرتا رہا۔ بعد ازاں اس کی معاشی حالت خراب ہو گئی۔ جس نے عوام کے دلوں پر ایک اور چرکا لگایا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے معاملات میں آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کے لیے اپنے اندر قوت پیدا کرکے حریف طاقتوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ جرمنی میں نسلی تفاخر نے قوت پکڑی۔ یورپ کی تمام جرمن نسل کو متحد کرکے اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کا تصور ایسا ابھرا کہ ابھرتا چلا گیا۔ اس تصور نے جرمن عوام کے دلوں میں ہٹلر کے لیے ایسی جگہ پیدا کر دی کہ وہ اس کے ادنیٰ اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہو گئے۔

۵۔ جرمنی کی آبادی آٹھ کروڑ تھی مگر وہ خطۂ زمین جو پہلی جنگ عظیم کے بعد ان کے پاس رہ گیا تھا دو لاکھ تیس ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھا۔ ملک کی سمٹی ہوئی حدود کے اندر ان کے لیے آرام سے زندگی بسر کرنے اور ترقی پانے کی صورت نہ رہی تھی۔ چنانچہ ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں زندہ رہنے کے لیے اور زمین ملنی چاہیئے۔

۶۔ معاشی ترقی کے لیے جرمنی نے یہ ضروری سمجھا کہ وسطی یورپ کے جو علاقے جرمنی سے کاٹ کر علیحدہ کر دیئے گئے تھے انہیں دوبارہ حاصل کرکے ایک لڑی میں منسلک کر دیا جائے اس مقصد کے لیے اسے اپنی طاقت بڑھانے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

۷۔ جرمنی سے اس کی نوآبادیات اس بہانے چھینی گئی تھیں کہ اس نے ان کا انتظام ٹھیک طور پر نہیں کیا تھا۔ حالانکہ فرانسیسی نوآبادیات کی نسبت جرمن نوآبادیات کا انتظام بدرجہا بہتر تھا۔ مگر یہ الزام صرف جرمنی پر لگایا گیا جس سے صاف ظاہر تھا کہ جرمنی کے ساتھ اتحادیوں نے بدنیتی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جرمنی نے اسے شدید قومی نقصان سمجھا علاوہ ازیں اقتصادی بہبود کے لیے نوآبادیات اس کے لیے ناگزیر تھیں۔

جرمن نوآبادیات کو اپنے قبضے میں لے آنے کے بعد اتحادیوں نے وہاں جرمن مال کی فروخت کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ اس کے مقابلے میں وہاں اپنی تجارت کو فروغ دینے لگے۔ جرمنی چاہتا تھا کہ یا اسے اس کی نوآبادیات واپس دے دی جائیں یا پھر کسی بھی یورپی طاقت کو کوئی نوآبادی اپنے قبضے میں رکھنے کا کوئی حق نہ ہو اور دنیا کی ساری منڈیاں سب کے لیے یکساں کھلی رہیں۔

۸۔ جرمنی کے اردگرد سب ریاستیں برطانیہ و فرانس کے زیر اثر تھیں اور جرمنی کو یہ حق نہ تھا کہ برطانیہ و فرانس کی مرضی کے بغیر ان سے کوئی سمجھوتہ نہ کرے۔ جرمنی نے اس حصار میں رہنا گوارا نہ کیا اور اس کوشش میں لگ گیا کہ جتنی جلد ہو سکے اس ماحول سے نجات حاصل کرے ورنہ یہ ریاستیں کسی وقت بھی آپس میں مل کر اس کا گلا گھونٹ سکتی ہیں۔

۹۔ جرمن قوم میں قومی اتحاد اور تنظیم کا جذبہ شدت سے ابھر آیا تھا جس میں زندگی کے ہر شعبے کو اب مرکزی نظام کے ماتحت کر دیا گیا۔ ہٹلر اور اس کی پارٹی اس مرکزی نظام کے مختار کل بنا دیئے گئے۔ ہٹلر کو جرمنی کا واحد نجات دہندہ قرار دے کر ملک کے جملہ امور کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے دی گئی اور اسے جرمنی کا ڈکٹیٹر بنا دیا گیا۔

۱۰۔ کتابوں، رسائل، اخبارات، ریڈیو اور نشر و اشاعت کے دوسرے تمام طریقوں سے جرمن قوم کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ جرمن قوم قدرتی طور پر غیر معمولی سوجھ بوجھ اور بلند و بالا صلاحیتوں کی مالک ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں اتحادیوں نے ان کی صلاحیتوں کو پامال کرنے کی سازش کر رکھی تھی۔ لہٰذا اب متحد ہو کر انہیں ان کے خلاف نبرد آزما ہونا چاہیئے تاکہ جرمنی اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکے۔

۱۱۔ ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے ہٹلر نے نہ صرف جرمنی بلکہ پورے یورپ پر اپنا سکہ بٹھا دیا تھا۔ ہٹلر نے طے کر رکھا تھا کہ پہلی جنگ میں جرمنی اپنا جو وقار کھو بیٹھا تھا اسے وہ ہر حالت میں بحال کرکے رہے گا۔ چنانچہ اس نے جرمن قوم میں اتحاد و اتفاق اور سرفروشی کی روح پھونک کر انہیں ایک پلیٹ فارم پر لا جمع کیا اور دن رات اپنی قوت میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے بے پناہ قوت فراہم کر لی۔ اب وہ یورپ کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کو تیار تھا۔

۱۲۔ معاہدہ ورسیلز سے صرف جرمنی ہی تباہ نہ ہوا تھا بلکہ اس سے اٹلی، ہنگری اور روس کی بغاوت پر بھی زد پڑی تھی۔ اس لیے یہ ممالک بھی اتحادیوں سے ناراض تھے۔

۱۳۔ جمعیت اقوام جو مقاصد لے کر اٹھی تھی وہ ان پر عمل پیرا نہ ہو سکی۔ جاپان نے منچوریا پر حملہ کیا، پھر چین پر دھاوا بول دیا۔ اٹلی نے حبشہ پر قبضہ کیا۔ البانیہ کی آزادی چھینی۔ یونان پر زبردستی کی، مگر جمعیت اقوام نے کسی مظلوم کی مدد نہ کی۔ بلکہ اس کے برعکس زیادہ قوت والے ملک کی حمایت کی۔ جمعیت اقوام کے اس طرز عمل نے دوسرے ملکوں کو اس سے دل برداشتہ کر دیا جو امیدیں جمعیت اقوام سے کی جاتی تھیں، وہ باقی نہ رہیں۔

بلکہ صاف ظاہر ہوگیا کہ جمعیت جس سیاسی اخلاق کا دعویٰ کرتی ہے، وہ محض ڈھونگ ہے جو چند بڑی طاقتوں نے ذاتی اغراض پوری کرنے کے لیے رچا رکھا ہے۔

۱۴۔ ہٹلر نے پولینڈ سے بعض امور طے کرنا چاہے اور معاہدہ ورسیلز میں ترمیم کی خواہش ظاہر کی تو پولینڈ کی پیٹھ ٹھونک کر اسے ہٹلر سے اُلجھنے پر ابھارا گیا۔

۱۵۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان قوت کے زور سے اتحادیوں سے اپنے بعض مطالبات منوا چکے تھے مگر روس کے مطالبات پر توجہ نہ دی گئی۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ روس نے جرمنی سے معاہدہ کر لیا کہ ہم آپس میں نہ لڑیں گے۔ چنانچہ اپنے قریب ترین پڑوسی کی دوستی کا یقین ہو جانے کے بعد جرمنی کو کوئی اندیشہ نہ رہا اور اس کے لیے کسی وقت بھی میدانِ جنگ میں آنے کا راستہ صاف ہوگیا۔

۱۶۔ ہٹلر نے چیکوسلواکیہ پر حملہ کیا تو برطانوی وزیر اعظم چیمبرلین نے چیکوسلوکیہ کی مدد کرنے اور اسے جرمنی کے جارحانہ اقدام سے محفوظ رکھنے کی بجائے ہٹلر سے سمجھوتہ کر لیا اور پارلیمنٹ میں اعلان کر دیا کہ معاہدے یا قانون کی رو سے چیکوسلواکیہ کے معاملے میں ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

چیمبرلین کے اس رویے نے ثابت کر دیا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مطابق زبردست ہی کے سب طرفدار ہوتے ہیں ۱۹۱۸ء کے صحنامے پر اعتماد کرنا بیکار ہے۔

یہ تھیں وہ وجوہ جو دوسری جنگ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ جرمنی نے پہلی جنگ عظیم کے بعد ہٹلر کی سرکردگی میں اپنے آپ کو اتنا طاقت ور بنا لیا تھا کہ وہ اتحادیوں سے اس تمام ذلت آمیز کارروائی کا بخوبی انتقام لے سکے جو اس کے ساتھ روا رکھی گئی جرمنی کے سیاہ و سفید کا مالک بننے کے بعد ہٹلر نے اپنے پروگرام پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

جرمنی کے جارحانہ اقدامات

جرمنی کے جارحانہ اقدامات کی ابتدا ۱۱ر مارچ ۱۹۳۸ء کو آسٹریا پر قبضے سے ہوئی دوسری جنگ عظیم کی اصل ابتدا یہی تھی مگر اس سے پہلے جاپان اور اٹلی جنگ کے لیے راستہ ہموار کر چکے تھے یعنی ۱۹۳۱ء میں جاپان نے شمالی چین کے صوبہ منچوریا پر تسلط جما لیا پھر ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ (ایبی سینیا) کو اپنے پنجہ استبداد میں جکڑ لیا۔ اسپین میں خانہ جنگی ہے نزدہ اٹھا کر اٹلی اور جرمنی نے اس میں مداخلت کی اور باغی فوجوں کی مدد کر کے جنرل فرانکو کو اسپین کے تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔ ۱۹۳۷ء میں جاپان نے پورے چین پر تسلط جمانے کی نیت سے اس پر دھاوا بول دیا۔ یہ سب واقعات ہٹلر کے عزائم کو اور پختہ اور مشتعل کرنے کا موجب بنے چنانچہ اس نے آسٹریا کے لوگوں کی عام رائے لے کر ۱۱ر مارچ ۱۹۳۸ء کو وہاں جرمن فوجیں بھیج کر قبضہ کر لیا۔ آسٹریا کا چانسلر ملک سے نکال دیا گیا۔ پھر انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور اطالوی نمائندوں کی ایک کانفرنس میونخ میں طلب کی گئی جس میں چیکوسلواکیہ سے ملحقہ علاقہ سوڈین لینڈ طلب کیا گیا، جواز یہ تھا کہ وہاں اکثریت جرمنوں کی ہے، چنانچہ میونخ پیکٹ کے مطابق اکتوبر ۱۹۳۸ء میں یہ علاقہ جرمنی کو دے دیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۹ء ہٹلر نے چیکوسلواکیہ پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا۔

۱۹۳۹ء میں روس نے جرمنی سے غیر جارحانہ معاہدہ کر لیا یعنی یہ ایک دوسرے پر حملہ نہیں کریں گے۔

معاہدہ ورسیلز کی رو سے ڈینزگ کی بندرگاہ اور اس کا ملحقہ کاریڈور جرمنی سے کاٹ کر پولینڈ کو دیا گیا تھا۔ ہٹلر نے پولینڈ سے ان علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ پولینڈ طرف سے ابھی جواب موصول نہ ہوا تھا کہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔

برطانیہ اور فرانس کی شمولیت

برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ کو جرمنی کے حملہ سے بچانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے جرمنی کے اس اقدام پر حملہ کے تیسرے روز جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس طرح جرمنی کے خلاف دنیا کی دو بڑی طاقتیں برطانیہ اور فرانس متحد ہو کر میدان جنگ میں اتر پڑیں برطانیہ کے تمام مقبوضات نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

فرانس اور برطانیہ کی مدد پولینڈ کو نہ بچا سکی۔ ہٹلر نے ڈانزگ اور کاریڈار فتح کر لیے۔ اگرچہ پولینڈ کی فوجیں بڑی مردانگی اور بے جگری سے لڑیں، مگر جرمنوں کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ ہٹلر نے پولینڈ کے شہر فتح کرتے کرتے صدر مقام وارسا پر قبضہ کر لیا۔ مشرق کی طرف سے روس نے حملہ کر دیا اور اس طرف کا علاقہ بلا مزاحمت فتح کر لیا۔ ستمبر کے آخر میں سارا پولینڈ جرمنی کے تسلط میں آگیا۔ کچھ حصہ روس نے لے لیا۔ اس طرح پولینڈ کی آزادی کا مکمل طور سے خاتمہ ہوگیا۔

۱۹۴۰ء کے موسم بہار میں جرمنی کی ہوائی فوج نے ڈنمارک اور ناروے پر اچانک حملہ کر دیا۔ ڈنمارک کی مزاحمت کے بغیر اطاعت قبول کر لی مگر ناروے نے مقابلہ کیا۔ اتحادی افواج نے ناروے کی مدد کی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ جرمن فوجوں نے ناروے کے ایک ہزار میل لمبے ساحل پر قبضہ کر لیا اور ناروے کی سلطنت ختم ہوگئی۔

ناروے اور ڈنمارک سے فارغ ہونے کے فوراً بعد جرمنی نے ہالینڈ پر حملہ کر دیا جس نے معمولی مقابلے کے بعد ہتھیار ڈال دینے پھر بلجیم پر جہاں بڑی تعداد میں برطانوی اور فرانسیسی فوجیں موجود تھیں، حملہ کیا۔ خونریز جنگ کے بعد جرمنی کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ۲۸ر مئی ۱۹۴۰ء کو شاہ بلجیم نے اطاعت قبول کر لی۔ کثیر تعداد میں اتحادی افواج ڈنکرک کی بندرگاہ کے رستے سے بچ کر نکل گئیں۔ لیکن کروڑوں روپے کا سامان وہیں چھوڑ دیا۔ اتحادیوں کی پیہم شکستوں کے باعث انگلستان کے عوام وزیر اعظم چیمبرلین سے برگشتہ ہو گئے۔ چنانچہ اس نے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس کی جگہ چرچل وزیر اعظم مقرر ہوا۔

مئی ۱۹۴۰ء میں جرمنی نے لکسمبرگ بھی سمیٹ لیا۔

فرانس پر حملہ

اب جرمنی نے فرانس کا رخ کیا۔ بلجیم نے فرانس پر حملہ کیا اور چند ہی دنوں میں فرانسیسی شہریوں کو پامال کرتا ہوا پیرس تک جا پہنچا۔ دوسری طرف سے اٹلی نے بھی فرانس پر حملہ کر دیا۔ جرمن فوجوں نے فرانس کی مضبوط قلعہ بندی ریمینولائن پر قبضہ کر لیا۔ فرانس جنگ کی تاب نہ لا کر صلح پر آمادہ ہوگیا۔ ۲۲ر جون ۱۹۴۰ء کو عارضی صلح ہوگئی اور محوریوں یعنی جرمنی اور اٹلی کے مقابلہ میں برطانیہ اکیلا رہ گیا۔

اکتوبر ۱۹۴۰ء میں جرمنی نے رومانیہ کے تیل والے علاقے پر قبضہ کر لیا مارچ ۱۹۴۱ء میں بلغاریہ بھی محوریوں سے مل گیا۔ اسی ماہ ہٹلر نے یوگوسلاویہ پر گیارہ دن کی لڑائی کے بعد قبضہ کر لیا چند ملکوں کے سوا تمام یورپ جرمنی کے زیر اقتدار آگیا۔

مغربی محاذ پر اٹلی اور یونان کے درمیان جنگ چھڑ چکی تھی جس میں اٹلی کو پیہم شکستیں ہوئی تھیں۔ اٹلی کی اس نازک حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانیہ نے اٹلی کے افریقی مقبوضات پر حملہ کر دیا اور تمام مقبوضات برطانیہ کے قبضے میں آگئے۔ برٹش شمالی لینڈ جس پر ۱۹۴۰ء میں اٹلی قابض ہو چکا تھا، وہ انگریزوں نے واپس لے لیا۔ پھر ابی سینیا فتح کر کے اسے سابق شہنشاہ ہیل سلاسی کے حوالے کر دیا۔

انگلستان پر حملہ

۸ر اگست ۱۹۴۰ء کو جرمنی نے انگلستان پر ہوائی حملہ کیا۔ جرمنی کی شدید بمباری سے ہزارہا جانیں ضائع ہوئیں جرمنی نے مقناطیسی سرنگوں اور آبدوزوں کے ذریعے، انگلستان کے جہازوں کو تباہ کرنا

شروع کر دیا۔ انگلستان کے بمباروں نے بھی جرمنی پر بے شمار فضائی حملے کئے۔ ایک دوسرے کی فوجی چھاؤنیوں، کارخانوں، ہوائی اڈوں، تیل اور پٹرول کے ذخیروں کو تباہ کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ جرمنی کے شہروں، برلن، ہمبرگ اور کولون پر برطانوی جہازوں نے زبردست بمباری کی اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

روس پر حملہ

۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا چند ماہ کے اندر اندر جرمن فوجیں روس کے ڈیڑھ ہزار میل لمبے محاذ پر دور دور تک پھیل گئیں اور لینن گراڈ کو روس کے باقی حصوں سے کاٹ دیا۔ ماسکو کا محاصرہ کئی سال تک جاری رہا۔ مگر سردیوں کے موسم میں روسیوں نے جرمنوں پر شدید حملے کر کے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ جرمن فوجیں میدان میں ڈٹی رہیں پھر ہمت کر کے یوکرین اور کریمیا پر حملہ آور ہوئیں اور قفقاز تک پہنچ گئیں۔ روسی فوجوں نے بڑی مردانگی اور جرأت سے مقابلہ جاری رکھا یہاں تک کہ انہوں نے جرمنوں کو مار بھگایا۔ روسیوں نے برلن تک تعاقب کیا اور بہت سے جرمن علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ بلقان کی ریاستیں ایک ایک کر کے جرمنی سے الگ کر لیں۔ فن لینڈ نے بھی جرمنی کا ساتھ چھوڑ کر روس سے ناطہ جوڑ لیا۔

ادھر اٹلی نے یونان پر حملہ کیا۔ ادھر برطانیہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے، افریقہ میں اٹلی کے مقبوضات پر حملہ کیا اور ایبے سینیا فتح کر کے سابق بادشاہ ہیل سیلاسی کے حوالے کر دیا پھر لیبیا کے شہر سدی، طبروق، باردیہ اور بن غازی وغیرہ سنبھال لیے ۱۹۴۱ء میں جرمن فوجیں لیبیا میں داخل ہوئیں اور یہ تمام شہر اتحادیوں نے واپس لے لیے۔

اگست ۱۹۴۰ء میں اطالوی فوجوں نے برٹش شمالی لینڈ پر قبضہ کر لیا لیکن اسی سال مارچ میں برطانوی فوجوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد یہ علاقہ واپس لے لیا۔

مراکو اور الجیریا میں بھی کئی اہم مقامات پر برطانیہ نے قبضہ جما لیا۔

جب اتحادیوں نے افریقہ میں اطالوی مقبوضات پر قبضہ کر لیا تو برطانیہ نے اٹلی پر بھی حملہ کر دیا ورا ٹلی کو زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اٹلی کے لوگ اس نقصان اور پے در پے شکستوں کے باعث بہت دل برداشتہ ہو گئے۔ انہوں نے مسولینی کو الگ کر کے نئی حکومت بنا لی اور اتحادیوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ بعد ازاں جرمن فوج مسولینی کی مدد کے لیے اٹلی میں اتری اور مسولینی کو بحال کر دیا۔

ایشیا میں سب سے پہلے عراق اور شام جنگ کی لپیٹ میں آئے۔ پھر رفتہ رفتہ سارے ایشیا پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عراق کے وزیر اعظم نے برطانیہ کو عراق میں سے فوجیں گزارنے کی اجازت نہ دی بلکہ اس کے برعکس محوریوں سے ساز باز کرنے لگا۔ برطانیہ نے عراق پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ برطانوی فوجیں شام پر بھی قابض ہو گئیں۔

برطانیہ نے ایران سے مطالبہ کیا کہ وہ جرمن اور اطالوی فوجوں کو اپنے ملک سے نکال دے۔ ایران کے انکار پر اتحادی اور روسی فوجوں نے اس پر حملہ کر کے اپنا قبضہ جما لیا۔

جاپان کا اقدام

جاپان اب تک غیر جانبدار تھا جب اس نے محسوس کیا کہ برطانیہ اس جنگ میں اپنی جان بچانے کی فکر میں ہے ہالینڈ اور فرانس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ فرانس کی نوآبادیات فرانسیسی ہند چینی میں اپنے بحری اور ہوائی اڈے قائم کیے۔ پھر برطانیہ اور امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جرمنی اور اٹلی نے بھی ایسا ہی کیا۔ اسی طرح جاپان اور محوری ایک ہو گئے۔ امریکہ اس کے برعکس اتحادیوں سے مل گیا۔ جاپانیوں نے ابتدا میں برطانیہ کے جہاز غرق کیے۔ اسے بہت زیادہ جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ اتحادیوں کے جو مقبوضات چین کے ساحل پر واقع تھے یا اس کے قریب تھے، ان پر قبضہ کر لیا۔ جزائر فلپائن، انڈومان، جزیرہ نمائے ملایا، ہانگ کانگ، سنگاپور اور برما جاپان کے قبضے میں آ گئے۔ ہندوستان کے شہر کلکتہ اور چٹاگانگ پر جاپان نے ہوائی حملے کیے۔ برما اور آسام کی سرحد پر جاپان اور برطانیہ کے درمیان عرصے تک خونریز جنگ ہوتی رہی۔

جاپان پر امریکی حملہ

جاپان کی ان سرگرمیوں سے آسٹریلیا اور امریکہ کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا۔ چنانچہ امریکہ نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ امریکہ نے بحر الکاہل میں جاپان کو متعدد شکستیں دیں اور اسے خاصا نقصان پہنچایا۔

یورپ کے محاذ پر کیفیت یہ تھی کہ ابتداء میں برطانیہ نے جرمنی کے ہاتھوں بہت زک اٹھائی۔ بعد ازاں برطانیہ کا پلّہ بھاری ہو گیا۔ اس نے جرمنی کے بمبار جہازوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ محوریوں نے مقناطیسی سرنگوں اور آبدوزوں کے ذریعے بھی خوب دھاک بٹھائی۔ اتحادی بیڑا نہ صرف انگلستان کی حفاظت کر رہا تھا بلکہ وہ روس کو بھی سامان جنگ پہنچا رہا تھا۔

مارچ ۱۹۴۱ء میں امریکہ نے اعلان کر دیا کہ وہ اتحادیوں کو محوریوں کے خلاف ہر قسم کی مدد دے گا۔ چنانچہ اس آڑے وقت میں جبکہ انگریزوں کے پاس سامان حرب کی کمی واقع ہو رہی تھی اور مالی حالت بھی بہتر نہ تھی۔ امریکہ نے اسے اکیس ارب روپے کا جنگی سامان قرض دیا جس سے برطانیہ کو قوت پکڑنے کا موقع مل گیا اور وہ محوریوں کے خلاف جم کر لڑنے لگا۔

ہٹلر کی شکست

روس کے محاذ پر جب ہٹلر پورے جوش و خروش سے لڑ رہا تھا اور اسٹالن گراڈ میں شدید جنگ ہو رہی تھی، اتحادیوں نے لیبیا کے محاذ پر امریکن فوجیں اتار دیں اور اس کی تمام بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ کچھ فوجیں جرمنوں پر حملہ آور ہوئیں چنانچہ جرمنی کو اسٹالن گراڈ کے علاوہ لیبیا کے نئے محاذ کی طرف بھی توجہ دینی پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین چار ماہ کی جنگ میں جرمنی کو شکست ہو گئی۔ روسیوں نے تعاقب کر کے جرمنی کے ایک صوبے پرشیا اور صدر مقام برلن پر بھی قبضہ کر لیا۔

اتحادیوں نے نارمنڈی کے ساحل پر فوجیں اتار دیں۔ اب جرمنی کی توجہ اٹلی، روس اور فرانس تین محاذوں پر بٹ گئی اور اس نے ان جگہوں پر بھی شکست کھائی۔ اتحادیوں نے جرمنی کے تمام جنگی مراکز، کارخانوں اور شہروں پر شدید بمباری شروع کر دی جس سے جرمن قوم بوکھلا اٹھی۔

۱۹۴۴ء میں امریکہ نے جاپان کے بحری بیڑوں کو جزائر فلپائن کے قریب زبردست شکست دے کر بحر اوقیانوس کے جزائر پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا۔ پھر فلپائن بورنیو اور کئی دوسرے جاپانی مقبوضات بھی لے لیے۔

اسی سال جاپانی افواج برما سے منی پور روڈ پہنچ گئیں۔ مگر اتحادیوں نے انہیں زبردست شکست دے کر بھگا دیا۔ پھر برما کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔

رنگون بھی برطانیہ کے ہاتھ آ گیا جس سے ہندوستان اور اس کی سرحد پر جاپانیوں کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔

غرض اتحادی افواج نے جرمنی کی طاقت کا قلع قمع کر دیا۔ اب اس کے لیے جنگ جاری رکھنا محال ہو گیا۔ چنانچہ مئی ۱۹۴۵ء کو جرمنی نے غیر مشروط اطاعت قبول کر لی۔ مگر ہٹلر ۲۹ اپریل کو خودکشی کر چکا تھا۔

جاپان نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ امریکہ نے جاپانیوں کو برباد کرنے کے لیے دو

ہتھیار استعمال کیا جسے دنیا ایٹم بم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ جرمنی کے ہتھیار ڈالنے کے تین ماہ بعد ٦ اگست ١٩٤٥ء کو امریکہ نے جاپان کے ایک شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا جس نے لاکھوں کی آبادی والے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اسے کھنڈر میں تبدیل کر دیا۔ اس تباہی کے بعد روس نے بھی جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور ٨ اگست ١٩٤٥ء کو اپنی فوجیں منچوریا میں اتار دیں۔

٩ اگست کو جاپان کے دوسرے شہر ناگاساکی پر دوسرا ایٹم بم گرایا۔ جاپان اس قیامت خیز تباہی کی تاب نہ لا کر اطاعت پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ ٢ ستمبر کو اطاعت نامے پر دستخط ہو کر دنیا کی دوسری بڑی جنگ کا خاتمہ ہوا۔

جرمنی شکست کے بعد

جولائی ١٩٤٥ء میں پوٹسڈم کانفرنس ہوئی جس میں برطانیہ اور امریکہ کے نمائندے شریک ہوئے روس کی طرف سے سٹالن نے بذات خود شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جرمنی کے مستقبل کے متعلق فیصلے کئے گئے۔ عارضی طور پر نظم و نسق چلانے کے لیے جرمنی کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا برطانوی، فرانسیسی، امریکی اور روسی۔ پہلے تین ملکوں کی پالیسی میں کوئی بنیادی اختلاف نہ تھا، اس لیے ان تینوں کو ایک بلاک یا ایک حلقہ کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔ اس حلقے کی آبادی ساڑھے چار کروڑ کے قریب تھی اور یہ حلقہ صنعتی اعتبار سے جرمنی کا اہم ترین حلقہ تھا۔

روسی حلقے کی آبادی قریباً پونے دو کروڑ تھی۔ اگرچہ صنعتی اور غذائی لحاظ سے یہ حصہ زیادہ اہم نہیں، تاہم چونکہ برلن اس حصے میں واقع تھا اس لیے اس کی اہمیت فراموش نہیں کی جا سکتی۔

امریکہ و برطانیہ یہ چاہتے تھے کہ جرمنی کو ایک فیڈریشن بنا کر خود مختار بنایا جائے فرانس جرمنی کو ہمیشہ کے لیے کمزور اور ذلیل و خوار کر دینا چاہتا تھا۔ مگر مجبوراً اسے بھی امریکہ و برطانیہ کی تجویز سے اتفاق کرنا پڑا۔

روس پورے جرمنی کو کمیونسٹ بنا کر یو۔ ایس۔ ایس۔ آر میں شامل کرنا چاہتا تھا مگر کھلم کھلا اس کا اظہار مناسب نہ تھا، اس لیے اس نے معاہدہ پوٹسڈم سے پورا اتفاق نہ کیا۔

جنگ کا نتیجہ

جنگ کے بعد جرمنی میں نازی پارٹی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد کرسچن ڈیموکریٹک کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں کے درمیان رسہ کشی جاری ہو گئی۔ ملک کو چار حصوں میں تقسیم کر کے چار مختلف طاقتوں نے اس پر قبضہ جما لیا۔ جس سے جرمنی کی اقتصادی، معاشی اور صنعتی تباہی کی صورت پیدا ہو گئی۔

آسٹریا کے بھی پانچ حصے ہو گئے، یعنی برطانوی، فرانسیسی، امریکی اور روسی حصوں کے علاوہ اس کا ایک حلقہ بین الاقوامی بن گیا۔ روس نے آسٹریا کے سینکڑوں کارخانوں پر قبضہ کر لیا جن میں جرمن سرمایہ لگا ہوا تھا۔ پٹرول اور تیل کے تمام چشمے بھی روس کے قبضے میں آ گئے۔

اٹلی اس جنگ میں جرمنی کا دست و بازو تھا مگر چونکہ ١٩٤٣ء میں مسولینی کو معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا تھا، اس لیے اسے آزاد ملک کا درجہ دیا گیا۔ جنگ کے خاتمے پر وہاں شاہی نظام نافذ تھا مگر ١٩٤٦ء میں استصواب رائے عامہ ہوا اور جمہوریت قائم ہو گئی۔

١٩٤٥ء میں یوگوسلاویہ کی بادشاہت ختم کر کے کمیونسٹ اصول پر ایک وفاقی حکومت قائم کی گئی جو سربیا، کروشیا، سلووینیہ، مانٹی نیگرو، بوسنیا، ہرزی گووینا اور مقدونیہ کی ریاستوں پر مشتمل ہے دوسری جنگ عظیم نے ان ریاستوں کی اقتصادی حالت کو جو پہلے ہی سے خراب تھی اور زیادہ برباد کر دیا۔ مگر فوجی لحاظ سے یہ ریاستیں بہت مضبوط تھیں۔ یہ پہلا ملک ہے جس نے جنگ کے بعد اپنا پورا نظام حیات کمیونسٹ اصولوں پر وضع کیا۔

اسٹونیا، لٹویا اور لتھوانیا کی ریاستیں جو پہلی جنگ عظیم میں روسی اقتدار سے نکل چکی تھیں، دوسری جنگ کے بعد دوبارہ روسی قبضے میں آ گئیں اور انہیں کمیونزم کے اصول کے مطابق یو۔ ایس۔ ایس۔ آر میں شامل کر لیا گیا۔

اس جنگ میں پولینڈ بری طرح روندا گیا۔ یورپ کے ملکوں میں سب سے زیادہ تباہی کا شکار یہ ملک ہوا۔ جنگ کے بعد پولینڈ کے ستر ہزار مربع میل پر روس کا قبضہ ہو گیا۔ روسی اقتدار کے باوجود کمیونسٹ پارٹی ملک کی واحد نمائندہ جماعت نہ تھی، بلکہ دوسری جماعتیں بنانے کی عام اجازت تھی۔ اور وزارت عظمٰی پر سوشلسٹ قابض تھے۔ جرمنی سے پہلے پولینڈ میں ٣٥ لاکھ یہودی آباد تھے ان یہودیوں کا حکومت میں بڑا دخل ہے۔

برطانیہ میں بڑی بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت بنانے کا کام شروع کر دیا گیا۔ تین چار سال کے اندر اندر کوئلے کی کانیں، بنک، بجلی گھر، ریلوے، لوہے اور فولاد کے کاروبار قومی ملکیت بنا دیئے گئے۔

برطانیہ نے یہ محسوس کیا کہ چرچل کی جیتی ہوئی جنگ نے جو مسائل کھڑے کر دیئے ہیں ان کو حل کرنا قدامت پسند پارٹی کے بس کی بات نہیں۔ وزارت مزدور پارٹی کے ہاتھ میں دے دی گئی پھر ١٩٤٧ء میں ہندوستان، برما اور سیلون کو آزاد کیا۔ کیونکہ مصلحتِ وقت کا تقاضا یہی تھا۔

فرانس کے جنرل کاسترو نے اعلان کر دیا کہ شام و لبنان مکمل طور پر آزاد ہیں۔ جنگ کے آغاز میں برما کے وزیر اعظم ڈاکٹر باما کو آزادی کا نعرہ لگانے کے جرم میں جیل بھیج دیا گیا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر اسی کو جیل سے نکال کر مسند وزارت پر بٹھایا گیا اور برما آزاد کر دیا گیا۔

باب ۴۴ ہندوستان

ہندوستان کی تاریخ حوادث و واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اگر اس کا جائزہ زمانہ قدیم سے لیا جائے تو مختصر خاکہ بھی کئی صفحات پر پھیل جاتا ہے۔ لہٰذا ہم اختصار کے پیش نظر انگریزی عملداری سے قبل کے ہندوستان پر ایک نظر ڈالیں گے، پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی دست اندازی سے تقسیم ہند تک کے حالات ذرا وضاحت سے بیان کریں گے۔ اس لیے کہ ہندوستان میں انقلاب کا یہی خاص دور ہے۔

مغلیہ سلطنت اور اورنگ زیب

ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہونے کا عمل جاری ہوا۔ اکبر کی رواداری اور سیاسی دور اندیشی نے جس سلطنت کو صدیوں تک پائیدار اور مستحکم رہنے کے قابل بنا دیا تھا، اس میں خلل رونما ہوا۔ پھر سکھوں اور مرہٹوں کی یورشوں اور سلطنت کے خلاف ان کی معاندانہ سرگرمیوں کے باعث مشکلات پیدا ہو گئیں ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قابل، سرگرم اور مدبر حکمرانوں کی ضرورت تھی، لیکن اورنگ زیب کے بعد جن لوگوں کو تخت ملتا رہا وہ نااہل عیش پسند اور عاقبت نااندیش نکلے پھر تاج و تخت کے لیے آئے دن کی لڑائیوں نے رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ سلطنت مغلیہ کی تباہی کے اسباب میں بعض عجیب و غریب باتیں کہی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اورنگ زیب سخت متعصب تھا، اس نے غیر مسلموں سے اچھا برتاؤ نہ کیا، ان پر تشدد کیا، یا جزیہ لگایا وغیرہ۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اورنگ زیب یقیناً احکام شرعی کا پابند تھا۔ مگر اس نے ملکی امور میں صلاحیت

اولے زحمن کے سوا کسی چیز کو بنیاد نہ بنایا، نہ غیر مسلموں سے حسن سلوک میں کبھی کوتاہی کی اور نہ شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے لیے کسی پر جبر کیا۔ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ بہتر سلوک کیا۔ ۱۹۳۱ء میں بنگال کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے سی پی رائے نے تسلیم کیا تھا کہ اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو بڑی جاگیریں حاصل تھیں، انہیں بڑی بڑی زمینداریاں دی گئیں۔ اس کے عہد میں بھی ہندوؤں کو گورنری اور گورنر جنرل کے عہدے ملے۔ وہ واشنگٹن بھی ہے یہاں تک کہ افغانستان پر جو خالص اسلامی صوبہ تھا، ایک ہندو راجپوت کو نائب السلطنت یا گورنر مقرر کیا گیا۔ سپہ سالاری کے عہدے بھی ہندوؤں کو حاصل تھے۔ سیواجی کے خلاف جو فوج بھیجی گئی اس میں دلیر خاں جیسا سردار بھی شامل تھا جس کے پائے کا جرنیل اورنگ زیب کے سوا کوئی اور نہ تھا، تاہم اسے راجہ جے سنگھ کے ماتحت رکھا گیا۔

اورنگ زیب نے سلطنت کا انتظام بہتر بنانے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس کے عہد میں ملک سرسبز و خوشحال تھا۔ عام لوگوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ اس کے عہد کے متعلق ایک انگریز سیاح ایلگزنڈر ہملٹن لکھتا ہے کہ یہ لوگ خوشحال ہیں۔ ملک میں امن و امان ہے۔۔۔ ڈھاکہ میں غلہ اور دوسری ضروری جنسیں اتنی سستی ملتی ہیں کہ اگر ان کی قیمت بتائی جائے تو یقین نہ کیا جائے گا۔ ملک بے حد آباد ہے۔۔۔۔۔ ہندوستان میں بہتر سے بہتر کپڑا تیار ہوتا ہے اور بڑی کثرت سے ملتا ہے۔

غرض سلطنت مغلیہ کے زوال کا حقیقی باعث اورنگ زیب کے نالائق جانشین تھے جو وسیع و عریض سلطنت کا کاروبار سنبھال نہ سکے اور ان میں وہ ہمت، بیداری، دوراندیشی اور سرگرمی بھی نہ تھی جو کابل سے راس کماری تک پھیلی ہوئی مملکت کو متحد رکھنے کے لیے لازم تھی۔

رہی سہی کسر خود غرض امراء اور خانہ جنگی نے پوری کر دی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا اور انگریزی اقتدار ملک کے بعض حصوں خصوصاً کرناٹک میں اپنے پاؤں جما رہا تھا۔ اس اقتدار کو مستقل طور پر جمنے کا موقع اس وقت ملا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں نے شاہ عالم ثانی سے ۱۷۶۵ء میں بنگال بہار اور اڑیسہ کے دیوانی معاملات کا پورا اختیار حاصل کر لیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

ایسٹ انڈیا کمپنی انگلستان کا ایک تجارتی ادارہ تھی جسے برطانوی حکومت کی طرف سے مشرقی ممالک میں تجارت کرنے کا پروانہ دیا گیا تھا۔ کمپنی کو تجارت کی غرض سے مشرق کی سرزمین میں اپنی بستیاں بسانے، وہاں فوجی استحکامات کرنے نیز اپنی عدالتوں کے علاوہ اپنے سکے جمانے کی مراعات دے دی گئیں۔

سب سے پہلے اکبر کے عہد میں اس کمپنی نے ہندوستان میں قدم رکھا اور شاہی دربار تک رسائی حاصل کر کے اپنے لیے کچھ رعائتیں لے لیں۔ ابتدا میں کمپنی کو تجارت کے سوا کسی اور بات سے سروکار نہ تھا۔ مگر اورنگ زیب کے بعد سلطنت مغلیہ کمزور پڑنے لگی اور ابتری پھیل تو کمپنی نے بھی حصول اقتدار کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ خاص طور پر اس لیے کہ دوسری یورپی قومیں بھی اس میدان میں اتر پڑی تھیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں صوبے دار اور امراء خود مختاری کا اعلان کرنے لگے تھے۔ کمپنی نے بھی اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر نوابوں اور راجاؤں سے سازباز شروع کر دی۔ ۱۷۵۷ء میں جب سراج الدولہ والیٔ بنگال کو اس کے اپنے آدمیوں کی غداری کے باعث شکست ہوئی اور میر جعفر نے نظامت کی گدی کے لیے بیٹھے آپ کو کمپنی کا کارندہ بنا لیا تو کمپنی کے کارکنوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ ہندوستان میں سیاسی اقتدار کے خواب دیکھنے لگی۔

اس وقت انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی زبردست حریف فرانسیسی کمپنی بھی موجود تھی مختلف اوقات میں دونوں کے مابین براہ راست ٹکر بھی ہوتی رہی۔ دونوں ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتی تھیں۔ ابتدا میں فرانسیسی کمپنی کو ڈوپلے جیسا لیڈر مل گیا جو بڑا قابل آدمی تھا، لیکن انگریز کمپنی کو بھی معمولی انگریز محرروں میں سے رابرٹ کلائیو نام ایک شخص مل گیا۔ جو معمولی محرر کے درجے سے اٹھ کر سپہ سالار، گورنر اور لارڈ بن گیا۔

دونوں کمپنیوں کی کشمکش کے زمانے میں فرانس اندرونی بدنظمی کا شکار تھا، چنانچہ ڈوپلے کو خاطر خواہ فوجی امداد نہ مل سکی۔ اس کے برعکس کلائیو کو اپنے ملک سے برابر امداد ملتی رہی۔ چنانچہ ۱۷۶۳ء میں انگلستان اور فرانس کے مابین صلح نامہ ہوا جس نے ہندوستان میں فرانسیسی اقتدار کا بالکل خاتمہ کر دیا اور میدان انگریزی کمپنی کی قسمت آزمائی کے لیے خالی رہ گیا۔

کمپنی کا اقتدار

۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر کمپنی کی فوجوں نے شاہ عالم ثانی اور اس کے ساتھیوں کو شکست دی تو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے نظام دیوانی معاملات کا اختیار بھی بادشاہ سے حاصل کر لیا۔ اس معرکے نے شمال مشرقی ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی بنیادیں مستحکم کر دیں اور کمپنی کی توجہ ملک کے دوسرے حصوں کی طرف منعطف ہوئی۔ جنوبی، مغربی اور وسطی ہند میں اس وقت تین بڑی ملکی طاقتیں تھیں۔ ایک سلطنت میسور جسے حیدر علی نے بہت اونچے پیمانے پر پہنچا دیا تھا، دوسرا نظام جو وسیع علاقوں کا مالک تھا، تیسرے مرہٹے۔ انگریزوں کی کوشش یہ تھی کہ سب سے پہلے میسور کو ختم کریں جس کی قوت سے وہ پہلے سراسیمہ تھے۔ چنانچہ حیدر علی سے ان کی لڑائیاں ہوئیں پھر اس کے جانشین ٹیپو سلطان سے لڑائیاں جاری رہیں۔ انگریزوں نے مرہٹوں اور نظام کو ساتھ ملا کر میسور کی سلطنت ختم کی۔ ملکی حکومت میں سے تنہا وہ تھی جو انگریزوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ بعد ازاں مرہٹوں اور نظام کی باری آئی۔ مرہٹے ختم کر دیے گئے اور نظام بے دست و پا ہو کر ہمارے زمانے تک باقی رہا۔

بنگال پہلے ہی فتح ہو چکا تھا، اب دکن کی فتح نے ہندوستان میں انگریزی اقتدار کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ انیسویں صدی کے نصف اول تک پورا ملک کمپنی کے زیر اقتدار آ گیا۔ شاہ دہلی کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی اور اس کے حدود لال قلعے کی چاردیواری کے اندر ہی اندر ختم ہو جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے اس کا بھی قصہ پاک کر دیا اور ہندوستان میں مکمل طور پر برطانوی شہنشاہی قائم ہو گئی۔

کمپنی کا کردار

ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تاجرانہ حیثیت سے ہندوستان میں آئی تھی اور اس میں جتنے تاجر شریک تھے، وہ سب آپس میں مل جل کر کام کرنے کے عادی تھے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے مقامی تاجروں کو جماعتی انداز سے کام کرنا بھی نہ آتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک انفرادی طور پر اپنے کاروبار میں مگن تھا، نیز ہندوستان میں قومی احساس زیادہ قوی نہ تھا مگر یورپ میں اس زمانے میں قومیت، وطنیت یا نسل پرستی کا جذبہ عام ہو چکا تھا اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنوں کو بھی قومیت کے جذبے کے تحت کام کرنے کا خوگر بنا دیا تھا۔ چنانچہ کمپنی نے ہندوستانی باشندوں کی بے حسی اور نااہلی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ یہاں کے باشندوں سے خوب دولت کمائی۔ جب کمپنی کے کارکن لوٹ کر انگلستان جاتے تو ان کے ہم وطن ان کی دولت و ثروت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ بعد ازاں جب کمپنی کو سیاسی طاقت حاصل ہو گئی تو اس کے کارکنوں نے روپیہ حاصل کرنے کیلئے ہر قسم کے حربے استعمال کیے اور خوب دولت جمع کی۔

حصولِ دولت کی اس دوڑ میں کارکنوں کے مابین رقابت اور چشمک کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں حصولِ دولت کے لیے کمپنی کے کارکن جو غیر مستحق اور منتشر رانہ رویہ اختیار کرتے ان کے دوسرے ساتھی اور رقیب وہ واقعات انگلستان جا کر بیان کرتے جس سے انگلستان کی نگاہیں کمپنی کی طرف اٹھنے لگیں اور یہ اعتراض کیا جانے لگا کہ چند گنے تاجروں کو ہندوستان کی تجارت کا اجارہ دار کیوں بنایا جائے! اب ہر شخص کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ بھی ہندوستان کی دولت سے ہاتھ رنگے۔

گورنر جنرل کا تقرر

کمپنی پر بڑی شدت سے الزامات لگائے جانے لگے پھر جب ان الزامات کی تحقیق ہوئی اور وہ درست نکلے تو برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعے سے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں حکومت کی طرف سے دخل کا دروازہ کھول لیا گیا اور ۱۷۷۴ء میں وارن ہسٹینگز کو پہلا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔

وارن ہسٹینگز گیارہ سال تک گورنر جنرل رہا۔ اس عرصے میں اس نے ہر ممکن ذریعے سے انگریزی حکومت کی بنیادیں استوار کیں۔ روپے کے لیے بے جا سختیوں سے بھی تامل نہ کیا چنانچہ بیگمات اودھ، چیت سنگھ رئیس بنارس اور بعض دوسرے معاملات پارلیمنٹ میں پیش ہوئے۔ وارن ہسٹینگز پر مقدمہ چلا جو سات سال جاری رہا۔ اگرچہ وہ آخر میں بری ہو گیا لیکن مقدمے میں اس کی ساری دولت ختم ہو گئی جو اس نے ہندوستان میں رہ کر جمع کی تھی۔

اس مقدمے کے چلانے میں سب سے بڑھ کر سرگرمی مشہور انگریز ایڈمنڈ برک نے دکھائی جو اپنے اعلیٰ اخلاق کے باعث انگریزی انصاف کو ہر جگہ بلند دیکھنا چاہتا تھا اور اس بات کا روادار نہ تھا کہ انگریز قوم کے نام پر بیرونی دنیا میں لوٹ مار اور غضب وسلب کے سلسلے جاری رکھیں۔ فاکس اور شیریڈن نے برک کو مدد دی۔ افسوس کہ برک کے بعد ویسے انگریز بہت کم بروئے کار آئے۔

غلام ہندوستان

ہندوستان کی غلامی کی تاریخ محض افسوسناک ہی نہیں، بلکہ اس لحاظ سے شرمناک بھی ہے کہ خود ہندوستان کے نوابوں اور اہلِ ہند کے ہم وطنوں نے ذاتی اغراض کے پیشِ نظر ملک سے غداری کر کے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کیے۔ بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق کی کارگزاریاں ہندوستانی تاریخ کا شرمناک پہلو ہے لیکن اصل معاملہ نہ ان دو پر ختم ہوتا ہے نہ ملک و قوم سے غداری ان دو تک محدود ہے۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری قوموں میں سے مختلف اوقات میں مختلف شخصوں نے ذاتی اغراض کی خاطر غداری کی۔ بے شک انگریزی اقتدار کی مضبوطی کا باعث اپنوں کی نامہربانیاں بھی تھیں۔

بیرونی حملہ آور ابتدا سے آتے رہے مگر وہ خود یہاں کے باشندے بن گئے۔ حکمران قوم ہونے کے باوجود دلوں میں مقامی لوگوں کی ہمیشہ قدر و منزلت رہی۔ خصوصاً مغلیہ دور میں مغل اور اہلِ ہند آپس میں اتنا گھل مل گئے تھے کہ ان میں اجنبیت کا کوئی بھی احساس باقی نہ رہا تھا بلکہ اہلِ ہند کے نزدیک مغل اور بادشاہی آپس میں ہم معنی ہو گئے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکن پہلے ہندوستان پہنچے تو انہیں ہندوستانیوں کو لوٹنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ پھر وہ ملک میں سازباز کا جال پھیلا کر اور حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا کر خود سیاسی اغراض پورے کرتے رہے۔ جب باقاعدہ حکومت کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے گورنر جنرل ہی نے ظالمانہ سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا۔ ان سے ہندوستانیوں کے دلوں پر اور چرکے لگے۔ بعد میں آنے والے گورنر جنرل بھی کچھ اسی انداز سے حکومت کرتے رہے جس سے ہمیشہ اور ہر معاملے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی فوقیت اور برتری کا اظہار ہو۔ قومی اور نسلی تفاخر انگریزوں کا شیوہ بن چکا تھا، چنانچہ وہ ہندوستانیوں کے ساتھ گھل مل کر نہ کیا رہتے۔ انہیں حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے۔ کوئی بھی انگریز کسی بھی ہندوستانی سے اچھی طرح پیش آنا کسرِ شان سمجھتا تھا۔ انگریزوں کا رہنا سہنا، طریقِ معاشرت، لباس وغیرہ ہندوستانیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس طرح حکمران قوم اور اہلِ ملک کے درمیان اجنبیت اور اختلافات کی وسیع خلیج حائل ہو گئی۔

آزادی کی خلش

۱۸۱۹ء تک جنوبی ہندوستان، بمبئی اور اس کے قریبی علاقوں کے علاوہ سندھ اور پنجاب بھی انگریزوں کے قبضے میں آ چکے تھے۔ فقط دہلی کا تخت باقی تھا جس پر بہادر شاہ ظفر متمکن تھا۔ اگرچہ مغلیہ سلطنت کی قوت دم توڑ چکی تھی۔ تاہم عوام سمجھتے تھے کہ وہ بادشاہ موجود ہے اور انگریز صرف اس کے کارندوں کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔ سرکاری کاغذات میں بہادر شاہ ہی کو ہندوستان کا بادشاہ لکھا جاتا تھا۔ مختلف صوبوں کی خود مختار ریاستیں بھی بہ ظاہر دہلی کی مرکزیت کو تسلیم کرتی تھیں۔

ڈلہوزی گورنر جنرل بنا تو اس نے اس مرکزیت کو ختم کر کے دہلی کی مغل بادشاہت کو بھی نابود کرنا چاہا۔ چنانچہ اس نے ریاستوں کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ ۱۸۵۶ء میں اودھ کی ریاست ختم کر دی گئی۔

جنگِ آزادی کے اسباب بہت ہیں۔ ان میں سے بعض بڑے اسباب کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔

۱۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان کامل اجنبیت بلکہ حقارت۔
۲۔ پادریوں کا مذہبی تعصب اور انگریز حاکموں کی طرف سے ان کی امداد۔
۳۔ ہندوستانیوں سے سختی اور حقارت کا برتاؤ۔
۴۔ ہندوستان کے فوجیوں پر بے جا تشدد۔
۵۔ مذہبی معاملات میں حکام کی مداخلت۔
۶۔ دیسی ریاستوں اور حکومتوں کا خاتمہ۔
۷۔ ہندوستانیوں پر ملازمت و معاش کے وسائل بند ہونا جن سے وہ پشتہا پشت سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور نئے وسائل کا مہیا نہ ہونا۔

اہلِ ہند مدت تک سمجھے بیٹھے رہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی محض ایک تجارتی کمپنی ہے اسے حکومت سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ وہ جو کچھ کر رہی ہے صرف دیسی حکام کے کارندے کی حیثیت ہی میں کر رہی ہے۔ جب یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ انگریزوں نے پورے ملک کی حکومت سنبھال لی ہے تو عام بے چینی پیدا ہوئی۔ ہر طرف اضطراب پھیل گیا۔ وہ جا بجا مخالفانہ تحریکات جاری ہو گئیں جو خفیہ خفیہ پھیلتی گئیں۔

جنگِ آزادی

آخر انقلاب کا یہ لاوا اس وقت نمودار ہوا جب ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے فوجیوں نے عام بغاوت کا اعلان کر دیا اور بعض انگریز افسروں اور دوسرے فوجیوں کو مار ڈالا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ شمالی اور وسطی ہند میں پھیل گئی۔ جگہ جگہ ہندوستانی فوج نے بغاوتیں کر دیں۔ انگریزوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ انگریزوں کے خلاف یہ اقدام ملک کو آزاد کرانے کی غرض سے تھا اور اس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے مگر یہ کسی منظم پروگرام کے ماتحت شروع نہ ہوا تھا اور نہ اسے منظم پروگرام کے ماتحت رکھا جا سکا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ لیڈر تھا۔ اگرچہ تحریک خلوص کے ساتھ اٹھی تھی مگر اس میں ہوش و خرد کے جذبات زیادہ کام کر رہے تھے۔

ریاستوں نے انگریزوں کے خلاف اپنے ہم ملکوں سے تعاون کرنے کے بجائے الٹا انگریزوں کی مدد کی، چنانچہ جلد ہی تحریکِ آزادی دبا دی گئی۔

نتائج

اس تحریک کی ناکامی کے بعد وہی ہوا جو عام طور پر کامیاب طاقتیں کرتی ہیں۔ آزادی کی تحریک چلانے والوں کو باغی قرار دے دیا گیا اور چن چن کر قتل کیا گیا۔ ان کی جاگیریں اور جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ دہلی میں قیامت کی لوٹ مار ہوئی۔ باغیوں کو پکڑنے کے بہانے ہر گنہگار اور بے گناہ کو دھر لیا گیا۔ جائدادیں لوٹی گئیں۔ عورتوں کو بے عزت کیا گیا۔ شریف ذلیل کیے گئے۔ محلے کے محلے اجڑ گئے۔ دہلی ویران ہو گئی۔ ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں نے نقصان اٹھایا۔ بوڑھا بادشاہ بہادر شاہ ظفر اس انقلاب کا مجرم قرار پایا۔ اس کی اولاد کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ اسے رنگون جلا وطن کیا گیا اور وہیں کس مپرسی کے عالم میں وفات پائی۔

انگریزی اقتدار قائم ہو ہی چلا تھا۔ اب اس ناکام انقلاب کے بعد انگریزوں کی دھاک سارے ہندوستان پر بیٹھ گئی اور بہادر شاہ ظفر کے وجود سے سلطنت مغلیہ کا جو رہا سہا اثر ذہنوں میں باقی تھا، وہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ۱۸۵۸ء میں انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ نے ایک نئے قانون کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سرے ہی سے ختم کر کے ہندوستان کو براہ راست تاج انگلستان کے حلقۂ اختیار میں لے لیا۔

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد گرچہ ایک طویل عرصے تک انگریزوں کے خلاف اہل ہند کی طرف سے آزادی کی کوئی نمایاں مہم جاری نہ ہوئی تاہم دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبہ انگیز پلتا رہا۔ مگر منظم صورت میں کوئی تحریک نہ اٹھ سکی۔ انگریزوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی بنیادوں پر اپنے طرز عمل کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کی کئی صورتیں نکالیں۔ سرکاری ملازمتوں، تعلیم، تجارت غرض زندگی کے مختلف شعبوں میں ہندوؤں کو مسلمانوں پر ہمیشہ ترجیح دی گئی۔ جس سے ان کے مابین کئی مرتبہ تصادم بھی ہوا مگر انگریزی اقتدار کو ختم کرنے اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے ہندوستان کی ان دو بڑی قوموں نے الگ یک جہتی کا ثبوت دیا اور کئی بار اکٹھے ہو کر لائحہ عمل بنانے کی کوششیں کیں۔ بالآخر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے نام سے ایک جماعت بنی جس کا پہلا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ اس جماعت کی بنیاد قومیت و وطنیت کے جذبات پر رکھی گئی۔ مقصد ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو انگریزوں سے آزاد کرا کے ملک میں جمہوریت قائم کرنا تھا۔

انڈین نیشنل کانگرس

اپنے مسلک کے پیش نظر انڈین نیشنل کانگرس کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی۔ انگریزوں کی نگاہوں نے اس کی خطرناکیوں کو بھانپ لیا تھا، مگر اب اسے روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ بادِ مخالف کے جھونکوں کے باوجود کانگرس کی کشتی اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہی اور اس کے عزم و استقلال میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر وہ ملک کی سب سے بڑی منظم اور طاقتور جماعت بن گئی۔ ملک کے مقتدر ہندو مسلم اور سکھ رہنما اس میں شامل تھے۔

حصول آزادی کے لیے کانگرس نے یقیناً بے مثال قربانیاں کیں۔ اس جماعت کی عوامی زندگی کا بہترین دور وہ ہے جو عام طور پر ترک موالات یا عدم تعاون کا دور کہلاتا ہے۔ اس میں مسلمان بحیثیت قوم دامے کانگرس کے ساتھ تھے اور کانگرس کی قوت بالکل بے پناہ نظر آتی تھی۔ اسی دور میں کانگرس نے ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری کی نہ صرف روح پھونکی بلکہ ان کو ایسی طاقت سے نواز بخشی جس نے بعد میں انگریزی سیاست کو کئی مقامات پر پلٹا دیا۔ لیکن کانگرس پر ہندو اثر و رسوخ غالب رہا جس کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں میں کئی تنازعات بھی پیدا ہوتے رہے۔

مسلم لیگ

کانگرس پر ہندوؤں کا غلبہ تھا اور اس میں اسلامی حقوق کے متعلق کوئی آواز بلند کرنا بہ ظاہر مشکل نظر آتا تھا۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو اپنی ایک جداگانہ سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں نے اپنی علیحدہ تنظیم بنالی۔ اس طرح کانگرس کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت وجود میں آ گئی۔

مشترکہ اقدام

اوّل اوّل مسلم لیگ کانگرس سے دور رہ کر کام کرتی رہی۔ ۱۹۱۲ء کے بعد سے ایک دوسری کے قریب تر آ گئیں۔ ۱۹۱۶ء میں دونوں کے درمیان اسلامی حقوق کے متعلق ایک قرارداد منظور ہوئی جو عام طور پر میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے۔ اس قرارداد کے مطابق مسلم اکثریت والے صوبوں کی حیثیت کو یقیناً نقصان پہنچا۔ البتہ مسلم اقلیتوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اس لیے کہ تناسب سے زیادہ حقوق مل گئے۔ لیکن اکثریتوں کے نقصان پر اقلیتوں کے لیے فائدہ حاصل کرنے کا طریقہ غلط تھا اور بعد کے تمام تنازعات کی بنیاد یہی معاہدہ بنا رہا۔ بہر حال کانگرس و مسلم لیگ کی ہم آہنگی نے مانٹیگو چیمس فورڈ والی اصلاحات کے لیے راستہ ہموار کیا۔ ان اصلاحات کو عام طور پر دوعملی کا نظام قرار دیا جاتا ہے۔ اصلاحات کا خاکہ سامنے آیا تو سب نے ان اصلاحات کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا۔

راؤلٹ ایکٹ کے نفاذ نے اس ناراضگی میں اور اضافہ کیا۔ اس ایکٹ کے مطابق مشتبہ اشخاص کو پکڑنے اور بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھنے کے اختیارات "دفتر شاہی" کو دیے گئے۔ سارے ہندوستان نے ایکٹ کی مخالفت کی۔ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی کی قیادت میں اس ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی۔ پھر ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ کے سانحہ عظیم نے یعنی جنرل ڈائر نے ایک پبلک جلسہ پر گولی چلا کر سینکڑوں افراد کو ہلاک کر دیا۔ ملک میں عام مخالفت کی لہر دوڑ گئی۔

یہ سلسلہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب انگریزی حکومت نے جرمنی کے بعد ترکی کو ختم کرنا چاہا تو جمعیت خلافت کے نام سے ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت نے انگریزوں کے خلاف احتجاج کے طور پر تحریک چلا دی۔

غرض مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات، راولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ، مظالم پنجاب اور ترکی کے خلاف برطانوی پالیسی (جو خلافت اور تقدس عرب کے خلاف تھی) ان سب باتوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف سخت مخالفت پیدا کر دی اور ہندو مسلمان کے درمیان مضبوط اتحاد قائم کر دیا۔ جس نے "ترک موالات" کو جنم دیا۔ اس تحریک کے تحت سکول کالج، عدالتوں، دکانوں اور ملازمتوں کو چھوڑ دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ ادائیگی ٹیکس، مالگذاری اور بدیشی مال کے استعمال سے انکار کیا گیا۔

اس فیصلے میں ہندو مسلمان متحد تھے۔ مگر جلد ہی دونوں الگ ہو گئے۔ نتیجے میں مسلم لیگ بھی کانگرس سے دور ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کے بعد سے ہندوستان کا سیاسی مطلع ہندو مسلم کشمکش سے آلودہ نظر آتا ہے۔

سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ

آخر ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیشن اس غرض سے ہندوستان بھیجا گیا کہ وہ ہندوستانی لیڈروں سے مل کر اور ملک کے حالات دیکھ کر بتائے کہ ہندوستان کس قسم کی اصلاحات کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کے سات ممبر تھے جو سب انگریز تھے۔ ہندوستانیوں نے اس کمیشن کی مخالفت اس لیے کی کہ وہ چاہتے تھے اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندے بھی لیے جائیں۔

پھر ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا پارٹیز کانفرنس نے پنڈت موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو کی قیادت میں نہرو رپورٹ کے نام سے ہندوستان کا ایک آئین تیار کیا جو دیر تک ہندو مسلم اختلافات کا موضوع بنا رہا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو بگاڑنے میں اس رپورٹ کا بھی بڑا حصہ ہے۔

گول میز کانفرنس

آخر لارڈ اروِن کی کوشش سے ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں ایک گول میز کانفرنس ہوئی جس میں ہندوستانی نمائندوں نے شرکت کی۔ ڈھائی مہینے تک اس کے اجلاس ہوتے رہے، مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

اب ہندوستان میں ستیہ گرہ اور دہشت انگیزی کا زور تھا۔ گاندھی جی اس تحریک کے سربراہ تھے۔ آخر ہندوستانی لیڈروں نے گاندھی جی کو سمجھا بجھا کر تحریک بند کرائی۔

۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس دوبارہ منعقد ہوئی۔ اس میں گاندھی جی بھی کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ مگر اس مرتبہ پھر یہ کانفرنس ناکامی کی فضا میں ملتوی کر دی گئی اور ستیہ گرہ کی تحریک دوبارہ شروع ہو گئی۔ ملک میں ہڑتالوں، مظاہروں اور جلسے جلوسوں کا زور ہو گیا۔ کانگرسی رہنما اور تحریک میں حصہ لینے والے گرفتار ہونے لگے۔

۱۳ر مئی ۱۹۳۲ء کو بمبئی میں اتنے وسیع پیمانے پر ہندو مسلم فساد ہوا جس کی اب تک کوئی نظیر موجود نہ تھی۔ کامل چھ ہفتوں کے بعد یہ ختم ہوا۔ اس فساد کے نتیجے میں ستیہ گرہ تحریک بھی سرد پڑ گئی۔ مسلمانوں نے اس تحریک سے تعاون نہ کیا۔ اگست ۱۹۳۲ء میں وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے پورے مطالبات قبول نہ کیے گئے تھے تاہم مسلمانوں نے اسے قبول کر کے نیا دستور بنانے پر آمادگی کا اعلان کر دیا۔

۱۹۳۵ء کا آئین

۱۹۳۵ء میں ایک آئین تیار ہوا۔ جس کی رو سے اڑیسہ اور سندھ کو مستقل صوبہ بنا یا گیا۔ اس طرح ہندوستان میں دو نئے صوبوں کا اضافہ ہوا۔ صوبۂ سرحد کو دوسرے صوبوں کے برابر آئینی حیثیت دے دی گئی۔ نئے دستور میں صوبوں کو بڑی حد تک خود مختار بنا دیا گیا۔ لیکن مرکزی حکومت کو بالکل غیر ذمہ دار رکھا گیا۔ ملکی دفاع، معاملات خارجہ اور مذہبی امور کے تین محکمے براہِ راست برطانیہ کے پاس رکھے گئے۔ بجٹ میں صرف ۲۰ فیصد رقم پر ہندوستانیوں کو اختیار دیا گیا باقی ۸۰ فیصد برطانوی اختیار میں رہا۔

کانگرسی وزارتیں

ہندوستان نے اس آئین کو متفقہ طور پر نامنظور کیا مگر اس کے باوجود اسے نافذ کر دیا گیا اور ۱۹۳۷ء میں اس آئین کے مطابق پہلا الیکشن ہوا کانگرس کو اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ پنجاب، بنگال، سندھ کے سوا سے تمام صوبوں میں خاصی اکثریت حاصل ہو گئی اور ان صوبوں میں خالص کانگرسی افراد پر مشتمل وزارتیں بنا دی گئیں۔

اب تک مسلم لیگ ایک ایسی جماعت تھی جس پر اونچے طبقے کے افراد کا قبضہ تھا۔ کانگرسی وزارتیں بننے کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ دہشت زدہ ہو کر رہ گئے۔ مسلم عوام کی تنظیم کا کام جو برسوں سے نامکمل تھا، اب خود بخود ہونے لگا۔ مسلم عوام جوق در جوق مسلم لیگ کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے ۱۹۳۷ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں مسلم لیگ نے "کامل آزادی" کے نصب العین کا اعلان کر دیا۔

پاکستان کا بنیادی نکتہ

اب صورت یہ تھی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کوئی ایسا سمجھوتہ موجود نہ تھا جس کی بنیاد پر دونوں قومیں اکٹھا قدم آگے بڑھا سکیں۔ مسلمانوں کو سمجھوتے کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ انہوں نے چاہا کہ اپنی اکثریت کے علاقوں کو الگ کر لیں اور ان کا مرکز الگ بنا لیں۔ تاکہ یہ اکثریت والے علاقے ہندوستان کی بڑی غیر مسلم اقلیت میں ضم ہو کر بے دست و پا نہ ہو جائیں۔ یہ امر تحریک پاکستان کے لیے آغاز کا بنیادی نکتہ تھا۔ اس کے متعلق ایک مستقل قرارداد مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور (منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء) میں منظور کی گئی۔ یہ تقسیم ملک کی قرارداد تھی۔ ہندو ملک کی تقسیم کے سخت خلاف تھے چنانچہ انہوں نے نظریہ پاکستان کی شدید مخالفت کی۔

کانگرسی وزارتوں کا استعفےٰ

دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ برطانیہ نے ۱۹۳۹ء میں جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اس میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ کانگرسی وزارتوں کو برطانیہ کی یہ مطلق العنانی سخت ناگوار گذری کہ ان سے مشورہ تک نہ کیا گیا۔ چنانچہ احتجاج کے طور پر کانگرسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا جس پر مسلم لیگ کے صدر کی ہدایت پر "یوم نجات" منا کر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ انگریزوں نے کانگرسی وزارتوں کے بعد عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

تقسیم ہند

ادھر جنگ عظیم بہت شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ یورپ میں جرمنی قدم بڑھائے جا رہا تھا تو مشرق میں جاپان بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ انگریز اس صورتِ حال سے سخت ہراساں تھے۔ کانگرس نے انگریزوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلا دی مگر حکومت نے سختی کے ساتھ اسے دبا دیا۔

جنگ ختم ہوئی۔ انگریز کامیاب رہے۔ ہندوستان کا مسئلہ بدستور الجھا رہا۔ پہلے وہ سکیم بنی جسے عام طور پر برطانوی وزارت کی سکیم کہا جاتا تھا۔ اس پر تصفیہ ہو جانے کی امید پیدا ہوئی، لیکن یہ امید جاتی رہی تو ملک کی تقسیم کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس سلسلے میں پنجاب و بنگال کی تقسیم کا سوال بھی سامنے آ گیا اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا۔ حد بندی کا کام ایک کمیشن کے سپرد ہوا جس کا صدر ایک انگریز ریڈ کلف تھا۔

حد بندی کی رو سے نصف پنجاب، نصف بنگال، آسام کے ضلع سلہٹ کے تین چوتھائی کے علاوہ سرحد، سندھ و بلوچستان کے صوبوں کو مل کر ہندوستان سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس طرح اکثریت اور اقلیت کے نام سے ہندو مسلم کے درمیان جو کشمکش جاری تھی، وہ ختم ہوئی۔

باب ۳۵ پاکستان

تمہید

متحدہ ہندوستان میں ہندو مسلم تصفیہ مدت سے چلا آتا تھا، کئی بار اس کا حل تلاش کیا گیا، مگر نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔ تہذیبی، روایتی، تاریخی، لسانی اور مذہبی اختلافات نے دونوں قوموں کو کبھی شیر و شکر ہو کر رہنے کا موقع نہ دیا۔ کانگرس اگرچہ تمام قوموں کی جماعت تھی اور مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنما بھی اس کے ممبر تھے، مگر بعض ممبروں کا مذہبی تعصب یہاں بھی کام کرتا رہا۔ جس کے نتیجے میں بعض مسلمان اسے خالص ہندو جماعت سمجھنے لگے۔ نیز اس کی بعض سرگرمیاں مسلمانوں کے نزدیک اس بات کا ثبوت تھیں کہ کانگرس کے فیصلے عملاً ہندو ذہنیت کے مطابق ہوتے ہیں۔

ان اختلافات کا نتیجہ وہی نکلا جس کی طرف ۱۹۲۵ء میں لالہ لاجپت رائے نے اشارہ کیا تھا یعنی تقسیم ہند۔

تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ "ہندوستان" کے باب میں اس پر مفصل بحث

کی جا چکی ہے۔ یہاں ہم ان واقعات کو اختصار کے ساتھ بیان کریں گے جو تقسیم ہند کے موجب ہوئے اور تحریک پاکستان کے باعث بنے۔

ہندوستان مدت سے متحد چلا آ رہا تھا اور ہندو مسلمان آپس میں مل کر انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں شریک تھے۔ چنانچہ کانگرس سب کی نمائندہ جماعت چلی آتی تھی۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ بعض واقعات کی بنا پر کانگرس کو خالص ہندو جماعت سمجھا جانے لگا جس کے پیش نظر محض ہندوؤں کے حقوق اور ان کے مفادات کا تحفظ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس تنظیم سے الگ ہونے لگے۔ جب سیاسی آزادی محدود پیمانے پر ملنے لگی تو مسلمانوں اور ہندوؤں میں ملکی اور دوسرے حقوق کے متعلق کشمکش شروع ہو گئی۔ اس وقت ملک کے اندر کانگرس کے علاوہ اور بھی کئی جماعتیں تھیں مثلاً مسلم لیگ، مسلم کانفرنس، جمعیۃ العلماء وغیرہ، مسلم لیگ سب سے زیادہ طاقت حاصل کر رہی تھی۔ چنانچہ اکثر و بیشتر مسلمان اس جماعت میں شریک ہو گئے۔

۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ نے اپنا ڈھانچہ بدلا۔ وہ قائداعظم محمد علی جناح کے زیر قیادت پہلی مرتبہ عوامی جماعت کے رنگ میں ظاہر ہوئی اور انتخابات میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ لیکن کوئی ایسی صورت نہ بنی جس سے لیگ اور کانگرس میں سمجھوتہ ہو جاتا۔ بلکہ کانگرس سمجھوتے سے بے پروا ہو کر اپنا ہاتھ مسلمانوں پر جمانے کی کوشش کرنے لگی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے تمام عناصر لیگ کی قیادت میں یکجا اور متحد ہو گئے۔ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے، وہاں سے کانگرسی وزارتوں کے خلاف شکایتیں آنے لگیں۔ کانگرسی حکومت کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ چنانچہ جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو مسلم لیگ نئی اسکیم سوچنے لگی۔

قرارداد پاکستان

مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہوا۔ جس میں پاکستان کی قرارداد منظور کی گئی۔ اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کے شمال مشرق اور شمال مغرب کے جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، انہیں ہندوستان سے الگ کر کے آزاد سلطنت بنا دیا جائے۔ ایسی سلطنت میں اقلیتی فرقے کے تمام حقوق کی حفاظت کی جائے گی یعنی سرحد، بلوچستان، سندھ، پنجاب، بنگال اور آسام کے صوبوں کو ملا کر پاکستان کی الگ ریاست قائم کی جائے۔ ہندو اکثریت کے صوبے یہ تھے۔ بمبئی، مدراس، یوپی، سی پی، بہار اور اڑیسہ

قرارداد میں یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان کی آزاد ریاست میں غیر مسلم اقلیت کے تمام حقوق کی حفاظت کی جائے گی اور اسی طرح ہندو ریاست میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ ہندوؤں نے اس قرارداد کی سخت مخالفت کی، بلکہ اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن مسلمانوں کا یہ مطالبہ روز بروز قوت اختیار کرتا گیا یہاں تک کہ برطانوی حکومت کو بھی اس پر توجہ کیے بغیر چارہ نہ رہا۔

سر سٹافورڈ کرپس کی سکیم

۱۹۴۲ء میں سر سٹافورڈ کرپس ایک سکیم لے کر آیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان میں عارضی قومی حکومت بنا دی جائے اور سارے انتظامات اس کے ہاتھ میں ہوں۔ البتہ جنگ کے خاتمے تک ملک کا بچاؤ برطانیہ کے ہاتھ میں رہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے نمائندے اپنی دستور ساز مجلس کے ذریعے سے جو نظام حکومت بنائیں گے اسے منظور کر لیا جائے مگر کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اس اسکیم کو نامنظور کر دیا۔

جنگ کے بعد نئے انتخابات ہوئے جن میں مسلم لیگ کو ہر جگہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ مسلم لیگ کے سوا اور کوئی جماعت مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔

وزارتی مشن

۱۹۴۶ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے تین وزراء ایک نئی اسکیم لے کر آئے جسے وزارتی مشن کی سکیم کہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ:۔

۱۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے پاس صرف تین محکمے رہیں گے۔ فوج، نقل و حمل کے وسائل اور امور خارجہ، باقی تمام محکمے صوبوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔

۲۔ صوبوں کے تین گروپ ہوں گے اور ہر گروپ اپنا دستور خود بنائے گا۔

۳۔ تمام صوبوں کو ان کی آبادی کے مطابق دستور ساز اسمبلی میں نمائندگی دی جائے گی۔

۴۔ چودہ وزیروں پر مشتمل ایک عارضی حکومت بنائی جائے گی ان میں سے پانچ وزیر مسلم لیگ کے ہوں گے۔

کانگرس اور لیگ دونوں نے اصل سکیم کو منظور کر لیا مگر عارضی حکومت کے متعلق سمجھوتہ نہ ہوا۔ جب دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہوا تو ہندوؤں کی دو سو دس نشستوں میں سے دو سو ایک نشستیں کانگرس نے لے لیں۔ مسلمانوں کی اٹھہتر نشستوں میں سے تہتر پر مسلم لیگ کا قبضہ ہو گیا۔

پھر کانگرسی لیڈروں نے ایسی ایسی تقریریں کیں۔ جس سے معاملہ دوبارہ کھٹائی میں پڑنے لگا۔ اور کئی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ وزارتی مشن کی سکیم بھی ناکامیاب ہونے لگی۔

عارضی حکومت

بالآخر ۵ر اگست ۱۹۴۶ء کو وائسرائے نے عارضی حکومت بنائی۔ کانگرس کے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کو اس حکومت کا وزیراعظم بنایا۔ مسلم لیگ کے پانچ وزیر بھی اس حکومت میں شامل ہو گئے۔ اس دوران میں ہندوستان کے مختلف علاقوں نواکھلی، بہار، کلکتہ اور گڑھ مکتیسر وغیرہ میں ہندو مسلم فسادات ہونے لگے اس دستور ساز اسمبلی کا کام شروع نہ ہوا تھا کہ سکیم کی ایک دفعہ کے متعلق کانگرس اور مسلم لیگ کے باہمی تنازع کو دور کرنے کے لیے دونوں جماعتوں کے نمائندوں کو لندن طلب کیا گیا اور لیگ کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں شخصی آزادی کے لئے مسلم لیگ نے سول نافرمانی کر دی جو مہینہ بھر تک جاری رہی۔ اس میں مسلم لیگ کے بہت سے ممبر گرفتار ہوئے اور تحریک صوبے بھر میں پھیل گئی۔

برطانوی وزیر اعظم کا اعلان

۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کے وزیراعظم نے اعلان کر دیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک تمام اختیارات ہندوستانیوں کو دے دیئے جائیں گے اور اگر اس وقت تک ہندوستان کا کوئی دستور مرتب نہ ہوا تو اختیارات ان حکومتوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے جن کے ہاتھ میں اس وقت اختیارات کی باگ ہو گی یا صوبائی حکومتوں کو اختیار دے دیا جائے گا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی آمد

اب تک لارڈ ویول ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ مذکورہ بالا اعلان کے ساتھ ہی اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا اور وہ صرف اس غرض سے آیا کہ سارے اختیارات ہندوستانیوں کے حوالے کر دے۔ ماؤنٹ بیٹن ۲۲ر مارچ ۱۹۴۷ء سے ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا۔

فسادات

مارچ کے شروع میں پنجاب میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے جو تقریباً آٹھ ماہ تک جاری رہے۔ ان فسادات میں بہت سے لوگ موت کے گھاٹ اترے لاکھوں ہی گھر بار چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہوئے۔

ماؤنٹ بیٹن سکیم

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچ کر لیڈروں سے بات چیت شروع کر دی اور جب وزارتی مشن کی اسکیم پر سمجھوتہ ناممکن ہو گیا تو ملک کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مطالبہ کیا کہ اگر

ملک کو تقسیم کرنا ہی ہے تو پنجاب اور بنگال کے وہ ضلعے الگ کر دیئے جائیں جن میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے۔ کانگریس نے بھی اس مطالبے کی حمایت کی۔ چنانچہ وائسرائے نے اسی کے مطابق تقسیم کا فیصلہ دے دیا۔

پنجاب اور بنگال کے درمیان ایک عارضی حد قائم کر دی گئی اور طے پایا کہ پختہ حد بندی کا کام ایک کمیشن کے ذریعے انجام پائے گا۔ اس وقت صوبہ سرحد میں کانگریس کی حکومت تھی۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اس حکومت کے متعلق لوگوں کی رائے معلوم کر دی جائے اور اس کے مطابق سرحد کو پاکستان یا بھارت میں شامل کیا جائے۔ یہی تجویز آسام کے علاقے سلہٹ کے متعلق ہوئی۔ ۳؍جون کو یہ سکیم پیش ہوئی جسے لیگ اور کانگریس دونوں نے منظور کر لیا اور ۱۵؍اگست کو ہندوستان دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہندوستان اور پاکستان لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا اور پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم مقرر ہوئے۔

حد بندی

۱۷؍اگست کو حد بندی کے کمیشن کا فیصلہ صادر ہوا اس کمیشن کا صدر ریڈکلف تھا۔ اس نے جو فیصلہ صادر کیا، وہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے سراسر افسوسناک اور ان اصولوں کے منافی تھا جو حد بندی کے سلسلے میں ضروری قرار دیئے گئے تھے یعنی علاقے کی کثریت اور اس کا ہم جنس اکثریت والے علاقے سے اتصال مثلاً:

۱۔ تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور مسلم اکثریت کی تحصیل تھی اور یہ پاکستان کے علاقے سے متصل تھی۔
۲۔ تحصیل گورداسپور کی کیفیت بھی یہی تھی۔
۳۔ تحصیل اجنالہ (ضلع امرتسر) کی کیفیت بھی یہی تھی۔
۴۔ تحصیل موگا و تحصیل فیروزپور (ضلع فیروزپور) کی کیفیت بھی یہی تھی۔
۵۔ تحصیل نکودر و تحصیل جالندھر (ضلع جالندھر) کی کیفیت بھی یہی تھی۔
۶۔ ریاست کپورتھلہ مسلم اکثریت کی ریاست تھی اور وہ پاکستان سے متصل تھی۔

ان وجوہ سے مغربی پاکستان کو سخت نقصان پہنچا۔ بہت بڑی اسلامی آبادیاں حقوقِ اکثریت سے بھی محروم ہوئیں اور صدیوں کے گھر بار بھی انہیں چھوڑنے پڑے۔

اس تقسیم نے ہندوؤں کی اس خوش اعتقادی کو یقین میں بدل دیا کہ پاکستان کو عملاً ناممکن بنا دیا گیا ہے اور جلد یا بدیر مسلمان خود ہی اس مطالبہ سے دست کش ہو جائیں گے۔

اس غلط تقسیم کا نتیجہ خواہ کچھ بھی نکلا یہ ضرور ہوا کہ کشمیر سے متصل سرحدوں میں مستقل بدامنی کی صورت پیدا ہو گئی۔ کشمیر کے ہندو مہاراجہ نے اسی فیصد مسلم اکثریت کے باوجود کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کر لیا۔ الحاق کے ساتھ ہی ہندوستانی فوجیں کشمیر میں آ پہنچیں۔ پھر پاکستان کے ساتھ ہندوستانی فوجوں کی جھڑپوں کا تسلسل شروع ہو گیا۔

پناہ گزین

تقسیم کے بعد ہندوستان میں جو مسلمان باقی رہ گئے تھے، وہ بری طرح پٹے، لاکھوں کی تعداد میں قتل ہوئے، عورتیں اغوا کی گئیں۔ بچے کھچے لوگوں کو بے سر و سامانی کی حالت میں پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ ہندوؤں کی ان غیر انسانی حرکات کا ردِ عمل پاکستان میں بھی ہوا۔ یہاں بھی غیر مسلموں کی جان و مال خطرے میں پڑ گئے۔

ستر اسی لاکھ کے قریب مسلمان ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آئے تو اسی قدر غیر مسلم پاکستان چھوڑ کر ہندوستان کو سدھارے۔ مال و اسباب لٹ گیا۔ عزت و ناموس پر ڈاکہ پڑا۔ اور متروکہ جائیدادیں دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اپنی تحویل میں لے لیں۔ جن کے متعلق کئی بار دونوں ملکوں کے درمیان سمجھوتے کی کوششیں ہوئیں مگر کوئی فیصلہ کن اقدام نہ کیا جا سکا۔

لاکھوں کی تعداد میں جو مہاجر دونوں ملکوں میں آئے ان کا بسانا دونوں کے لیے ایک کٹھن مسئلہ تھا جس سے دونوں ملکوں کی اقتصادی اور معاشی حالت پر بہت برا اثر پڑا۔ متروکہ جائیدادیں مہاجرین کو الاٹ کی گئیں مگر اس افراتفری کے دور میں یہ الاٹمنٹیں بھی مناسب طریق سے عمل میں نہ لائی جا سکیں۔ یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ کون مستحق ہے اور کون غیر مستحق۔ ہر شخص نے اپنا داؤ اور اپنا رسوخ استعمال کیا۔ قتل و غارت کا یہ سلسلہ تین چار ماہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد جب قدرے سکون ہوا تو مہاجرین کو بسانے کے لیے مناسب طریقے اختیار کیے جانے لگے مگر صورتِ حال اصلاح پذیر نہ ہو سکی۔

حیدر آباد دکن

آزادی کی دستاویز کی رو سے حیدر آباد کا نظام اپنی ریاست کے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا مجاز تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ ہم کسی ملک سے الحاق نہیں کریں گے بلکہ آزاد رہیں گے مگر ہندوستان نے فوجی قوت استعمال کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا۔

جوناگڑھ

ہندوستان کے مغربی ساحل پر ایک چھوٹی سی ریاست جوناگڑھ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد پچیس فیصد سے زیادہ نہیں مگر اس کا حکمران مسلمان تھا۔ اس نے پاکستان سے الحاق کرنا چاہا تو ہندوستان نے حیدر آباد کی طرح اس پر بھی فوجی کارروائی کے ذریعے قبضہ جما لیا۔

پاکستان کی جغرافیائی حیثیت

پاکستان کا رقبہ تین لاکھ اکسٹھ ہزار مربع میل اور آبادی آٹھ کروڑ کے قریب ہے۔ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے دنیا میں مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی سلطنت ہے۔ چاول، گنا، جو، چنا، پٹ سن، گیہوں، کپاس، ناریل اور عمارتی لکڑی یہاں کی زرعی دولت ہیں۔

پٹ سن کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا بھر میں پاکستان کو اجارہ داری حاصل ہے۔ علاوہ ازیں تیل پیدا کرنے کے بیج، تمباکو اور چائے کی پیداوار کھال، چمڑا اور اون کی تجارت کے لحاظ سے پاکستان بہت اہمیت رکھتا ہے۔

پہاڑی نمک پاکستان کی خاص دولت ہے۔ پٹرول، گندھک، چونے کا پتھر، کرومیم اور شورہ خاص معدنی دولت ہیں۔

مغربی پاکستان کے مختلف خطوں کی آب و ہوا مختلف ہے۔ ہمالیہ کے دامن کے علاقوں میں گرمی اور سردی کے دونوں موسم شدید ہوتے ہیں۔ بارش معمولی ہوتی ہے اور آبپاشی کا دارومدار نہری پانی پر ہے جو علاقے ہمالیہ کے دامن میں ہیں یعنی پہاڑوں کے اوپر واقع ہیں۔ وہاں برف باری ہوتی ہے اور گرمیوں میں بھی سردیوں کا لطف آتا ہے۔

مغربی پاکستان کا بیشتر حصہ پہاڑوں سے دور واقع ہے اور آب و ہوا کے لحاظ سے سخت گرم اور خشک ہے۔ یعنی مغربی پنجاب کا درمیانی اور جنوبی حصہ صوبہ سندھ، سرحد اور بلوچستان کا اکثر حصہ۔

مشرقی پاکستان میں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے بارش کی کثرت کے باعث ندی نالے ہمیشہ بھرے رہتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ہوا ہمیشہ بھیگی بھیگی سی رہتی ہے۔ گرمیوں کا موسم شدید گرم ہوتا ہے مگر سردی زیادہ نہیں پڑتی۔

انقلابی تحریک کے دو مبیرو

اس بات سے قطع نظر کہ ہندوستان اگر متحد رہتا یہاں ہندو مسلم کشیدگی پیدا نہ ہوتی۔

پھر اسے آزادی ملتی تو اس کی کیفیت کیا ہوتی۔ یہ حقیقت ہے کہ بھارت اور پاکستان کی آزادی کا سہرا گاندھی اور محمد علی جناح کے سر ہے۔ گاندھی نے ہندوؤں میں چھوت چھات اور بت پرستی کے مٹنے کو ختم کرکے مسلمانوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کے لیے بھی تگ و دو کی۔ بہت سے موقعوں پر ان کی یہ کوششیں کامیاب بھی ہوئیں مگر یہ کامیابیاں عارضی تھیں۔ غالباً گاندھی جی کی انہی امن پسندانہ سرگرمیوں کا نتیجہ تھا کہ شرپسند ہندو عناصر نے تقسیم ہند کے پانچ چھ ماہ بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو انہیں گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو شاید پاکستان اور ہندوستان کے بیشتر تنازعات جو اس وقت خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں اور جن کا حل نہیں نکل رہا، طے ہو سکتے۔

انتظامات ۱۹۴۸ء کے آغاز میں قائداعظم بیمار پڑے اور اسی سال ۱۱ ستمبر کی رات کو کراچی میں وفات پا گئے۔ ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین کو جو مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے، گورنر جنرل بنایا گیا۔

قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں پاکستان کے آغاز سے وزیراعظم اور وزیر دفاع تھے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد وہی پاکستان کی سب سے بڑی شخصیت تھی۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں جبکہ وہ راولپنڈی کے جلسہ عام میں خطاب کر رہے تھے کسی شخص نے ان پر گولی چلا دی اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد یہ دوسرا بڑا حادثہ تھا۔

قائد ملت کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل وزیراعظم پاکستان بن گئے اور ان کی جگہ ملک غلام محمد وزیر مالیات کو گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ اپریل ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت ٹوٹی اور مسٹر محمد علی بوگرا نے نئی وزارت بنائی جو پاکستان کی طرف سے پہلے کینیڈا میں ہائی کمشنر تھے پھر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سفیر بن گئے تھے۔

ملک غلام محمد سخت بیمار ہو گئے تو پہلے انہوں نے دو ماہ کی رخصت لی پھر استعفیٰ دے دیا۔ ان کی جگہ میجر جنرل سکندر مرزا جنرل بن گئے۔ مسٹر محمد علی بوگرا کی جگہ چودھری محمد علی وزیراعظم بنے۔ قریباً ایک سال کے بعد انہیں بھی مستعفی ہونا پڑا اور مسٹر حسین شہید سہروردی نے وزیراعظم کا منصب سنبھالا۔ جب انہوں نے استعفیٰ دیا تو پہلے چند ماہ کے لیے مسٹر چندریگر وزیراعظم رہے پھر فیروز خاں نون نے بار اٹھا لیا۔

۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک کے انتظامی حالات بے حد نازک ہو گئے تو مارشل لا کا اعلان ہوا۔ تمام وزارتیں اور اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ جنرل ایوب خاں کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ اس وقت تک سکندر مرزا بدستور صدر مملکت تھے لیکن سمجھا گیا کہ اس طرح اصلاحی کام بہ اطمینان پورا نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا سکندر مرزا نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور جنرل ایوب خاں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے علاوہ صدر مملکت کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔

باب ۳۶ ترکستان

ترکستان کا علاقہ روس کی سلطنت (یو۔ ایس۔ ایس۔ آر) دو براعظموں یعنی یورپ اور ایشیا پر بحیرہ بالٹک سے بحرالکاہل شمالی اور بحر منجمد شمالی سے بحراسود تک پھیلی ہوئی ہے۔ مغرب میں فن لینڈ، پولینڈ، ہنگری اور رومانیہ اسے احاطہ کرتے ہیں اور جنوب میں ترکی، ایران، افغانستان، چین، منگولیا اور منچوریا کی سرحدیں اس سے ملتی ہیں۔ اسی سلطنت میں ترکستان کا علاقہ بھی شامل ہے۔ ایشیا کا وہ پورا وسطی علاقہ ترکستان ہے جس کا مشرقی سرا بحرالکاہل سے ملتا ہے اور مغربی سرا بحیرہ روم سے یعنی منگولیا سے کر تبت، کشمیر، افغانستان، ایران و عراق کے شمال سے ہوتا ہوا کیسپین اور روم کے سمندروں تک جو علاقہ پھیلا ہوا ہے یہ سب ترکوں کا ملک یا ترکستان ہے۔ ایران کی پرانی تاریخوں میں اسے توران کہا گیا ہے۔

آج کل ترکستان کا علاقہ چار حصوں میں تقسیم ہے: چینی ترکستان، روسی ترکستان، آزاد ترکستان یا ترکی اور چوتھا حصہ وہ ہے جس میں بلخ اور بدخشاں کے علاقے شامل ہیں اور جو آج کل افغانستان کا حصہ بنا ہوا ہے۔

انقلاب کے بعد روسی ترکستان کی چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستوں میں تقسیم ہو گیا مثلاً کوغیز ترکمانستان (جس میں بخارا اور خیوا کے مشہور علاقے بھی شامل ہیں) ازبکستان اور تاجکستان۔ اس کے علاوہ بعض علاقے دوسری جمہوریتوں میں شامل ہیں[1]۔

آٹھویں صدی عیسوی سے قبل ان علاقوں کے ترکوں نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ آٹھویں صدی میں جب ترک اسلام سے روشناس ہوئے تو ان کی بہت بڑی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ پھر جب خلافت عباسیہ میں کمزوری پیدا ہوئی تو ان علاقوں کے گورنر خود مختار ہو گئے اور اپنی علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کر لیں۔ ظاہر ہے کہ ان حکومتوں کا کوئی ایک مرکز باقی نہ رہا تھا جس سے ان کی مجموعی طاقت بہت گھٹ گئی تھی۔ ان حالات میں چین اور روس نے قسمت آزمائی کی۔ ترکستان کے وہ علاقے جو چین اور روس کی سرحدوں سے قریب تھے رفتہ رفتہ اپنی آزادی کھونے لگے۔ اسی زمانے میں چنگیز خان[2] ایک ہیبت ناک طوفان

---

[1] ان جمہوریتوں کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

[2] چین کے شمال مغرب میں ایشیا کا جو طویل و عریض علاقہ ہے وہاں کسی زمانے میں النجہ خان نام ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس بادشاہ کے ہاں دو جڑواں بچے پیدا ہوئے جن میں ایک کا نام منگول اور دوسرے کا نام تاتار رکھا گیا۔ بڑا ہونے پر انہوں نے اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کیں اور اپنے ملکوں کے نام اپنے ناموں پر "منگولیا" اور "تاتار" رکھے۔ ان کی نسل سے جو دو قومیں وجود میں آئیں وہ بھی انہیں ناموں سے مشہور ہوئیں اور یہ دونوں قومیں آپس میں ہمیشہ برسرپیکار رہتی تھیں۔ منگول وہی ہیں جنہیں ہم مغل کہتے ہیں۔ اس ملک کے باشندے زمانہ قدیم سے خانہ بدوش چلے آتے ہیں اور بہادر اور جری مشہور ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں انہوں نے ایشیا کا اکثر حصہ فتح کر لیا تھا جس میں چین، فارس اور ہندوستان شامل تھے۔ لیکن مغلوں کی مستقل سلطنت ہندوستان میں سولھویں صدی میں قائم ہوئی۔ اس قوم کا سب سے بڑا بادشاہ جو مشہور ہوا وہ یہی چنگیز خاں تھا جس کے دربار میں مارکوپولو نامی یورپی سیاح پاپائے اعظم کا پیغام لے کر گیا تھا۔ پاپائے روم یہ چاہتا تھا کہ یا تو چنگیز خاں مع اپنی قوم کے عیسائی ہو جائے یا قریب کی اسلامی ریاستوں کو تباہ کرے۔ دونوں حالتوں میں اسے عیسائیت کی فتح نظر آتی تھی۔ اس کے الفاظ یہ تھے "ان کتوں کو آپس میں لڑنے مرنے دو پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا۔"

پاپائے اعظم نے کئی ایک وفود چنگیز کے دربار میں بھیجے۔ بالآخر انہیں کامیابی ہوئی اور چنگیز خاں اور اس کے بیٹے قبلائی خاں نے (جو چین کا بادشاہ تھا) اسلامی ریاستوں پر دست درازیاں شروع کر دیں۔ ہلاکو خاں جیسے بادشاہ نے ایران کی بنیادیں ہلا دیں اور آخری خلیفہ عباسی کو بغداد میں ہلاک کر دیا۔

چند سال بعد ہلاکو کا پوتا اسلام لایا اور اس کی تمام قوم بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔ ہندوستان میں جو مغلیہ سلطنت قائم ہوئی اس کے مغل حکمران در اصل نیم ترک تھے جو تیمور کی نسل سے تھے۔ تیمور کا باپ ترک تھا مگر اس کی ماں منگول تھی (دنیا کے عظیم حکمران، مصنفہ ارمان سرحدی صفحہ ۵۰۔۵۱)

کی شکل میں منگولیا کے ریگستان سے اٹھا اور بغداد و دمشق تک تباہی مچاتا چلا گیا۔ بعد ازاں اس کے جانشین اسلام لے آئے۔ تیمور انہیں جانشینوں میں سے تھا۔ اس نے سمرقند و بخارا سے ہندوستان تک ایک وسیع اور شاندار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جس سے ترک قوم ایک بار پھر ایک مضبوط مرکزیت قائم کرنے کے قابل ہو گئی اور چین و روس کی دست درازیاں بھی از خود ختم ہو گئیں۔

چینی ترکستان

آج جس علاقے کو چینی ترکستان کہا جاتا ہے، تیمور کے زمانے میں اسے زبردست شہرت اور عظمت حاصل تھی۔ تیمور نے دور دراز کے بڑے بڑے علماء اور فضلاء کو سمرقند اور بخارا میں بلا بلا اور یہ دونوں شہر علم و فضل کا مرکز بن گئے لیکن تیمور کی وفات کے بعد جب اس کی سلطنت میں ابتری پھیلی تو اس کا ملک بھی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور ہر حصہ دوسرے حصے سے لڑنے لگا۔ اس کشمکش کے نتیجے میں عمر شیخ مرزا کا بیٹا بابر فرغانہ کو چھوڑ کر ہندوستان آ گیا اور سلطنت مغلیہ کا بانی بنا۔ اس نے سترھویں صدی کے شروع میں اس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی جو ساڑھے تین سو سال تک بڑی شان سے ہندوستان میں قائم رہی۔

ترکستان کی تقسیم

انیسویں صدی کے وسط میں جس طرح ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہونے لگا تھا، اسی طرح ترکستان کی چھوٹی بڑی ریاستیں بھی مٹنا شروع ہو گئی تھیں چنانچہ ۱۸۵۷ء کی مشہور جنگ آزادی کے فوری بعد بخارا سے سمرقند، توقند اور خیوا تک کے علاقے ایک ایک کر کے روس کے قبضۂ اختیار میں چلے گئے۔ خیوا اور بخارا میں بعض مقامی رئیس حکومت کرتے رہے لیکن ۱۹۱۷ء میں جب روس میں بالشویک انقلاب آیا تو ان رئیسوں کی ریاستوں کا بھی خاتمہ ہو گیا اور سب علاقوں میں اشتراکی جمہوریتیں قائم ہو گئیں، جو براہ راست روس کے ماتحت تھیں۔

ترکوں کی جدوجہد

اسی زمانے میں ترکی کے مشہور رہنما انور پاشا روسی ترکستان کے علاقہ میں آئے تاکہ سب مسلمانوں کو جو ان علاقوں میں بستے تھے ایک جھنڈے تلے جمع کر کے آزادی کی جنگ لڑیں، مگر وہ اتفاقیہ ایک معمولی سی لڑائی میں مارے گئے اور یوں روس کے خلاف "روسی ترکستان" کی یہ لڑائی ختم ہو گئی۔

۱۹۱۷ء کے بعد سے روس نے روسی ترکستان کے تمام علاقوں کو مقامی امیروں اور رئیسوں کے قبضے سے نکال کر انہیں بالشویک جمہوریت میں تبدیل کرنا شروع کر دیا اور ۱۹۲۹ء تک یعنی بارہ سال کے اندر اندر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ بظاہر ان علاقوں کو جمہوری کہا جاتا ہے مگر اصل اختیارات روس کے ہاتھ میں ہیں۔ ۱۹۱۲ء کے بعد سے چینی حکومت میں جس صوبے کا نام سنکیانگ رکھا گیا وہ دراصل چینی ترکستان ہی ہے۔ اس علاقے کے بارے میں چین اور روس کے درمیان جھگڑا بھی ہوا۔

چین کے شکنجہ میں

چین نے کاشغر اور یارقند کے علاقے فتح کر لیے مگر مقامی باشندوں نے چین کی حاکمیت کو قبول نہ کیا۔ کھلم کھلا لڑائی نہ ہوئی مگر بغاوت کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی، پھر کچھ عرصے بعد موقع پا کر آگ بھڑک اٹھی۔ بعض رہنماؤں کی کوششوں سے یہ علاقہ آزاد تو ہو گیا مگر روس اور چین کے ساتھ مقابلہ برابر جاری رہا۔ چوبیس پچیس سال تک قائم رہا۔ بالآخر چینی غالب آئے۔
۱۹۱۱ء میں جب چین میں انقلاب اٹھا، عوام میں شہنشاہیت کی بجائے جمہوری اور عوامی سیاست کے رجحان نے زور پکڑا تو دوسرے سال ہی اس صوبے کو بھی چین کے دوسرے صوبوں کے ہم پلہ قرار دے دیا گیا، اعلان ہوا کہ جس طرح چینی منگول، تبتی اور مانچو نسلوں میں سے کوئی ایک نسل چین کی حاکم نہیں ہو سکتی بلکہ سب کو مل کر چین پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے اسی طرح ترکستان کی ترک نسل بھی انہیں میں سے ایک ہے چنانچہ نئے چین کے نئے جھنڈے پر ترکستان کا ایک مخصوص رنگ متعین ہوا مگر ان تمام امور کے باوجود ترکوں میں آزادی کا جذبہ رہ رہ کر ابھرتا رہتا ہے اور وہ پھر ایک آزاد اسلامی سلطنت قائم کرنے کے لیے مضطرب رہتے ہیں۔ بین الاقوامی دنیا نے ترکوں کے ان جذبات کا ابھی تک کوئی خیال نہیں کیا۔ تقسیم ہند کے موقع پر اس علاقے کے ترکوں میں ایک بار پھر نئی ہمت پیدا ہوئی اور انہوں نے زبردست جدوجہد کی مگر کسی بڑی طاقت نے ان کی مدد نہ کی۔

ترکستان کی ریاستیں

ترکستان کی ریاستیں یا روس کی جمہوری سلطنتیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے، ان میں کرغز، آذربائیجان، آرمینیا، ترکمانستان، داغستان، گرجستان، قرہ قلپاق، ازبکستان، تاجکستان، اور قازقستان خاص اہمیت رکھتی ہیں، کرغزیہ، ترکمانستان، ازبکستان، تاجکستان اور قرہ قلپاق کی آبادی عموماً مسلمان ہے۔

کرغز

کرغز کی ریاست سائبیریا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ رقبہ ۷۶۹۰۰ مربع میل اور آبادی ساڑھے چودہ لاکھ سے زائد ہے۔ فرزدار لکوست سے نمک، پارہ، ٹین، سرمہ، سیسہ، سونا وغیرہ یہاں کی معدنیات ہیں۔ اونی و سوتی کپڑے، ریشم سازی، جفت سازی، چینی اور سگرٹ بنانے کی صنعت عروج پر ہے۔ کرغز کو ۱۹۲۴ء میں خود مختار صوبہ بنایا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں روس کا جمہوریہ بنایا گیا۔ چھ صوبوں میں منقسم ہے۔
ملک کا اکثر حصہ پہاڑی ہے۔ پہاڑوں کے درمیان وادیوں میں آبادی زیادہ ہے۔ کان کنی کا کام بہت ہوتا ہے۔ ۲/۳ باشندے کرغز میں مسلمان ہیں۔ شمالی حصے میں روسی اور یوکرائی اور مشرقی حصے میں ازبک قبیلے آباد ہیں۔ چراگاہیں عام ہیں۔ اس لیے مویشی کثرت سے پالے جاتے ہیں۔

آذربائیجان

آذربائیجان کا رقبہ ۳۳۴۶۱ مربع میل ہے۔ آبادی ۳۲ لاکھ سے اوپر ہے۔ باکو صدر مقام ہے۔ کپاس، چائے اور پھل یہاں کی مشہور پیداوار ہیں۔ روس کے کل تیل کا ۳/۴ حصہ یہاں سے نکلتا ہے۔ ایران اور بحیرہ کیسپین کے درمیان واقع ہے۔ بحیرہ اسود کی جانب اونچے پہاڑ ہیں جو سمندر کی ہواؤں کو روکتے ہیں۔ اس لیے آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے۔ باکو کی بندرگاہ میں خوب چہل پہل رہتی ہے۔ کیونکہ تیل کے سارے ذخائر اسی جگہ ہیں۔

یہ علاقہ ایرانی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ مشرق و مغرب کو ملانے والے تجارتی راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ پہلے رومیوں کے ماتحت رہا پھر ایرانیوں کے تصرف میں آیا۔ اس کے بعد عربوں نے اس پر حکومت کی۔ پھر منگول و ترک اس پر قابض رہے۔ دوبارہ ایران کے ہاتھ آیا۔ اس کے بعد سے روسیوں کے قبضے میں ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جس میں بڑی بڑی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں۔ باشندوں کی زبان ترکی ہے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۶ء تک ٹرانس کاکیشیا فیڈریشن میں شامل رہا پھر ۱۹۳۶ء میں روس کا جمہوریہ بنا۔ ایک صوبہ اور ایک ریاست پر مشتمل ہے۔

تاجکستان

تاجکستان کا علاقہ ۵۵۰۰۰ مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے جس میں ۱۵ لاکھ کے قریب لوگ آباد ہیں۔ سٹالن آباد اس کا صدر مقام

ہے۔ کپاس، دال، پھل یعنی انگور، اخروٹ، انار وغیرہ کے لیے مشہور ہے۔

ملک کی سرحدیں افغانستان اور چین سے ملتی ہیں، ملک کا بیشتر حصہ پہاڑی ہے روس میں سب سے اونچی پہاڑی چوٹی ہے جسے "سٹالن" کہتے ہیں اور ۲۴۵۹۸ فٹ بلند ہے۔ اسی علاقے میں واقع ہے۔ اس سے دوسرے درجے پر اونچی چوٹی جس کا نام "لینن" ہے وہ بھی اسی جگہ ہے اس چوٹی کی بلندی ۲۳۱۹۳ فٹ ہے۔

ساٹھ فیصد باشندے تاجیک ہیں، ۲۴ فیصد ازبک اور باقی روسی یا کرغیز ہیں۔ تاجیک قوم مسلمان ہے۔

ملک چونکہ سمندر سے دور پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے اس لیے اس کی آب و ہوا مختلف قسم کی ہے، پامیر کا خطہ برف سے ڈھکا رہتا ہے اور ہر جگہ گیارہ فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ مشہور دریا آمو ہے جو ملک کی جنوبی سرحد کے ساتھ ساتھ مشرق سے مغرب کو بہتا چلا جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں تاجکستان کو ازبکستان میں ایک خود مختار ریاست کی حیثیت دی گئی سنہ ۱۹۲۹ء میں روس کا جمہوریہ بنا۔ بدخشاں کے خود مختار صوبے کے علاوہ پانچ دیگر صوبوں پر مشتمل ہے۔

آرمینیا

آرمینیا کی جنوبی سرحد ترکی سے ملتی ہے۔ ریاست کا رقبہ ۱۱۶۴۰ مربع میل اور آبادی ۳ لاکھ کے قریب ہے۔ اریوان صدر مقام ہے۔ شراب کثرت سے بنائی جاتی ہے۔ تانبا اور دیگر دھاتوں کی بھی کثرت ہے۔ ملک کا اکثر حصہ پہاڑی ہے جن میں وسیع وادیاں ہیں۔ آب و ہوا سرد اور خشک ہے۔ ترکی سرحد کے قریب ۱۷۰۰۰ فٹ اونچا پہاڑ ہے۔ روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اسی پہاڑ پر ٹھہری تھی[1]۔

قالین سازی یہاں کی مشہور صنعت ہے۔ ۹/۱۰ باشندے آرمینی ہیں۔ آرمینیوں کی تہذیب بہت پرانی ہے۔ سکندر اعظم کے حملے کے وقت اس علاقے میں ایک مضبوط سلطنت موجود تھی اور ساری دنیا میں اس کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی اس زمانے میں یہ بہت مشہور تھا۔ دنیا کے ہر ملک سے اس کی تجارت ہوتی تھی۔ کئی دفعہ رومی سلطنت سے آرمینیوں کی جنگ ہوئی مگر ہر مرتبہ آرمینی کامیاب ہوئے پانچویں صدی کے شروع میں آرمینی ابجد کی ابتدا ہوئی۔ پھر مدتوں بعد بازنطینیوں، ایرانیوں اور عربوں نے باری باری سے اس ملک پر قبضہ کیا۔ دسویں صدی میں آرمینیوں نے اپنے ملک کا کچھ حصہ آزاد کرا لیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں آرمینیا کو خود مختار ریاست بنایا گیا۔ سنہ ۱۹۳۶ء سے سوویٹ یونین کا جمہوریہ بنا۔

ازبکستان

ازبکستان وسط ایشیا کا نہایت اہم جمہوریہ ہے، رقبہ ۱۵۹۱۷۰ مربع میل اور آبادی ۶۳ لاکھ کے قریب ہے۔ دارالحکومت تاشقند ہے۔ ریشم اور کپاس کے لئے مشہور ہے، روس کی ۶۰ فیصد کپاس یہاں ہوتی ہے۔ تیل، گندھک اور لوہا یہاں کی خاص معدنیات ہیں۔ علاقہ زیادہ تر میدانی ہے جس میں بہت سے صحرا ہیں، نخلستانوں کے آس پاس آبادی پائی جاتی ہے۔ فرغانہ کی مشہور وادی بھی اسی علاقے میں ہے۔ جہاں سلطنت مغلیہ کا بانی بابر پیدا ہوا۔ یہ وادی ازبکستان کا سب سے زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں کی آب و ہوا سرد اور خشک ہے۔ ازبک قبائل مسلمان ہیں۔

بخارا، سمرقند اور تاشقند یہاں کے مشہور تاریخی شہر ہیں۔ سمرقند میں تیمور کا مزار ہے جو سنہ ۱۴[illegible]ء میں تعمیر ہوا۔ یہ مزار تیمور کے پوتے الغ خاں نے تعمیر کرایا۔ ازبکستان کا علاقہ اسلامی تہذیب کا گہوارہ تھا اور مسلمانوں کے ملی نظام کی ایک مضبوط کڑی تھا مگر آج وہاں کچھ بھی نہیں۔

جمہوریہ ازبکستان کی بنیاد سنہ ۱۹۲۴ء میں رکھی گئی۔ آج کل مندرجہ ذیل نو صوبوں میں منقسم ہے، ماژندران، بخارا، فرغانہ، خوارزم، کاشکا دریا، نمنگان، سمرقند، سرخاں دریا اور تاشقند۔

ترکمانستان

ترکمانی خانہ بدوشوں کا یہ مسکن ۱۵۹۲۷۰ مربع میل رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ آبادی ۱۲½ لاکھ کے قریب ہے۔ آشق آباد دارالحکومت ہے۔ کپاس، اون، مویشی، ریشمی کپڑا یہاں کی مشہور چیزیں ہیں۔ تیل اور گندھک کے ذخیرے بھی موجود ہیں۔

ترکمانستان کی سرحدیں بحیرہ کیسپین، افغانستان اور ایران سے ملتی ہیں، علاقہ زیادہ تر میدانی ہے۔ صرف جنوب میں کچھ پہاڑ واقع ہیں۔ صحرا زیادہ ہیں۔ آمو دریا اس علاقے میں سے گزرتا ہے اس دریا کے کنارے بہت سے نخلستان واقع ہیں۔ ترکمانی قبائل سب مسلمان ہیں۔ یعنی آبادی کا ستر فیصد مسلمان اور باقی روسی اور ازبک ہیں۔

زمانہ قدیم میں ترکمانی قبائل مشہور خانہ بدوش لوگ تھے۔ جو صدیوں تک اس علاقے میں رہے۔ پھر دوسرے طاقتور قبائل نے ان کے زرخیز علاقے چھین لیے اور انہیں صحرا کی طرف دھکیل دیا۔ چنانچہ یہ اسی جگہ بس گئے۔ قالین سازی اور گھوڑے پالنے میں بہت ماہر تھے۔

اس جمہوریہ کی بنیاد سنہ ۱۹۲۴ء میں رکھی گئی۔ چھ صوبوں میں تقسیم ہے۔

جارجیا

یہ جمہوریہ ۳۵۵۷۰ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ آبادی ۳۵ لاکھ سے زائد ہے، طفلس صدر مقام ہے۔ تمباکو، جنگلات کی لکڑی، چائے اور انگور یہاں کی مشہور پیداوار ہے۔ معدنیات میں مینگانیز، کوئلہ اور تیل ملتا ہے۔ ملک کی دو تہائی آبادی جارجین لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا تعلق اس نسل سے ہے جو آج سے تین ہزار سال قبل دنیا کی بہترین تہذیب یافتہ قوم خیال کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں یہ لوگ انگور کی کاشت کیا کرتے تھے، سونا اور دوسری دھاتیں نکالا کرتے تھے۔ ہنر و فن میں انہیں کمال حاصل تھا۔ غرض وہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اپنے زمانے کے استاد تھے۔

جارجیا کا علاقہ اس راستے پر واقع ہے جو ہندوستان اور ایران کو یونان سے ملاتا ہے چنانچہ اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم زمانے کی بڑی بڑی طاقتیں یعنی رومی، ایرانی، منگول، عرب اور ترک ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ اس

---

[1] توریت کتاب پیدائش باب ۸ آیت ۴ میں ہے کہ کشتی کوہ ارارط پر ٹھہری۔ ارارط سلسلہ کوہ کا نام ہے جو ایران، روس اور جمہوریہ ترکیہ کی مشترکہ سرحد پر واقع ہے۔ اور جس حصے کا نام ارارط ہے وہ جمہوریہ ترکیہ کی حدود میں ہے۔ قرآن مجید نے خاص اس مقام کا نام بتایا جہاں کشتی ٹھہری تھی۔ یہ مقام جودی تھا۔ توراۃ کے بعض شارحین سلسلہ کوہ کا نام جودی اور کشتی ٹھہرنے کی جگہ کا نام ارارط بتاتے ہیں۔ جو صحیح نہیں۔ اہل ایران نے پہاڑ کے اس حصہ کا نام کوہ نوح قرار دے دیا۔ ترجمان القرآن کا بیان ہے کہ شارحین توراۃ کے نزدیک سکندر کے زمانے کی یونانی تحریرات سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ آٹھویں صدی مسیحی تک اس مقام پر ایک عبادت گاہ موجود تھی جسے عام لوگ "کشتی کا معبد" کہتے تھے۔ ("انوار انبیاء" مرتبہ ادارہ تصنیف و تالیف شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور صفحہ ۲۲)

ملک پر اپنا قبضہ جمائیں اور یکے بعد دیگرے اس ملک پر یہ لوگ غلبہ حاصل کرتے رہے۔ بہت سے مشہور فلسفی، حکما، ریاضی دان اور مؤرخ اس علاقے میں پیدا ہوئے۔ آج کل کئی نسلوں کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ یہاں کا تبا کو ساری دنیا میں مشہور اور مقبول ہے۔

اس جمہوریہ کی بنیاد ۱۹۲۴ء میں رکھی گئی پھر ۱۹۳۶ء میں اسے روسی جمہوریہ قرار دیا گیا۔

قزاقستان[1]

روس کی یہ جمہوریہ رقبہ میں ۱۰۲۷۰۰۰ مربع میل ہے، یعنی وسعت میں روس کی جمہوریتوں میں دوسرے درجے پر ہے۔ آبادی ۱۲ لاکھ سے زائد ہے۔ آلما آتا دارالحکومت ہے۔ گیہوں، چاول، باجرا، کپاس، چنا، چقندر، تمباکو وغیرہ یہاں کی مشہور پیداوار ہے۔ معدنیات میں لوہا، تانبا، پٹرول، گندھک، سیسہ، ٹین، اور کوئلے کی کثرت ہے۔ سنگلاخ سطح مرتفع اور نیم صحرائی علاقہ ہے۔ مشرق میں کم اونچی پہاڑیاں ہیں، جنوب مشرقی حصہ بھی پہاڑی ہے، مغرب کا علاقہ میدانی ہے۔ آب و ہوا سخت سرد اور خشک ہے۔ دریائے یورال کے علاوہ چار اور دریا بھی بہتے ہیں۔ آبادی زیادہ تر کزاخ نیا نل پر مشتمل ہے جو مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ روسی اور یوکرائنی بھی آباد ہیں۔ جنوب میں ازبکوں کی بستیاں ہیں۔

۱۹۱۷ء میں یہاں جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں روسی جمہوریہ بنا۔ سولہ صوبوں پر منقسم ہے۔

باب ۲۷

تبت

تبت کی سلطنت

براعظم ایشیا میں تبت ایک پراسرار پہاڑی علاقہ ہے جو ہندوستان کی شمالی سرحد پر واقع ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں یہ ایک زبردست طاقتور ملک تھا۔ اس ملک کی حدود چین میں سنکسی اور ہندوستان میں مگدھ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سترھویں صدی میں اس پر چین نے قبضہ جما لیا۔ ۱۹۱۲ء میں اس ملک کی آزادی تسلیم کی گئی۔

ملک کی کیفیت

دنیا کا یہ واحد ملک ہے جہاں جدید سائنسی ایجادات اور صنعتی آلات سے لوگ بہرہ ور نہیں۔ یہاں کے باشندے قبل مسیح کے لوگوں کی طرح آرام پرستی اور دقیانوسی عقائد میں مبتلا ہیں۔ ملک کا رقبہ ساڑھے چار لاکھ مربع میل اور آبادی ۵۰ لاکھ کے قریب ہے۔ لاسہ دارالحکومت ہے گیانسٹی اور یانگ مشہور شہر ہیں۔ سانپو یہاں کا مشہور دریا ہے۔ لوگ بدھ مذہب رکھتے ہیں بلکہ دنیا میں بدھ مذہب کا مرکز یہی علاقہ ہے۔ اون، مشک، سینگ اور جڑی بوٹیاں یہاں کی مشہور پیداوار ہے۔ معدنیات میں سونا، سہاگہ اور نمک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

کوہ ہمالیہ کے شمال میں دنیا کا سب سے اونچا ملک یہی ہے جس کی ہر وادی دس ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے چنانچہ اسے "بام دنیا" (دنیا کی چھت) بھی کہتے ہیں چونکہ ساری دنیا سے الگ تھلگ واقع ہے۔ اس لیے اسے "ممنوعہ ملک" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس کے مشرق میں چین واقع ہے، جنوبی حدود ریاست سے ملتی ہیں۔ گرمیوں میں کم گرمی اور سردیوں میں شدید سردی پڑتی ہے۔ بہت تھوڑی گھاس پیدا ہوتی ہے جس پر بھیڑ بکریوں کا گزارا ہے۔ سروگائے نام جانور سے باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ سارے ملک میں ریلیں یا سڑکیں کہیں نہیں۔

دلائی لامہ تبت کا سیاسی اور روحانی پیشوا مانا جاتا ہے۔ لامہ کا انتخاب بچوں میں سے ہوتا ہے جسے پہلے دلائی لامہ کا سایہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

سیاسی حالات

اڑھائی ہزار سال پہلے اس ملک میں بدھ مذہب کا رواج ہوا اور تبت کے عوام نے بڑے جوش و خروش سے اس مذہب کا استقبال کیا۔ اہل تبت کی بھاری اکثریت نے بدھ مت اختیار کر لیا اور آج بھی جب کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بدھ مت کمزور پڑ چکا ہے۔ تبت میں اس کی کیفیت وہی ہے جو ابتدا میں تھی اور ایک لحاظ سے یہ ملک بدھ مت کا مرکز ہے۔

تبت کے لوگ چونکہ دنیا کے جدید علوم اور جدید ایجادات سے واقف نہیں اس لیے جہالت زیادہ ہے۔ حکومت کا کوئی صحیح انتظام موجود نہیں۔ معدنیات کے ذخیرے بہت ہیں مگر انہیں نکالنے کا کوئی بندوبست نہیں نہ ہی حکومت نے اس بارے میں کبھی کچھ سوچا ہے۔ دنیا میں یہی ایک ایسا ملک ہے جس میں غیر ملکی نہیں جاتے اور اگر جانا چاہیں بھی تو حکومت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں۔ انگریزوں نے بڑی کوششوں کے بعد ایک مرتبہ تبت کے ایک مخصوص علاقے میں جانے کی اجازت حاصل کی تھی۔

تبت کا زیادہ علاقہ پتھریلا ہے اس لیے وہاں زراعت اور کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی البتہ ان زمینوں میں سونا، بورکیس اور نمک پایا جاتا ہے۔ تیل کے چشمے بھی موجود ہیں مگر ان سے تیل نکالنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔

اہل تبت کے بادشاہ دلائی لامہ کے بارے میں وہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ دلائی لامہ کی شکل میں گوتم بدھ خود دنیا جنم لے کر دنیا میں آیا ہے، چنانچہ جب دلائی لامہ مر جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرے دلائی لامہ کا انتخاب اس طرح ہوتا ہے کہ تمام مذہبی رہنما اور پروہت نئے پیدا ہونے والے بچوں میں بدھ کی نشانیاں تلاش کرتے ہیں۔ آخر جس شیر خوار بچے میں وہ نشانیاں پا لیتے ہیں اسے دلائی لامہ بنا دیا جاتا ہے۔ جب تک وہ بچہ اٹھارہ برس کا نہ ہو جائے اس کی مسند یعنی شاہی تخت خالی پڑا رہتا ہے۔ اس دوران میں کسی دوسرے شخص کو دلائی لامہ کے نائب کی حیثیت سے سرکاری کاروبار چلانے کے لئے مقرر کر دیا جاتا ہے۔

سیاسی نظم و نسق کے بارے میں سارے تبت کے اختیارات دلائی لامہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ ابتدا میں کیفیت عام تھی۔ پہلے دلائی لامہ کو صرف مذہبی سربراہ سمجھا جاتا تھا مگر جب اس نے عوام پر اپنی طاقت کا سکہ بٹھا لیا تو رفتہ رفتہ اسے حکومت میں بھی دخل حاصل ہو گیا اور آج کل وہ مذہبی سربراہ ہونے کے علاوہ سیاسی حاکم اعلیٰ بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

تبت کئی اضلاع میں تقسیم ہے۔ ہر ضلع میں دو گورنر ہوتے ہیں۔ ایک گورنر دینی عالم ہوتا ہے جسے صرف دین سے واقفیت ہوتی ہے اور دوسرا دنیوی معاملات طے کرتا ہے۔ حکومت کا نظام جاگیردارانہ ہے یعنی تبت کی ساری زمینیں جاگیرداروں اور زمینداروں کے قبضے میں ہیں۔

تبت میں مذہبی عالم کو لامہ کہا جاتا ہے اور ساری آبادی کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ مذہبی عالموں یعنی لاماؤں پر مشتمل ہے یہ لامہ ریاضت اور چلہ کشی پر بہت زور دیتے ہیں راہبوں کی دنیا کے جھگڑوں سے الگ تھلگ ہو کر خانقاہوں میں رہتے اور لوگوں کی دی ہوئی روٹی پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی خانقاہوں میں رہ کر ریاضت و چلہ کشی میں مصروف رہتی ہیں۔

تبت میں ہزاروں سال پہلے کی بعض رسمیں اب بھی جوں کی توں موجود ہیں مثلاً ایک

---

[1] قازقستان بھی لکھا جاتا ہے۔

عورت کئی مردوں سے شادی کر سکتی ہے۔ یعنی ایک بھائی کی بیوی سارے بھائیوں کی بیوی ہوتی ہے۔ فال اور شگون کی رسم بھی عام ہے۔ بات بات پر فال نکالی جاتی ہے۔ بڑے بڑے سیاسی مسئلے تدبیروں کے ذریعے حل کرنے کی بجائے مذہبی عالموں کو بلا کر حل کیے جاتے ہیں یعنی ان سے فال نکلوائی جاتی ہے اور اعتقاد کا یہ عالم ہے کہ فال کو وحی الٰہی سمجھ کر ہر شخص اس پر ایمان لے آتا ہے۔

بدھ مت اختیار کرنے سے قبل اہل تبت بالکل وحشت اور آوارگی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بدھ مت اختیار کرنے کے بعد ان میں کسی حد تک تنظیم کا مادہ پیدا ہو گیا اور انہوں نے باقاعدہ حکومت قائم کرنے کی تدبیریں کیں۔ چنانچہ ایک مضبوط حکومت کی داغ بیل ڈال دی گئی اور بعض بیانات کے مطابق ساتویں صدی قبل مسیح میں تبت کی حکومت ہمالیہ سے گزر کر خلیج بنگال تک پھیل چکی تھی۔ خلیج بنگال کو خلیج تبت کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا۔ جب چین نے تبت کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لیے چین نے کئی کوششیں کیں اور کبھی کبھی اسے عارضی کامیابی بھی ہوئی۔ سنہ ۱۷۲۰ء میں چین نے تبت پر سختی سے دست درازی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلائی لامہ نے اطاعت قبول کر لی مگر سنہ ۱۹۱۱ء میں جب چین انقلاب سے دوچار ہوا تو تبت کو بھی ہاتھ پاؤں مارنے کا موقع مل گیا چنانچہ اس نے چین کی اطاعت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا اور دوبارہ خود مختار ہو گیا۔

باب ۳۸ افریقہ[1]

تاریک براعظم

براعظم افریقہ کو تاریک براعظم کا نام بھی دیا جاتا ہے کیونکہ طویل مدت تک اس کے حالات تاریکی میں رہے۔ افریقہ کے اندرونی حصوں میں اس قدر گھنے جنگلات اور وسیع و عریض بیاباں ہیں جن میں انسان کا گزر نہیں ہو سکتا چنانچہ ان علاقوں کے حالات پر تاریکی کے پردے پڑے رہے یہ براعظم ایشیا سے تقریباً ایک تہائی چھوٹا اور یورپ سے تین گنا بڑا ہے۔ افریقہ کے تقریباً دو تہائی علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں اور ان میں آمد و رفت ہوتی رہی چنانچہ طلوع اسلام سے قبل اہل عرب ان علاقوں میں تجارتی مقاصد کے لیے آتے جاتے تھے۔

پراسرار افریقہ

ظہور اسلام کے بعد عرب تاجروں اور فاتحین نے افریقہ کے شمالی نصف حصے میں قدم رکھے اور اس حصے کے علاوہ افریقہ کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ کئی علاقوں میں اسلام پھیلایا۔ یہاں کے اکثر باشندے مسلمان ہو گئے۔ دوسرے علاقوں میں آمد و رفت ناممکن تھی اس لیے مسلمانوں نے اس طرف کا رخ نہ کیا چنانچہ افریقہ کا مغربی اور جنوبی علاقہ سولہویں صدی عیسوی تک دنیا والوں کے لیے معمہ بنا رہا۔ مشرقی ساحل سے تقریباً ہزار میل کے فاصلے پر افریقہ کے گھنے اور بھیانک جنگلات شروع ہو جاتے ہیں۔ جنہیں اس زمانے میں مشینی آلات نہ ہونے کے باعث صاف کرنا اور ان میں راستے بنانا ناممکن تھا۔ مسلمان عرب جو تبلیغ اسلام کے سلسلے میں دنیا کے دور دراز کونوں میں تیزی سے پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ افریقہ کے ان حصوں میں قدم نہ رکھ سکتے تھے پھر یہ کہ ان کا خیال تھا ان دشوار گزار علاقوں میں انسانوں کی آبادی کا ہونا ممکن نہیں بلکہ یہاں خونخوار درندوں، کیڑے مکوڑوں اور زہریلے جانوروں کے سوا کچھ نہیں، چنانچہ کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔

پردہ اٹھتا ہے

ان علاقوں کے حالات سولہویں صدی کے آغاز میں منظر عام پر آنے شروع ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پرتگیزوں نے افریقہ کے مغربی ساحلوں پر قدم رکھے۔ پرتگیزوں کے تجارتی جہاز تجارت کی غرض سے ان علاقوں کی طرف آئے۔ ان کی دیکھا دیکھی یورپ کے دوسرے ملکوں سے بھی تاجر، سیاح اس طرف آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے افریقہ کے یہ حصے بھی تجارتی مرکز بن گئے مگر یہ تجارت ساحلی علاقوں تک ہی محدود رہی کسی نے اندرونی حصوں کی طرف بڑھنے کی کوشش نہ کی۔ بعض یورپی قوموں کا خیال تھا کہ اندرونی حصوں میں وحشی حبشی ضرور رہتے ہوں گے اور کئی عیسائی مبلغ اس بات کے خواہش مند تھے کہ ان علاقوں میں پہنچ کر عیسائیت کی تبلیغ کریں اور ان حبشیوں کو عیسائی بنائیں مگر ان راستوں پر قدم رکھنے کی جرأت کسی کو نہ تھی۔

سولہویں اور سترھویں صدی میں افریقہ کی کیفیت یہ تھی کہ صرف اس براعظم کے سواحل اور ان اندرونی علاقوں میں جہاں لوگ آسانی سے پہنچ سکتے تھے تجارتی اور دوسرے سلسلے جاری ہو چکے تھے۔ دوسرے حصوں سے بیرونی دنیا مطلق ناواقف تھی۔ بالآخر اٹھارویں صدی کے آخر میں افریقہ کے پراسرار علاقوں کے متعلق بعض بھیدوں سے واقفیت ہونے لگی۔ پھر جب صنعتی انقلاب کے دوران بجلی اور بھاپ کے پوشیدہ خزانوں اور ان کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تو ان کی مدد سے افریقہ کے پوشیدہ رازوں کا بھی سراغ لگایا جانے لگا۔ سیاحوں اور دوسرے لوگوں نے افریقہ کا رخ کیا۔ خوفناک اور گھنے جنگلات میں راستے بنائے جانے لگے وہ جگہیں جہاں اب تک بیرونی دنیا کے انسانوں نے قدم نہ رکھے تھے۔ وہاں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ابتدا میں آنے جانے کی جو مشکلات تھیں وہ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئیں۔ آخر انیسویں صدی کے آخر تک افریقہ کا کوئی علاقہ ایسا نہ رہا جہاں بیرونی دنیا کے قدم نہ پہنچ گئے ہوں۔ افریقہ کے چپے چپے کے حالات کا پتہ چل گیا۔ ہر علاقے کی آب و ہوا، وہاں کے باشندوں، پیداوار غرض ہر کیفیت کے بارے میں بیرونی دنیا کو علم ہو گیا۔ دریافتوں کا یہ سہرا مغربی اقوام کے سر رہا۔ چنانچہ انہیں اقوام کو ان علاقوں پر حکومت کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اس براعظم کی آب و ہوا اتنی شدید ہے کہ یورپ سے آنے والے لوگ اسے اپنے مزاج کے موافق نہ پا سکے۔ چنانچہ انہوں نے مستقل طور پر یہاں قیام کرنے کے متعلق کبھی نہ سوچا۔ افریقہ کا علاقہ منطقہ حارہ میں واقع ہے۔ خط استوا اس کے بیچ میں سے گزرتا ہے۔ سورج کی کرنیں اپنی پوری گرمی کے ساتھ یہاں سیدھی پڑتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں کی گرمی اہل یورپ کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ صرف شمالی اور جنوبی افریقہ کے تھوڑے سے علاقے میں موسم قدرے کم گرم ہوتا ہے۔ جس میں اہل یورپ کا قیام ممکن ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں وسطی افریقہ میں کینیا کے مقام پر چونکہ اونچے اونچے پہاڑ واقع ہیں۔ اس لیے یہاں کی آب و ہوا بھی قدرے معتدل ہے چنانچہ جنوبی اور شمالی افریقہ کے بعد یہ ایک اور جگہ ہے جہاں یورپ سے آنے والے لوگ آباد ہو گئے۔

انیسویں صدی کے آخر تک یورپ کی نظروں میں افریقہ کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ یورپ سے جو جہاز ران افریقہ آئے ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی جہاز رانی کے کمالات دکھانے کے لیے آتے تھے یا اس لیے کہ واپس جا کر اپنی قوم کو اپنی مہمات کے قصے سنائے اور افریقہ کے بعض عجیب و غریب حالات بیان کرتے ان سیاحوں کے بیانات کو وہاں کے لوگ بڑی دلچسپی اور حیرت کے ساتھ سنتے یہ جہاز ران افریقہ کے بعض نئے علاقے بھی دریافت کرتے اور اپنے ملک واپس جا کر اپنی حکومت کو ان علاقوں کے متعلق بعض معلومات بہم پہنچاتے۔ وہ حکومتیں ان علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کر لیتیں۔ مگر ان علاقوں سے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ کیونکہ ان کی حیثیت محض جنگلوں اور

---

[1] افریقہ کے بعض چیدہ چیدہ علاقوں کے کوائف الگ الگ ابواب میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس باب میں بہ حیثیت مجموعی افریقہ کے حالات و کوائف بیان کیے جائیں گے۔

ویرانوں کی سی ہوتی جہاں وحشی قوموں درندوں اور سانپ بچھوؤں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر میں جب مشینی ایجادات پورے زوروں پر تھیں۔ جگہ جگہ کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہو رہی تھیں تو اہل یورپ کو ان کارخانوں کے لیے کچے سامان کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ یورپ کے سرمایہ دار یورپ سے باہر دوسرے ملکوں میں کچے سامان کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔ ان حالات میں انہیں پتہ چلا کہ افریقہ کے ویران جنگلوں اور بیابانوں میں جن کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہ تھی قدرتی دولت کے ذخیرے پوشیدہ ہیں۔ ان علاقوں کی زمینیں نہایت قیمتی معدنیات سے مالا مال ہیں چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے یورپ کی مختلف قومیں ان علاقوں پر چھا گئیں، اور قدرتی ذخائر ڈھونڈ نکالے۔ جس کے ہاتھ جو چیز آئی وہ اس کا مالک بن بیٹھا۔ افریقہ کے مختلف گوشوں میں اہل یورپ چھا گئے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں معدنی ذخائر ڈھونڈنے والوں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک افریقہ کا تقریباً سارا رقبہ یورپی اقوام کے قبضے میں آ گیا۔ یورپ کی مختلف قومیں افریقہ کے مختلف حصوں پر قابض ہو گئیں انگلستان، بیلجیم، پرتگال، سپین، اٹلی، جرمنی اور فرانس نے اپنی اپنی سلطنت اور حکمرانی کے جھنڈے وہاں گاڑ دیے۔ افریقہ کا سب سے زیادہ رقبہ فرانس کے قبضے میں آیا۔ پہلی جنگ عظیم کے ختم ہونے پر افریقہ پر سے جرمن تسلط کا بالکل خاتمہ ہو گیا، اور اس کی ساری نوآبادیات فرانس اور برطانیہ کے پاس چلی گئیں۔

دولت کے ذخائر

پرانے زمانے میں افریقہ سے مراد صرف وہ علاقے تھے جہاں کالے رنگ کے حبشی آباد تھے اور جن کے متعلق لوگوں کو معلوم تھا کہ یہاں گھنے جنگلوں، خونخوار درندوں اور وحشی قبیلوں کے سوا اور کچھ نہیں آج کل بھی افریقہ کے لفظ سے عموماً ایسے ہی علاقے مراد لیے جاتے ہیں لیکن اٹھارویں صدی کے آخر میں جب نئے آلات، نیا اسلحہ اور عجیب و غریب قسم کی مشینری ایجاد ہوئی اور ان آلات کی مدد سے جنگلات کو صاف کر کے ان میں آنے جانے کے راستے بنا لیے گئے دلدلوں کو آمد و رفت کے قابل بنایا گیا تو افریقہ کے بارے میں یہ عام خیال بھی ختم ہو گیا سائنسی ایجادات اور تحقیقات کی مدد سے ان تمام مشکلات پر قابو پا لیا گیا جو افریقہ کے متعلق معلومات کے راستے میں حائل تھیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہ سرزمین معدنی دولت اور قدرتی نعمت سے مالا مال ہے۔ ان علاقوں کے باشندوں کا علم بہت ناقص تھا اس لیے وہ ان قدرتی نعمتوں کا نہ تو استعمال جانتے تھے اور نہ ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ یہ ذخیرے جوں کے توں پڑے رہے، جب ماہرین نے ان علاقوں میں دریافتوں کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے دیکھا کہ گھنے جنگلات میں ہزاروں قسم کی کارآمد لکڑی موجود ہے۔ بے شمار درخت ایسے ہیں جن کی چھال سے کئی کارآمد چیزیں بنائی جا سکتی ہیں۔ وحشی اور خونخوار درندوں میں کئی ایسے ہیں جن کے گوشت، کھال اور چمڑے کو کئی مفید کاموں میں لایا جا سکتا ہے، درختوں کے علاوہ جھاڑیاں تک کام میں آ سکتی ہیں، ان سے کئی قسم کی نفیس ٹوکریاں، چٹائیاں، ٹوپیاں وغیرہ بنائی جا سکتی ہیں انہی جنگلوں میں لاکھوں، کروڑوں من ہاتھی دانت کے ذخیرے جگہ جگہ موجود ہیں۔ غرض افریقہ کے جنگلات اور اس کے تاریک علاقوں میں اتنی بڑی دولت موجود تھی جس کے برابر دولت شاید ہی یورپ کے کسی ملک میں ہو شتر مرغ کے غول کے غول افریقہ کے مختلف علاقوں میں ملتے ہیں جن کے خوشنما پروں اور بازوؤں کی بہت بڑی قیمت حاصل ہوتی ہے پتھریلے اور چٹیل علاقے میں چٹانوں کی دراڑوں کے اندر ایک ایسا گوند پایا جاتا ہے جس سے

پنسل کا سرمہ تیار ہوتا ہے۔ گاڑھا تیل بنایا جاتا ہے اور یہی گوند پرزوں کو جوڑنے کے کام آتا ہے۔ چنانچہ یہی براعظم جسے دولت کے لحاظ سے صفر خیال کیا جاتا تھا اربوں اور کھربوں روپے کی دولت پیدا کرتا ہے اس براعظم میں سونے کی اتنی کانیں ہیں کہ ساری دنیا میں کہیں نہیں۔ سونے کے علاوہ ہیرے اور جواہرات کی بھی کئی کانیں ہیں۔ کوئلہ، تانبا گندھک، ابرک غرض بے شمار اشیاء سے اس براعظم کی سرزمین بھری پڑی ہے۔

جہاں تک زمین کی زرخیزی کا تعلق ہے۔ افریقہ کے بیشتر علاقے بے حد زرخیز ہیں ان میں فصل بہت عمدہ ہوتی ہے۔ دریائے نیل کے کنارے روئی نہایت عمدہ اور کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ یورپ کی جن اقوام نے سب سے پہلے افریقہ کے ان ذخائر کا پتہ لگایا وہ اس دولت کو حاصل کر کے مالا مال ہو گئیں بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ آج یورپ صنعت و حرفت کے لحاظ سے جس عروج کو پہنچا ہوا ہے وہ سب افریقہ کی دولت ہی کے طفیل ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ان ممالک کے ہاتھ لگی۔

افریقہ کی زرخیزی اور اس کے وجوہ

معدنیات اور زراعت کے لحاظ سے افریقہ کی زمین بہت زرخیز ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم سے انسان نے جس قدر علاقے دریافت کیے ان سب کے قدرتی ذخائر اور زمینوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ زمین کھود کر فصلیں پیدا کرنے کا سلسلہ جب طویل مدت تک جاری رہتا ہے تو زمین کی قوت کم ہو جاتی ہے اور اس میں پہلی سی زرخیزی باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح معدنیات کے ذخیرے مدت تک نکالے جاتے رہیں تو وہ کم ہو جاتے ہیں۔ افریقہ چونکہ کافی عرصے تک دریافت نہ ہو سکا یعنی اس کے اندرونی حصوں تک پرانی دنیا کے لوگ آسانی سے رسائی حاصل نہ کر سکتے تھے اس لیے نہ اس کی معدنیات سے فائدہ اٹھایا جا سکا اور نہ ہی زمین کی کاشت کی جا سکی چنانچہ اس کی زرخیزی جوں کی توں قائم رہی۔ ایشیا اور یورپ میں ہزاروں سال کی مسلسل کاشتکاری کے باعث زمین کی قوت کم ہوتی گئی اس کے برعکس افریقہ کی زمینوں کی قوت جوں کی توں قائم رہی بلکہ ہر نو دریافت زمین کی یہی کیفیت تھی۔ مثلاً امریکہ اور آسٹریلیا کے بعض علاقے۔ ان نو دریافت زمینوں سے خوب فائدہ اٹھایا جانے لگا۔ افریقہ کی زمین پر بھی خوب کاشت ہونے لگی اور آج بھی اس کی زرخیزی میں فرق نہیں آیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر دنیا کی موجودہ آبادی اچانک بڑھ کر دس گنا ہو جائے تب بھی ان علاقوں کی دولت سارے انسانوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہے اور تن ڈھانکنے کے لیے انہیں کپڑا بھی میسر آ سکتا ہے۔ خوشحالی کے لحاظ سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو دوسرے ملکوں پر آج جو برتری حاصل ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ نو دریافت ملک ہے اور اس کے بیشتر حصے کو مدتوں تک کسی نے چھوا تک نہ تھا۔ جن علاقوں میں لوگوں نے تھوڑی بہت کاشت کی تھی اس کی حیثیت بالکل معمولی تھی۔

افریقہ میں سونے اور ہیرے کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ایک اندازے کے مطابق ساری دنیا میں جتنا سونا اور جس قدر ہیرے پائے جاتے تھے اس سے اگر زیادہ نہیں تو اس کے برابر سونا اور ہیرے افریقہ کے علاقوں میں ملتے ہیں۔ افریقہ میں ٹرانسوال کے مقام پر سونے کی ان گنت کانیں ہیں۔ ٹرانسوال کا علاقہ جنوبی افریقہ کا ایک صوبہ ہے۔

دنیا بھر میں جس قدر ہیرے ملتے ہیں اس کی ۹۵ فیصد مقدار افریقہ سے دستیاب ہوتی ہے۔

ہاتھی دانت کا ذکر اوپر آیا ہے۔ ہاتھی دانت اگرچہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے مگر افریقہ کا ہاتھی دانت اپنی قسم کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ اور عمدہ ہے۔

ایشیا کا ہاتھی دانت بہترین مانا جاتا تھا، لیکن جب سے افریقہ میں ہاتھی دانت برآمد ہوا تو وہ اپنی صفائی اور چمک کے لحاظ سے ایشیا کے ہاتھی دانت کو پیچھے چھوڑ گیا۔ ایشیائی ہاتھی دانت کچھ عرصے کے بعد اپنی رنگت بدل لیتا ہے، عام طور پر اس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے لیکن افریقی ہاتھی دانت ہمیشہ اپنی اصل حالت قائم رکھتا ہے۔ افریقی شتر مرغ کے پروں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حسن اور اپنی چمک دمک کے لحاظ سے دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ پھر یہ کہ جس کثرت سے یہ پَر افریقہ میں ملتے ہیں دنیا کے کسی علاقے میں نہیں ملتے یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ افریقہ جیسا گرم ملک جہاں کی آب و ہوا اور دیگر خصوصیات کی بنا پر باشندے بے حد سیاہ فام ہوتے ہیں وہاں حسن اور زیب و زینت کی اتنی عمدہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔

گیہوں اور روئی افریقہ کی خاص زرعی چیزیں ہیں اس کے علاوہ ربڑ، کھجور، ناریل گوند، گرم مصالحہ اور انگور بھی نہایت فراوانی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں کا انگور یورپ کے کارخانوں میں جا کر نہایت اعلیٰ اور عمدہ قسم کی شراب کی شکل اختیار کرتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کی بھی یہاں بہتات ہے۔ چنانچہ دودھ اور گوشت کی بھی کمی نہیں جانوروں کے اون سے طرح طرح کے لباس تیار کیے جاتے ہیں۔

زرخیزی کا نتیجہ

ظاہر ہے کہ جس ملک میں ایسی نادر اور قیمتی چیزیں موجود ہوں، زرعی اور معدنی اشیاء کثرت سے پائی جائیں، اس پر ہر قوم کی نظر ہوتی ہے پھر جب ایسے ملک کے باشندے وحشی اور دفاعی لحاظ سے کمزور ہوں تو ہر قوم ان پر تسلط جمانے کی فکر میں لگ جاتی ہے تاکہ اس ملک کی دولت پر قبضہ کر کے اس سے فائدہ اٹھائے۔ جب تک افریقہ کی ان خصوصیات اور ان دفینوں سے دوسرے ملک ناآشنا تھے اس وقت تک کسی نے بھی افریقہ پر سیاسی غلبہ حاصل کرنے یا اس ملک میں بود و باش اختیار کرنے کی طرف توجہ نہ دی، لیکن جب یہ سارے بھید کھلے تو ہر قوم خصوصاً یورپی ممالک افریقہ کی طرف للچائی نظروں سے دیکھنے لگے اور افریقہ پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے مختلف ممالک میں کش مکش شروع ہو گئی۔

اس کش مکش اور افریقہ کی سیاسی ہیئت کا ذکر کرنے سے قبل اس کی مذہبی اور تہذیبی حالت کے بارے میں بھی کچھ وضاحت کی جاتی ہے۔

افریقہ اور مسلمان

ظہور اسلام کے تھوڑے ہی عرصے بعد مسلمانوں نے خلفائے راشدین کے زمانے میں افریقہ کے بعض حصوں پر پائیدار اسلامی حکومت قائم کی جہاں جہاں مسلمان پہنچے وہاں اکثر باشندے اسلام کے دائرہ میں آتے چلے گئے۔ شمال میں مصر سے مراکش تک پھر صحرائے اعظم سے گزر کر وسطی افریقہ میں نائیجیریا، سوڈان اور موزمبیق تک سب اسلامی علاقے ہیں۔ ان کا رقبہ براعظم افریقہ میں تقریباً نصف ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد

یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد حیرت انگیز معاشرتی، اقتصادی اور علمی تبدیلیاں ہوئیں ان کا اثر افریقہ پر یوں پڑا کہ مسلمان علاقے بھی اہل یورپ کے زیر اثر آتے گئے اور چند ملکوں کے سوا باقی تمام علاقے آج بھی یورپ کے محکوم ہیں۔ زنجبار اور نائیجیریا کے علاقوں میں اگرچہ مسلمان رئیس حکمران ہیں لیکن وہ برطانیہ کے زیر اثر ہیں۔ مغربی سوڈان فرانس کا محکوم ہے اور مشرقی سوڈان پر برطانوی اقتدار کا جھنڈا لہراتا ہے۔ مشرقی ساحل پر شمالی علاقے کے بھی ٹکڑے کر دیے گئے ہیں جن پر اٹلی، برطانیہ اور فرانس کا تسلط تھا۔

ٹیونس و مراکش فرانس کے زیر اقتدار ہیں (ان کا مفصل ذکر اس کتاب میں الگ باب کی شکل میں موجود ہے) فرانس کے ساتھ سپین بھی اس میں شریک ہے۔ طرابلس براہ راست اٹلی کے قبضے میں تھا۔ اٹلی کی آخری دم تک یہ کوشش رہی کہ طرابلس کو اٹلی کا جزو بنا لے تہذیب و تمدن کے لحاظ سے یہاں کے لوگوں کو اہل اٹلی میں مدغم کرنے کے لیے یہ بھی ہوا کہ ہزاروں اطالوی یہاں لا کر آباد کیے گئے۔ طرابلس کا نام بھی بدل کر لیبیا رکھا گیا۔ طرابلس کی ایک ہمسایہ ریاست ٹیونس پر اگرچہ فرانس کا اقتدار تھا لیکن اٹلی نے یہاں بھی ایک لاکھ کے قریب اطالوی بسا دیئے اور اس بات کی کوشش کی کہ اسے فرانس کے قبضے سے نکال کر لیبیا میں شامل کیا جائے۔ لیکن یورپی نوآبادکاروں کی سب سے زیادہ تعداد الجزائر میں ہے جس کا اندازہ دس لاکھ کے قریب ہے پھر چونکہ اس کی آبادی ۹۵ لاکھ ہے اس لیے یورپی آبادی کا تناسب ۱۵ فیصد سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس علاقے پر فرانس براہ راست حکومت کرتا ہے۔ ٹیونس یا مراکو کی طرح مقامی رئیس کا یہاں کوئی تعلق نہیں "سفید آبادی" کے لیے الجزائر میں کوئی مقامی کونسل یا اسمبلی نہیں بلکہ اسے فرانس کی پارلیمنٹ ہی کا ایک حلقہ قرار دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ ۱۵ فیصد کی یورپی اقلیت فرانس کی اکثریت کے ساتھ مل کر ساری آبادی پر حکومت کرتی ہے۔ یہی روش اٹلی نے طرابلس میں اختیار کی فرانس اور اٹلی کا ہمیشہ یہی نعرہ رہا، کہ ان نوآبادیات پر جمہوری طریق پر حکومت کی جا رہی ہے اور مقامی باشندوں کو بھی شہریت کے حقوق حاصل ہیں لیکن اندرونی طور پر اس کی حقیقت کچھ اور تھی۔

تہذیب و تمدن

افریقہ کے نامعلوم علاقوں میں جو وحشی اور خونخوار قومیں رہتی تھیں، ظاہر ہے کہ وہ تہذیب و تمدن سے کوسوں دور تھیں۔ جب مغربی اقوام نے ان علاقوں کو دریافت کرنے کے بعد یہاں کے باشندوں سے راہ و رسم پیدا کی تو ہر قوم کی یہی کوشش تھی کہ انہیں اپنے رنگ میں رنگ لے یا انہیں اپنا ہم مذہب بنا لے۔ بعض اقوام نے افریقہ کے وحشی باشندوں کو مہذب بنانے کے بہانے انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افریقہ کے باشندے مہذب اور متمدن تو نہ بن سکے مگر مہذب قوموں کے غلام ضرور بن گئے۔ خصوصاً سفید اقوام نے اہل افریقہ کو غلاموں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔

اہل یورپ اور افریقہ

یورپ کی قوموں میں بعض ایسی بھی تھیں جن کا مقصد صرف افریقہ کی دولت سمیٹنا تھا اور وہ صرف اسی غرض سے افریقہ پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اپنے ان مقاصد کا کھلم کھلا اعلان بھی کر دیا اور کہا کہ افریقی نوآبادیوں سے ہمارا مقصد صرف افریقہ کی دولت حاصل کرنا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں اس کی بھی پروا نہیں کہ مقامی باشندے تباہ و برباد ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں ۱۹۰۶ء کا وہ گشتی مراسلہ قابل غور ہے جو بلجیم کانگو کے گورنر جنرل نے اپنے ماتحت افسروں کے نام جاری کیا اس مراسلہ میں گورنر جنرل نے لکھا "ہم نے مقامی رئیسوں اور سرداروں کے اقتدار اور ان کی طاقت کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور اس طرح اب ہمارے سامنے ایسی رعایا رہ گئی ہے جو اپنی معاشرتی روایات اور رسوم سے منقطع کر دی گئی ہے اور جس سے زمینوں کے مالکانہ حقوق بھی چھین لیے گئے ہیں۔"

گورنر جنرل کے ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ اہل بلجیم نے کانگو کے تمام مقامی باشندوں کو تباہ و برباد، بے یار و مددگار، اور خستہ حال بنا کر انہیں مفلس اور نادار

مزدور بنا دیا تھا۔

بلجیم کے علاوہ جرمنی نے بھی اہل افریقہ کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں نوآبادیاتی کانگرس کے اجلاس میں افریقی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے جرمنی نے اعلان کیا کہ:۔

"یہ کانگرس خیال کرتی ہے کہ مادرِ وطن کے معاشی مفاد کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ کچے سامان کے حصول کے بارے میں جرمنی کو کسی ایسے علاقے کا محتاج نہ رکھا جائے جو جرمنی کے مقبوضات میں شامل نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس جرمنی کارخانوں کے تیار شدہ مال کے گاہک بھی اپنے مقبوضات ہی کے بازاروں میں پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے آئندہ سے جرمنی نوآبادیوں کو اس دوسرے مقصد کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرنی چاہیئے، چاہے اس جدوجہد میں ساری مقامی آبادی کو مزدور بننے اور زندگی غاروں میں محنت کشی کرنے ہی پہ مجبور کیوں نہ کرنا پڑے۔"

لیکن جرمنی نے جس بات کا اعلان کیا اس پہ پوری طرح عملدرآمد نہ کر سکا۔ "پوسٹ وار ورلڈ" کا مصنف لکھتا ہے کہ افریقہ میں جس قدر جرمن افسر موجود تھے وہ سب بڑی محنت اور مستعدی سے کام کرنے تھے اور لوگوں میں ہر دلعزیز تھے۔ انھوں نے رفاہِ عام کے بہت سے ادارے قائم کیے۔ ہسپتال وغیرہ کھولے۔ مقامی کسانوں کے پاس جو زمینیں تھیں ان پر انہیں کے مالکانہ حقوق قائم رکھے۔ زیادہ تر مقامی باشندوں کو افسر بنا کر ان کی مدد سے سارا کام چلایا۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں جرمنی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ افریقہ کو لڑائی سے علیٰحدہ رکھا جائے۔ لیکن اتحادی اس تجویز کو ماننے سے انکار کرتے رہے۔ چنانچہ کیمرن، جرمنی جنوب مغربی افریقہ اور جرمنی مشرقی افریقہ میں سفید فام قوموں ہی نے اہلِ افریقہ کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارا اور انہیں باہم دست و گریبان کر دیا۔

افریقہ کے بارے میں جرمنی نے جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا اسے اگر اہلِ افریقہ کی ہمدردی پر محمول کیا جائے تب بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں خلوص کا فقدان تھا اور یہ ہمدردی محض جرمنی کے معاشی فساد کے لیے تھی، کیونکہ معاشی مفاد کی تکمیل کے لیے مزدور طبقے کو خوش رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

افریقہ کا مزدور طبقہ

صنعتی انقلاب کے بعد مزدوروں سے بڑے پیمانے پر کام لینے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ دنیا کے تمام ملکوں میں سرمایہ دار طبقہ نے محسوس کیا کہ مزدوروں کو مطمئن اور خوش کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں دنیا کے سارے ملکوں میں اس بنیادی پالیسی کے ماتحت مختلف طریقے اختیار کیے جانے لگے۔ مزدوروں کو خوش رکھنے کی راہ میں ایک دقت یہ تھی کہ تعلیم یافتہ مزدوروں کو نہ صرف مزدوری زیادہ دینی پڑتی تھی بلکہ ان کے ساتھ عام روایت سے ہٹ کر عمدہ اور منصفانہ سلوک کرنے کی ضرورت تھی جاہل مزدوروں کی طرح ان سے کام نہ لیا جا سکتا تھا۔ افریقہ میں بھی بالکل ایسی ہی کیفیت تھی۔ مزدوروں کو خوش رکھنے کے سلسلے میں وہاں بھی یہی دقت پیش آئی۔

افریقہ کا سیاسی نقشہ

اس وقت تک افریقہ کی سیاسی کیفیت یہ ہے کہ براعظم کا سینتیس فیصد رقبہ فرانس کے قبضہ میں ہے۔ چوبیس فیصد حصے پر برطانوی جھنڈا لہراتا ہے۔ باقی انتالیس فیصد میں سے تین فیصد سے کچھ زائد علاقہ یورپی اقوام کی شرائط کے ماتحت آزاد ہے۔ ان تین فیصد میں سے اڑھائی فیصد رقبے میں مصر اور نصف فیصد میں مغربی ساحل کی نوآبادی لائبیریا شامل ہے۔ بقیہ چھتیس فیصد میں پرتگال، سپین، بلجیم اور اٹلی شامل ہیں۔

افریقہ کا سب سے زیادہ علاقہ فرانس کے پاس ہے۔ فرانسیسی علاقہ نہ صرف رقبہ کے لحاظ سے بلکہ آبادی اور پیداوار کے لحاظ سے بھی برطانوی علاقوں سے زیادہ ہے۔ برطانوی علاقے کی صرف ایک نوآبادی نائجیریا میں فرانس کے تمام افریقی مقبوضات کے دو ثلث (⅔) کے برابر آبادی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرانسیسی مقبوضات کے کل ساڑھے تین کروڑ افراد کے مقابلے میں صرف نائجیریا کے علاقے میں دو کروڑ کی آبادی ہے۔

فرانس نے حکومت کے لحاظ سے فرانسیسی افریقہ کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے اول شمالی افریقہ جس میں تونیسیا؎، مراکش اور الجزائر شامل ہیں۔ دوم مغربی افریقہ جس میں فرانسیسی سوڈان، نائجیریا، سینی گال وغیرہ شامل ہیں۔ سوم وسطی افریقہ جس میں گابن، کانگو وغیرہ شامل ہیں۔ چہارم مغربی جزیرے جن میں مڈغاسکر اور کوموروکے جزیرے شامل ہیں۔

ان سب علاقوں پر حکومت کرنے کا مرکزی مقام ڈاکر ہے جو مغربی ساحل کی بندرگاہ ہے یہ نظام براہ راست فرانسیسی پارلیمنٹ کے ماتحت ہے۔ تمام افریقی نوآبادیات گورنر جنرل کے ماتحت ہیں۔ گورنر جنرل ڈاکر ہی میں رہتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے یہ بڑا اہم مقام ہے۔

اہلِ فرانس کی سیاسی سرگرمیاں

اہلِ فرانس نے فرانسیسی مقبوضات میں اپنے تہذیب و تمدن کو پھیلانے کے لیے خوب کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے فرانسیسیوں نے افریقی عوام کے دلوں کو موہ لینے کے لیے کئی طریقے اختیار کیے۔ شمالی افریقہ کے مسلمانوں کے ساتھ فرانس کے بعض ناپسندیدہ طریقوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اہلِ فرانس کے ساتھ تعاون کرنے یا ان کی تہذیب اختیار کرنے کی بجائے ان کے مخالف ہو گئے اور یہ مخالفت بڑھتے بڑھتے نہایت خطرناک شکل اختیار کر گئی۔ شمالی افریقہ کے علاقے ہی سب سے زیادہ سرسبز و شاداب تھے، یہاں کی آب و ہوا بھی معتدل تھی۔ اس لیے فرانس نے اپنے منصوبے کے ماتحت سب سے زیادہ کوششیں اسی علاقے میں کیں۔ یہاں کے باشندوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے اور محکومی کی زنجیروں کو اور زیادہ مضبوط بنانے کے لیے رفاہِ عام کے کئی کام کیے۔ عرب باشندوں کے لیے مفت تعلیم دینے کے لیے سکول اور کالج کھولے۔ انہیں وظیفے دیئے۔ عربوں سے شادیاں بھی کیں مگر تونیسیا، الجزائر اور مراکش کے باشندوں نے حکومت فرانس کو کبھی پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھا اور ان علاقوں میں حکومت فرانس کے خلاف لاوا ابلنے لگا۔

جب اہلِ فرانس نے دیکھا کہ ان ممالک کے لوگ کسی طرح فرانسیسی تہذیب کے قریب نہیں آتے اور اہلِ فرانس کے لیے ان کے دلوں میں محبت اور ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتی تو انہوں نے ان علاقوں میں اپنی سرگرمیاں ختم کر دیں اور سارا زور دوسری نوآبادیات پر صرف کرنے لگے۔ ان نئے مقامات میں اہلِ فرانس کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہونے لگی۔

مراکش میں فرانس کے خلاف بغاوت زور پکڑ گئی۔ مراکشی باشندوں نے اعلانیہ بغاوت کر کے حکومت فرانس کو پریشانی میں ڈال دیا۔ فرانس نے اس بغاوت کو فرو

؎ اسے ٹیونس اور تونس بھی لکھتے ہیں۔

کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کر دی مگر بغاوت کی آگ بجھ نہ سکی اس سلسلے میں فرانسیسی خزانے پر بہت بڑا بوجھ پڑ گیا جس سے دوسری نوآبادیات بھی اثر پذیر ہوئیں ان نوآبادیات میں فرانس نے رفاہِ عام کے جتنے کام شروع کر رکھے تھے وہ سب معرضِ التوا میں پڑ گئے۔ روپے کی کمی کے باعث کئی منصوبے ختم کر دینے پڑے۔ اقتصادی ترقی کی سکیمیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ فرانس کی یہ پالیسی کہ وہ افریقی نوآبادیات کے سارے باشندوں کو اپنی تہذیب میں مدغم کرے گا، کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر فرانس نے جی نہ چھوڑا۔ نامساعد حالات کے باوجود فرانسیسی حکومت نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ۱۹۲۶ء میں فرانس اور سپین نے مل کر اہلِ مراکش کے سپہ سالار غازی عبدالکریم کو شکست دی۔ اس کے بعد اہلِ فرانس نے وسطی اور مغربی افریقہ کو پوری طرح اپنا مطیع بنانے کی کوششیں اور تیز کر دیں۔

مدغاسکر

آسٹریلیا، بورنیو، سماٹرا، نیوگنی اور مدغاسکر دنیا کے پانچ بڑے جزیرے ہیں۔ مدغاسکر کا رقبہ مغربی پاکستان کے برابر ہے برطانیہ کے رقبہ سے اڑھائی گنا بڑا ہے۔ شمال سے جنوب تک پہاڑی سلسلہ چلا گیا ہے۔ یورپی اقوام کے لیے اس کی آب و ہوا بہت عمدہ ہے۔ زمین خاصی زرخیز اور معدنیات کی کثرت ہے۔ آج کل باشندوں کی اکثریت عیسائی ہے۔ مسلمانوں کو اس جزیرہ کے متعلق علم تھا۔ لیکن غیر آباد ہونے کے باعث انہوں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ صنعتی انقلاب سے قبل دنیا کی کسی بھی قوم نے اس علاقے کو اپنی توجہ کا مرکز نہ بنایا۔ اس لیے کہ تجارتی لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہ سمجھی جاتی تھی، لیکن صنعتی انقلاب کے بعد جب یورپی اقوام نے تجارتی مقاصد کے لیے دور دراز تک ہاتھ پاؤں مارے اور ایسے علاقوں تک بھی رسائی حاصل کی جنہیں وہ غیر افادی سمجھ کر نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ وہاں مدغاسکر بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور مختلف یورپی اقوام نے مدغاسکر میں اپنا تسلط جمانے کی کوششیں کیں۔

مدغاسکر فرانسیسی نرغہ میں

فرانس نے خاص طور سے مدغاسکر کو اپنی نوآبادی بنانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے فرانس نے کئی مرتبہ اس جزیرے پر لشکر کشی بھی کی مگر مقامی باشندوں نے ان کا مقابلہ کیا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اہلِ فرانس نے وہاں عیسائی مبلغ بھی بھیجے تاکہ باشندوں کو عیسائی بنا کر ان کی حمایت اور ہمدردی حاصل کی جائے پھر ان کے ملک کو سیاسی اور تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ اہلِ مدغاسکر نے ان حملوں کو بھی کامیاب نہ ہونے دیا، بالآخر فرانسیسیوں کے جدید آلاتِ حرب اور ان کی سیاسی چالوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اہلِ مدغاسکر ان سے دب گئے اور ایک وقت آیا جب انہوں نے فرانسیسیوں کی اطاعت کا جوا اپنے گلے میں ڈال لیا۔

۱۸۹۶ء میں فرانس نے مدغاسکر پر زبردست یلغار کی۔ اہلِ مدغاسکر چونکہ جدید اسلحہ سے مسلح نہ تھے اس لیے مقابلہ نہ کر سکے اور ہار مان لی۔ فرانسیسیوں نے مدغاسکر پر زبردست بمباری کی اور اس ملک کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس طرح مدغاسکر میں فرانسیسیوں کی پائیدار حکومت قائم ہو گئی۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ فرانسیسی ایک عرصے تک مدغاسکر میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہے چنانچہ بہت سے لوگوں نے عیسائیت قبول کر لی مگر جب مدغاسکر میں عیسائی حکومت قائم ہو گئی تو لوگوں کا رجحان عیسائیت کی طرف سے ہٹ گیا یہاں تک کہ چالیس لاکھ کی آبادی میں چھ، پانچ لاکھ عیسائی ہیں۔ باقی لوگ بت پرستی یا اوہام پرستی کے قائل ہیں۔

مدغاسکر میں قیمتی لکڑی کے بے شمار جنگلات ہیں یہ لکڑی زیادہ تر عمارتی کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔ انہی جنگلوں میں رنگ بنانے کی اعلیٰ چھال، موم، گوند اور شہد کے بے شمار خزانے موجود ہیں۔ مویشی اور دیگر جانور بھی کثرت سے ملتے ہیں جن کی کھال اور چمڑا مختلف چیزیں بنانے کے کام آتا ہے۔ ربڑ کے درختوں کی بھی کمی نہیں۔ چنانچہ مدغاسکر سے بہت سا ربڑ باہر بھیجا جاتا ہے۔ دوسرے پرندوں کے علاوہ شتر مرغ بھی کثرت سے ملتے ہیں جن کے خوبصورت رنگ دار پروں کی تجارت ہوتی ہے۔ مختلف قسم کی یہ ساری تجارت فرانس کے قبضہ میں ہے اور فرانس اس سے بے شمار دولت کماتا ہے۔ مدغاسکر میں ایسے درخت بھی ملتے ہیں جن کے ریشوں سے ہیٹ اور ہلکی پھلکی ٹوپیاں بنائی جاتی ہیں جنگلات میں ہاتھیوں کی بھی کثرت ہے۔ چونکہ ہزاروں سال سے اس علاقے کی طرف کسی نے رخ نہ کیا تھا اس لیے اس طویل مدت میں ان جنگلات میں ہاتھی دانت کی بہت بڑی تعداد جمع ہوتی رہی۔ مرے ہوئے ہاتھیوں کے بے شمار دانت جنگلات میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں جو بہت بڑی قیمت میں فروخت ہوتے ہیں۔ جنگلات میں ایک ایسا درخت بھی پیدا ہوتا ہے جس کے نشاستے کی روٹی تیار کی جاتی ہے اس درخت کی تجارت بہت وسیع پیمانے پر ہوتی ہے انگریزی میں اس درخت کو مینوک (MANIOC) کہتے ہیں ایک درخت کی اندرونی چھال سے چٹائیاں اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں جو بید سے زیادہ نازک اور مضبوط ہوتی ہیں۔ ونیلا نام ایک پودا بھی اگتا ہے جس کے پھول بہت خوشبودار ہوتے ہیں۔ پہاڑیوں میں گرے نائٹ نام کی وہ گوند بڑی کثرت سے ملتی ہے۔ جس سے پنسل کا سرمہ، مشینوں کے پرزوں کو چکنا کرنے والا تیل اور ایک قسم کی پالش تیار کی جاتی ہے۔ فاسفیٹ نام سے ایک قیمتی فاسفوری نمک بھی یہاں ملتا ہے۔ ابرک کی بھی کثرت ہے۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جو زمین کے اوپر کسی محنت اور کھدائی وغیرہ کے بغیر مل جاتی ہیں۔ زمین کے اندر جو خزانے پڑے ہیں ان سب کا ابھی سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ بہرحال کھدائی کرنے پر کئی قیمتی معدنیات بھی ملی ہیں۔ غرض اس ساری دولت سے فرانس نے فائدہ اٹھایا اور اب تک اٹھا رہا ہے۔ مگر ملک کے اصل باشندوں کی حالت یہ ہے کہ وہ فاقوں سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

مدغاسکر میں عربوں اور مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے البتہ اس کے قریب چھوٹے چھوٹے جو جزیرے موجود ہیں ان میں عرب لوگ ہی آباد ہیں۔ ۱۸۹۵ء تک مدغاسکر مکمل طور پر آزاد تھا، اہلِ مدغاسکر ہی میں سے ایک ان کا حکمران تھا پھر اسی سال فرانس نے اس پر قبضہ جمایا اور یہ جزیرہ براہِ راست پیرس کے ماتحت آ گیا۔ بعض فرانسیسی بھی اس ملک میں آ کر آباد ہو گئے لیکن ان کی تعداد ایک فیصدی سے بھی کم ہے۔

زنجبار

افریقہ کا جو حصہ برطانیہ کے قبضہ میں ہے اس میں ایک علاقہ تو وہ ہے جس کی آب و ہوا انگریزوں کے موافق ہے چنانچہ ان علاقوں میں بیشتر انگریزوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس کی آب و ہوا انگریزوں کے مزاج کے موافق نہیں۔ اس حصے کو انہوں نے محض اپنی شکارگاہ بنایا۔ ان شکارگاہوں میں ایک علاقہ "زنجبار" کا ہے۔ زنجبار کو شکارگاہ اس لیے بنایا گیا کہ جس طرح افریقہ کے دوسرے علاقوں میں بعض مشکلات پیش آتی ہیں اس طرح اس علاقے میں کوئی ایسی دقت پیش نہیں آتی۔ یہ چھوٹا سا ساحلی علاقہ ہے جس میں آسانی کے ساتھ شکار کھیلا جا سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں کے باشندے بے یار و مددگار ہیں یعنی یہ علاقہ دوسرے اسلامی ملکوں سے دور اور الگ تھلگ ہے۔ اہلِ جزیرہ کسی سے مدد حاصل نہیں

کرسکتے اس لیے انگریز آسانی سے انہیں اپنے زیر اثر رکھ سکتے ہیں۔ جب دنیا میں اسلامی انقلاب کا غلغلہ بلند ہوا تو اہل زنجبار نے بھی اسلامی فلسفۂ حیات کو اپنا لیا لیکن پندرھویں صدی عیسوی میں جب کولمبس نئی دنیا دریافت کرنے کے لیے نکلا اور سپین و پرتگال کے جہاز حدود زنجبار میں سے بھی گزرے تو قدرتی طور پر زنجبار کے باشندوں نے بھی ان عیسائی حکومتوں کے اثر و اقتدار کو قبول کر لیا۔ پھر جلد ہی مسقط کے سلطان نے جزیرۃ العرب کے ساحلوں سے اٹھ کر پرتگالی فاتحوں کو بھگا دیا اور زنجبار کا علاقہ براہ راست مسقط کے ماتحت آ گیا چونکہ زنجبار میں قدرتی مناظر بہت دل کش ہیں اور آب و ہوا بھی اچھی ہے اس لیے مسقط کے سلطان سعید نے بعد ازاں اس علاقے کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا اور افریقہ کے ساحلوں پر دور دراز تک زنجبار کی دھاک بیٹھ گئی۔ مگر یہ دھاک صرف سلطان کی زندگی تک ہی قائم رہی۔ سلطان کے مرنے کے بعد جب اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا تو اس میں باپ کی سی صلاحیتیں موجود نہ تھیں اس لیے حکومت کمزور ہوتی گئی۔ پھر جب یورپ میں صنعتی انقلاب کا طوفان اٹھنے لگا تو برطانیہ، جرمنی اور اٹلی نے زنجبار پر قبضہ کرنے کے لیے دانت تیز کرنے شروع کر دیے۔ آخر برطانیہ کامیاب ہوا۔ انگریز سرمایہ داروں نے بھاری رقمیں دے کر سلطان زنجبار سے ہزاروں ایکڑ زمین خریدی پھر اپنی ان زمینوں کی حفاظت کے لیے فوج اور پولیس رکھنے کی اجازت لی۔ رفتہ رفتہ اپنے قدم اس قدر پھیلائے کہ ۱۹۱۰ء میں زنجبار کا سارا علاقہ انگلستان کی تحویل میں آ گیا۔ یعنی انگلستان اس علاقے کا سرپرست قرار پایا

سیاسی حالت

اس سرپرستی کی صورت یہ ہے کہ زنجبار پر اب بھی سلطان کی حکومت ہے لیکن سارا اختیار و اقتدار انگریز ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی مرضی سے سارا کام ہوتا ہے۔ سلطان اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ داخلی اور خارجی دونوں انتظامات انگریز ریزیڈنٹ کے ہاتھوں اس کی اپنی مرضی سے انجام پاتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں یہاں ایک لیجسلیٹو کونسل بنائی گئی جس کی صدارت انگریز ریزیڈنٹ کرتا ہے۔ البتہ کونسل میں سلطان کو صدر کی حیثیت حاصل ہے عدالت کے نظام میں ریزیڈنٹ اور سلطان دونوں شامل ہیں۔ بعض اختیارات سلطان کو حاصل ہیں اور بعض ریزیڈنٹ کو۔

آج سلطان زنجبار کی حیثیت یہ ہے کہ وہ صرف زنجبار اور اس کے آس پاس کے دو تین جزیروں پر حکمران ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام ساحلی علاقے جن پر کبھی سلطان کی حکومت تھی اور جن کی وجہ سے زنجبار کو ہر طرح کی اہمیت حاصل تھی ایک ایک کر کے سلطان کے ہاتھ سے جا چکے ہیں اور یورپ کی مختلف طاقتیں ان پر قابض ہیں۔ زنجبار کی آبادی دو اڑھائی لاکھ سے زیادہ نہیں۔ اس میں پچاس ہزار کے قریب افراد صدر مقام میں رہتے ہیں۔

اس علاقے کی خاص اور کثیر پیداوار مونگ ہے جو صدیوں سے زنجبار کی سب سے بڑی تجارت ہے۔ علاوہ ازیں ناریل، زیتون کا تیل اور ہاتھی دانت بھی یہاں کی خاص چیزیں ہیں جو باہر بھیجی جاتی ہیں۔ زراعت کے لحاظ سے یہ علاقہ خود کفیل نہیں یہی وجہ ہے کہ لوگ خوش حال نہیں اور نہ ہی صنعت و حرفت کے لحاظ سے کوئی ترقی ہو سکی ہے

سوڈان

سوڈان کا سرکاری نام "مصری برطانوی سوڈان" ہے۔ یہ علاقہ صحرائے اعظم کے جنوب سے وسطی افریقہ تک چودہ لاکھ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ نہایت زرخیز علاقہ ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں اسے مصر سے ملحق کر دیا گیا۔ آبادی زیادہ تر مسلمان ہے۔ عربی زبان بولی جاتی ہے۔ معاشرت اور معیشت کے لحاظ سے سوڈان اور مصر دونوں ایک ہیں۔

۱۸۸۲ء میں مہدی سوڈانی نے جو مہدیت کا مدعی تھا مصر سے بغاوت کر کے سوڈان کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ ۱۸۹۸ء میں برطانیہ نے مصری فوجوں کے تعاون سے مہدی کی بغاوت کو فرو کیا تاہم اس کے بعد سوڈان مصر کے ماتحت نہ رہا بلکہ مصر اور برطانیہ دونوں کی مشترکہ حکومت کے تحت آ گیا۔ جس میں اصل اختیارات انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔

سوڈان کی سرزمین روئی کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ افریقہ کا سب سے بڑا دریا نیل حبشہ سے نکل کر سوڈان ہی سے گزرتا ہوا مصر پہنچتا ہے۔ چنانچہ سوڈان میں آب پاشی کے لیے اسی دریا سے کئی نہریں نکالی گئی ہیں۔ ان نہروں میں برطانیہ اور مصر دونوں نے روپیہ لگایا۔ مصر کا روپیہ برطانیہ کی نسبت زیادہ تھا۔ جب اٹلی کے مسولینی نے حبشہ کو فتح کیا تو سوڈان مصر دونوں کی آبپاشی کے سوال نے نازک صورت اختیار کر لی۔ کیونکہ یہ خطرہ درپیش تھا کہ اٹلی نے حبشہ میں دریائے نیل پر بند باندھ کر پانی روک دیا تو سوڈان و مصر کا سارا زرخیز علاقہ ریگستان بن کر رہ جائے گا، مگر بعد ازاں جب حبشہ اٹلی کے شکنجے سے آزاد ہو گیا تو یہ خطرہ بھی ٹل گیا۔

انتظامی سہولت کے لیے سوڈان کو پندرہ صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر صوبے کا گورنر برطانیہ کی مصری فوج کا کوئی افسر اعلیٰ ہوا کرتا تھا۔

سوڈان کا مغربی حصہ جو صحرائے اعظم کے جنوب سے دریائے نیل کے میدان تک پھیلا ہوا ہے۔ فرانس کے قبضے میں ہے۔ مذہب اور معاشرت کے لحاظ سے سوڈان کے فرانسیسی اور برطانوی حصوں میں کوئی فرق نہیں۔

اٹھارویں صدی میں فرانس نے سارے سوڈان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر برطانیہ کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ اس وقت فرانس کے قبضہ میں سوڈان کا چار لاکھ مربع میل زرخیز رقبہ ہے جہاں روئی بڑی کثرت سے پیدا ہوتی ہے فرانسیسی سوڈان میں دریائے نائیجر بہتا ہے۔

"مصری برطانوی سوڈان" کی آبادی زیادہ گنجان نہیں۔ صرف ساٹھ لاکھ افراد بستے ہیں۔ رقبے کے لحاظ سے یہ علاقہ مصر کے دگنے سے بھی زیادہ ہے مگر آبادی مصر سے نصف بھی نہیں۔ فرانسیسی سوڈان کی آبادی نسبتاً گنجان اور زیادہ ہے۔ رقبے میں کم ہونے کے باوجود وہاں کی آبادی پینتیس لاکھ سے زائد ہے۔

۲۵ نومبر ۱۹۵۰ء کو حزب امہ (آزادی کی حامی پارٹی) کے لیڈر نے مصر کے گورنر جنرل سوڈان اور برطانوی حکومت کو تار دیے کہ سوڈان کی مکمل آزادی کا حق تباہ نہ کیا جائے۔ پھر پچاس مندوبین نے سوڈان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کر دیا، جس پر خوب بحث ہوئی۔ ۱۵ دسمبر کو اسمبلی نے انتالیس ووٹوں کی حمایت اور اڑتیس کی مخالفت سے برطانیہ اور مصر کو آگاہ کر دیا کہ ۱۹۵۱ء میں سوڈان کو خود مختاری دے دی جائے گی۔

۲۶ جولائی ۱۹۵۱ء کو اس جماعت میں پھوٹ پڑ گئی جو سوڈان کو مصر کے ساتھ ملحق کرنے کی حامی تھی۔ ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے مصر سے ایک وفد آیا مگر اسے ناکام واپس جانا پڑا۔ برطانیہ نے کہا کہ سوڈان کو تدریجاً آزادی ملنی چاہیے۔

۲ دسمبر ۱۹۵۱ء کو تجویز پیش ہوئی کہ سوڈان کا مصر سے اتحاد قائم رہے لیکن سوڈان کی حکومت الگ ہو گئی پھر دستور ساز کمیشن نے انجمن اقوام متحدہ سے درخواست کی کہ سوڈان کی خود مختاری کو پورا کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن بھیجا جائے۔ دستور ساز کمیشن نے یہ درخواست بھی کی کہ ۱۹۵۳ء تک دستور ساز اسمبلی بن جانی چاہیے ۱۵ نومبر کو برطانیہ کے وزیر خارجہ نے اعلان کیا کہ سوڈان کا دستور ۱۹۵۲ء کے آخر تک

بن کر نافذ ہو جانا چاہیئے۔ پھر جنرل اسمبلی کے سامنے مصری وفد نے تجویز پیش کی کہ رائے عامہ کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے برطانیہ اور مصر کی فوجیں سوڈان سے ہٹالی جائیں اور جو کچھ بھی کیا جائے وہ انجمن اقوام متحدہ کی نگرانی میں ہو۔ حزب اُمہ نے رائے عامہ معلوم کرنے کی حمایت کی۔ سوڈان کی قانون ساز مجلس نے دستور سازی کا مسودہ منظور کر لیا۔ یہ مسودہ دستور ساز کمیشن نے تیار کیا تھا ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو برطانیہ نے سوڈان کے لیے داخلی خود مختاری کی تجویز منظور کر لی۔ حکومت مصر نے بھی ۱۹۵۲ء کے آخر تک خود اختیاری حکومت کا نظام منظور کر لیا اور فیصلہ کیا کہ تین سال کے بعد سوڈان کو اپنی مرضی کے مطابق آئندہ سب کچھ طے کرنے کا پورا حق ہوگا۔

۱۹۵۳ء میں سوڈان کی مختلف پارٹیوں کے درمیان خود مختاری کے بارے میں سمجھوتہ ہو گیا۔ انتخابات کی نگرانی کے لیے سات اراکین کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔ جس کے تین اراکین سوڈانی ہوں، ایک مصری، ایک برطانوی اور ایک ہندوستانی فیصلہ ہوا کہ تین سال کے اندر اندر تمام معاملات طے کر دیئے جائیں یعنی سوڈان کی آزادی اور مصر کے ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں تصفیہ کر دیا جائے۔

۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء کو سوڈان میں خود اختیاری حکومت نافذ ہو گئی۔ انتخابی کمیشن کے ممبروں کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ جنرل محمد نجیب نے حزب اُمہ کو خبردار کیا کہ کسی مصری سیاست دان کو پراپیگنڈے کے لیے ملک کا دورہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

یکم جنوری ۱۹۵۴ء کو سوڈان کی پہلی پارلیمنٹ کا رسمی افتتاح ہوا۔ چار دنوں بعد سپیکر کا انتخاب ہوا اور ۶ جنوری کو اسماعیل الازہری کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔

۱۹۵۵ء میں فیصلہ ہو گیا کہ سوڈان مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہوگا۔ مصر اور برطانیہ دونوں نے یہ تجویز مان لی۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ ۲۱ جنوری کو سیکورٹی کونسل نے سوڈان کی یہ درخواست منظور کر لی کہ اسے انجمن اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا جائے۔

۲ فروری کو تمام پارٹیوں کی مشترکہ حکومت قائم ہو گئی اور اسماعیل الازہری بدستور وزیر اعظم رہے ۱۵ مارچ کو روس اور سوڈان کے درمیان سیاسی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور سفارت خانے مقرر کرنے کی تجویز ہوئی۔

۴ جولائی ۱۹۵۶ء کو اسماعیل الازہری کی وزارت کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار کیا گیا اور ۵ جولائی کو عبداللہ خلیل نے وزارت بنائی۔

نائجیریا

افریقہ کے مغربی ساحل پر نائجیریا کا برطانوی مقبوضہ ہے۔ رقبہ ۳ لاکھ ستر ہزار مربع میل اور آبادی تین کروڑ سے اوپر ہے۔ لاگوس صدر مقام ہے یہ علاقہ افریقہ کے سب سے زیادہ گنجان اور زرخیز علاقوں میں شمار ہوتا ہے جنوب میں ایک چھوٹے سے ساحلی علاقے کے سوا باقی تمام علاقے میں مسلمان آباد ہیں اور مختلف علاقوں میں مسلمان رئیس قدیم قبائلی دستور کے مطابق اپنی اپنی بستیوں پر حکومت کرتے ہیں۔ نگران پر سرپرستی برطانیہ کی ہے برطانوی چیف کمشنران لوگوں کو مشورہ دینے کے لیے وہاں موجود ہے، یعنی یہ برطانوی افسران رئیسوں کو کوئی ایسا کام نہیں کرنے دیتے جو برطانوی مفاد کے خلاف ہو۔ وہ ان کی ہر حرکت اور سلطے پر کڑی نگرانی رکھتے ہیں۔ جنوب کی غیر مسلم آبادی براہ راست برطانوی حکومت کے تحت ہے۔ سیاسی لحاظ سے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شمالی صوبجات، مشرقی صوبجات اور مغربی صوبجات، کل صوبے چوبیس ہیں۔

اکتوبر اور اپریل میں ان علاقوں کا موسم نہایت خشک ہوتا ہے۔ معاشی اہمیت سونے، ٹین، کوئلے اور زیتون کی پیداوار کے باعث ہے۔ شمالی حصے میں ایک قسم کا درخت ہوتا ہے جس کے بیج سے مکھن نکلتا ہے یہ مکھن یہاں کے باشندوں کی مرغوب غذا ہے صابن میں ڈھالنے کے لیے غیر ملکوں کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ جنوبی حصے میں ایک قسم کا گوند پایا جاتا ہے جس سے چمکدار اور خوبصورت وارنش تیار ہوتا ہے۔

آبادی کے لحاظ سے افریقہ کا سب سے بڑا ملک ہے اور برطانیہ کا سب سے بڑا مقبوضہ۔ سارے علاقے میں اڑھائی سو مختلف قبیلے آباد ہیں اور تقریباً اسی قدر زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس علاقے میں مردم خور قبیلے بھی آباد ہیں جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ انسان کو قتل کر کے اس کا گوشت کھاتے ہیں۔ اس علاقے میں ابھی تک غلامی کا رواج ہے اور قدیم زمانے کی طرح اب بھی یہاں کے رئیسوں کے ہاں لونڈی غلاموں کی خرید و فروخت اور انہیں محلات میں رکھنے کا دستور قائم ہے۔

نائجیریا کے ایک حصے پر فرانس کا قبضہ ہے۔ فرانسیسی نائجیریا کی آبادی اٹھارہ لاکھ کے قریب ہے۔ یہاں بھی حکمرانی کا پرانا دستور موجود تھا لیکن فرانس کی کوششوں سے یہ دستور ختم کر دیا گیا اور اب یہ علاقے براہ راست فرانسیسی حکومت کے ماتحت ہیں۔

کینیا

افریقہ میں مغرب انتصلی کی ساحلی پٹی کو چھوڑ کر باقی تمام شمالی افریقہ مغربی اقوام کی سکونت کے لیے ناموزوں ہے صرف کینیا کا چھوٹا سا علاقہ اہل یورپ کے موزوں ہے اس لیے کہ یہ علاقہ پہاڑی بلندی پر واقع ہے اور اس کی آب و ہوا خوشگوار ہے۔ چنانچہ خاصی تعداد میں اہل مغرب یہاں آکر آباد ہو گئے۔ کینیا کی کل آبادی تینتیس لاکھ کے قریب ہے جس میں اکیس ہزار کے قریب یورپین ہیں۔

کینیا کا کل رقبہ ۲ لاکھ پچیس ہزار مربع میل ہے۔ نیروبی دارالحکومت ہے۔ قہوہ، چائے، مکی اور روئی یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ شتر مرغ، زرافہ، ہرن اور دیگر جانور کثرت سے ملتے ہیں۔ مسائی نام یہاں ایک مشہور قوم آباد ہے۔ یہ لوگ جانوروں کی کھالیں پہنتے ہیں۔ ساحلی حصے پر عرب کثرت سے آباد ہیں اور اصل باشندے وسطی حصے میں رہتے ہیں۔ شمالی حصہ ریگستانی ہے۔ مشرقی حصہ سب سے زیادہ زرخیز ہے۔

اگرچہ اہل یورپ یہاں اقلیت میں ہیں مگر اکثریت پر وہی حکمران ہیں۔ ملکی نظم و نسق میں مقامی باشندوں کا کوئی دخل نہیں۔ حکومت کرنے والی کونسل کے بیس ممبر ہیں۔ جن میں سے بارہ کو منتخب کرنے کا حق یورپی نوآبادکاروں کو حاصل ہے۔ پانچ ممبر ہندوستانی باشندے منتخب کر سکتے ہیں اور عربوں کو دو ممبر منتخب کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ہندوستانی اور اہل عرب یہاں کثرت سے آباد ہیں۔ مقامی باشندوں کی نمائندگی کے لیے ایک عیسائی مبلغ نامزد کر دیا جاتا ہے۔

اہل یورپ کینیا کے جس حصے میں آباد ہیں اس کا رقبہ سولہ ہزار مربع میل ہے اور زرخیزی کے لحاظ سے یہ علاقہ کینیا کا بہترین علاقہ ہے۔ پابندی یہ ہے کہ سفید اقوام کے علاوہ کسی اور قوم کا آدمی اس علاقے میں ایک انچ زمین بھی نہیں خرید سکتا خواہ وہ عرب ہو یا ہندوستانی افریقی ہو یا مصری، پچاس ہزار مربع میل کے کچھ رقبے مقامی باشندوں کے لیے وقف کر دیئے گئے ہیں۔ مگر یہ زمینیں اچھی نہیں۔ بالکل بنجر اور غیر آباد ہیں۔ تمام اچھی زمین اہل برطانیہ کے پاس ہے کینیا میں جتنے غیر یورپی آباد ہیں، اہل یورپ ان کے ساتھ ہمیشہ ناواجب سلوک کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ ان کے خلاف یہاں کے باشندوں نے متعدد مرتبہ احتجاج کیا مگر اس احتجاج کو ہمیشہ سختی کے ساتھ دبا دیا گیا۔

جنوبی افریقہ

یورپی آبادکاروں نے زیادہ تر جنوبی افریقہ میں سکونت اختیار کی اس لیے کہ ان علاقوں کی آب و ہوا افریقہ کے دوسرے علاقوں

کی نسبت زیادہ معتدل ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں سونے اور ہیرے کی بڑی کانیں پائی جاتی ہیں۔ دیسی باشندوں کے لیے اہلِ برطانیہ نے یہاں "محفوظ علاقے" بنا رکھے ہیں کیونکہ یورپی زونوں میں کسی غیر یورپی کو رہنے کی اجازت نہیں۔ محفوظ علاقوں کے علاوہ باسوٹولینڈ، سوازی لینڈ اور بیچوانالینڈ کے نام سے مزید تین دیسی ریاستیں بنادی گئیں جو برطانیہ کے زیر حمایت ہیں اور مقامی رئیس ان علاقوں پر برائے نام حکومت کرتے ہیں۔ برطانوی مفادات کی حفاظت کے لیے ہر ریاست میں ایک برطانوی افسر رہتا ہے جس کی تنخواہ اور دوسرے مصارف وہاں کے باشندوں سے ٹیکس لے کر پورے کیے جاتے ہیں۔

ان محفوظ رقبوں کے بعد جو علاقہ باقی رہ جاتا ہے وہ جنوبی افریقہ کا وفاق (یونین آف ساؤتھ افریقہ) کہلاتا ہے۔ اس علاقے کو ۱۹۱۰ء میں درجہ نوآبادیات دیا گیا۔ اس وفاق میں چار ریاستیں شامل ہیں۔ کیپ آف گڈ ہوپ، ٹرانسوال، نٹال اور آرنج فری سٹیٹ۔ پہلی دو ریاستوں میں زیادہ تر انگریزی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ آخری دو میں ہالینڈ کے ولندیزی باشندے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع شروع میں یہاں ہالینڈ ہی کے لوگ آکر آباد ہوئے تھے بعد میں جب انگریزوں نے ادھر کا رخ کیا تو ہالینڈ کے لوگ شمال کی طرف نقل مکانی کر گئے اور وہاں اپنی آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ جنوب میں انگریزوں کی ریاستیں بن گئیں پھر جب ۱۸۸۶ء میں ٹرانسوال کے علاقے میں سونے کی کانیں دریافت ہوئیں تو انگریزوں نے اس علاقے پر اپنی نظریں جما دیں اور اسے اپنے قبضے میں لینے کے لیے کوششیں شروع کر دیں چونکہ یہ ریاستیں ولندیزوں کی تھیں اس لیے انگریزوں اور ولندیزوں کے درمیان جھڑپیں ہونے لگیں جو بعد ازاں خوفناک جنگ کی صورت اختیار کر گئیں، یہ جنگ "بوئر وار" کہلاتی ہے۔ جنگ کا نتیجہ انگریزوں کے حق میں نکلا۔ چنانچہ ولندیزی علاقوں پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا اور چار ان ریاستوں کو ملا کر ایک جمہوری وفاق قائم کر دیا گیا۔

اس صورت حال کے باوجود ولندیزی باشندے برطانوی تسلط سے نکلنے کے لیے کوشش کرتے رہے انہوں نے کئی تحریکیں چلائیں۔ انگریزوں نے سختی سے مقابلہ کیا اور یہ کشمکش عرصے تک جاری رہی۔ بالآخر ۱۹۲۶ء میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں طے ہوا کہ برطانیہ کا ہر وہ علاقہ جسے درجہ نوآبادیات حاصل ہے۔ اپنے اندرونی معاملات میں پہلے ہی سے خود مختار ہے اب وہ اپنے بیرونی معاملات میں بڑی حد تک آزاد ہو گیا۔

اس اعلان نے ولندیزوں کو مطمئن کر دیا اور ان کی تحریکیں کمزور ہو گئیں۔ ان چاروں ریاستوں میں یورپی باشندوں کی تعداد ۲۰ لاکھ سے زائد ہے۔ دیسی باشندے اسی لاکھ کے قریب ہیں۔ کینیا کی طرح اس علاقے میں بھی برصغیر پاکستان و ہند کے بہت سے باشندے مقیم ہیں۔ خصوصاً نٹال کے علاقے میں ان کی کثرت ہے۔

سیاسی نظم و نسق کے لیے دو ایوان ہیں، ایوان بالا اور ایوان زیریں، لیکن دونوں ایوانوں میں صرف سفید رنگ کے افراد ہی ممبر بن سکتے ہیں کسی کالے کو ممبر بننے کا حق نہیں۔ ہاں بعض مقامات پر "کالے" آدمیوں کو ووٹ دینے کے لیے کچھ اختیارات حاصل ہیں۔

جنوبی افریقہ کا علاقہ "کالے گورے" کے امتیاز کا بدترین گہوارہ ہے۔ گورے نوآبادکار پچیس فیصد کی اقلیت میں ہونے کے باوجود پچھتر فیصد کی "کالی" اکثریت پر پورا غلبہ حاصل کیے ہوئے ہیں۔ سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے انہوں نے "کالوں" کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اور ان کے ساتھ سخت ناواجب سلوک کیا جاتا ہے۔ اس سلوک کے خلاف پہلے بھی کئی احتجاج ہوئے مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد احتجاج نے زیادہ شدت اختیار کر لی چونکہ بھارت اور پاکستان کے جو باشندے وہاں رہتے ہیں ان کے ساتھ بھی برا سلوک کیا جاتا ہے اس لیے ان دونوں ملکوں نے بھی احتجاج کے طور پر تجارتی مقاطعہ کیا مگر اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ وزارت بدلی۔ جنرل سمٹس کی جگہ جنرل ملان نے وزارت کا قلمدان سنبھالا مگر کالے گورے کی امتیازی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ یو۔ این۔ او میں بھی یہ سوال اٹھایا گیا اور جنوبی افریقہ کے خلاف بہت سخت باتیں کی گئیں مگر اس کا بھی کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

روڈیشیا

مذکورہ بالا یونین کے عین شمال میں روڈیشیا کا علاقہ ہے۔ اس علاقے کی آب و ہوا بھی خوشگوار ہے اس لیے یہاں بھی یورپی اقوام کثرت سے آباد ہیں۔ روڈیشیا کا رقبہ ۱،۵۰،۳۳۳ مربع میل اور آبادی ساڑھے تئیس لاکھ کے قریب ہے سالسبری دارالحکومت ہے۔ مکئی، تمباکو اور کپاس یہاں کی مشہور پیداوار ہے۔ سونا، چاندی کوئلہ، کروم، ابرق، موم، چاندی اور قلعی یہاں کی خاص معدنیات ہیں۔ اس علاقے میں دریائے زیمبیزی پر مشہور وکٹوریہ آبشار ہے جسے ۱۸۵۵ء میں مشہور سیاح لونگ سٹون نے دریافت کیا۔ یہ آبشار دنیا بھر میں شہرت رکھتی ہے۔ اس زمانے میں انگلستان پر ملکہ وکٹوریہ کی حکومت تھی اس لیے لونگ سٹون نے ملکہ کے نام پر آبشار کو وکٹوریہ کا نام دیا۔ آبشار تک پہنچنے کا راستہ بہت دشوار ہے۔ افریقہ کے مشہور جنگلی جانور روڈیشیا میں کثرت سے ملتے ہیں۔ پانچ ہزار مربع میل کا رقبہ ہاتھی کے شکار کے لیے مخصوص ہے۔

پہلے یہاں تعلیم کا کوئی بندوبست نہ تھا بعد ازاں سالسبری میں یونیورسٹی قائم کی گئی مگر مقامی باشندے اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ سالسبری کا شہر ۵۰۰۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

انیسویں صدی کے آخر تک اس ملک پر مقامی باشندے حکومت کرتے تھے۔ جب اہل برطانیہ کو یہاں کے ذخائر کا علم ہوا تو ۱۸۸۹ء میں حکومت برطانیہ نے یہاں کے مقامی حکمران سے دوستی کا ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق روڈیشیا نے معدنیات نکالنے کا کاروبار برطانیہ کے سپرد کر دیا اور یہ کام شروع کر دیا گیا۔ پھر جلد ہی اس علاقے میں جگہ جگہ برطانوی بستیاں آباد ہونے لگیں جس سے مقامی باشندے پریشان ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور مقامی باشندوں میں کشمکش شروع ہو گئی پھر خوفناک لڑائیاں ہونے لگیں۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ رہوڈیشیا مکمل طور پر برطانوی تسلط میں آ گیا۔ معدنیات کی تلاش کے لیے جو کمپنی رہوڈیشیا میں کام کر رہی تھی اس کے بانی کا نام روڈس تھا۔ یہ ایک مشہور ماہر انگریز تھا۔ اسی کے نام پر اس علاقے کا نام رہوڈیشیا رکھا گیا۔

رہوڈیشیا کے شمالی حصے کی آب و ہوا زیادہ خوشگوار نہیں۔ البتہ جنوبی حصے کی آب و ہوا بہت اچھی اور اہل یورپ کے موافق ہے۔ چنانچہ جنوبی حصے میں یورپین آبادکاروں کی کثرت ہے۔ تیرہ لاکھ کی آبادی میں انگریزوں کی تعداد ساٹھ ہزار کے قریب ہے۔ شمالی رہوڈیشیا کی آبادی چودہ لاکھ کے قریب ہے جس میں صرف تیرہ ہزار کے قریب یورپین لوگ ہیں۔

رہوڈیشیا پہلے ایک کمپنی کے ماتحت تھا۔ پھر ۱۸۸۹ء میں برطانوی حکومت کے ماتحت آیا۔ ۱۹۲۳ء میں یہاں سیلف گورنمنٹ قائم ہوئی اور پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد تیس تھی۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں شمالی و جنوبی رہوڈیشیا کی یورپین آبادی کے نمائندوں کے اجتماع میں تجویز ہوا کہ رہوڈیشیا کو جنوبی افریقہ کے وفاق میں شامل کر دیا جائے۔

جنوبی افریقہ، شمالی و جنوبی رہوڈیشیا اور کینیا کے علاوہ یوگنڈا، ٹانگانیکا اور نیاسالینڈ کے خوش گوار حصوں میں بھی یورپی نوآبادکار مقیم ہیں۔ جن کی تعداد نصف فی صد یا زیادہ سے زیادہ ایک فیصد ہے۔ اس کے باوجود اکثریت پر حکومت کرتے ہیں۔ برطانیہ اسے جمہوری حکومت قرار دیتا ہے مگر حکمران قوم کا طرزِ عمل جمہوری اصولوں کے سراسر منافی ہے۔

لائبیریا

مغربی افریقہ میں آزاد حبشیوں کی ایک نوآبادی ہے، سارے علاقے کا رقبہ ۴۳ ہزار مربع میل اور آبادی سولہ لاکھ کے قریب ہے۔ طرز حکومت جمہوری ہے۔ مانرودیا صدر مقام ہے۔ ربڑ، کوکو، ناریل اور قہوہ یہاں

کی خاص پیداوار ہے۔ معدنیات میں سونا زیادہ نکلتا ہے۔ باشندوں کی زبان زیادہ تر انگریزی ہے۔ مارشل کی بندرگاہ سے ربڑ برآمد کیا جاتا ہے۔ امریکی آبادکاروں نے ۱۸۲۰ء میں یہاں بستیاں قائم کیں۔ ۱۸۴۷ء میں لائبیریا کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔ حبشہ کے علاوہ دنیا میں یہ حبشیوں کا واحد ملک ہے۔

سیاسی حالات کی تفصیل یہ ہے کہ جس زمانے میں اٹلی نے حبشہ فتح کیا۔ اس سے قبل افریقہ کی سوا کروڑ مربع میل سرزمین میں صرف تین چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں جب حبشہ مسولینی کے قبضے میں چلا گیا تو دو ریاستیں باقی رہ گئیں۔ یعنی مصر اور لائبیریا۔ مگر یہ دونوں ریاستیں اتنی چھوٹی اور کمزور تھیں کہ کسی کی سرپرستی کے بغیر از خود زندہ نہ رہ سکتی تھیں۔ جس زمانے میں امریکہ میں غلامی کے خلاف جنگ جاری تھی اس زمانے میں آزاد ہونے والے غلاموں کو لائبیریا میں لا کر بسایا جانے لگا۔ امریکہ سے کئی غلام یہاں آ کر آباد کیے گئے یہ غلام چونکہ گوری نسل کے ساتھ رہ رہ کر زیادہ مہذب ہو گئے تھے۔ اس لیے لائبیریا میں انہوں نے یہاں کے قدیم باشندوں سے زیادہ ترقی کر لی اور بالآخر یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔

شروع شروع میں یہ علاقہ امریکہ کے ماتحت رہا پھر جب یہاں کے لوگوں نے اپنی حکومت کو مضبوط کر لیا تو امریکہ سے الگ ہو کر اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا یہ آزادی تسلیم کر لی گئی۔ امریکی غلام چونکہ انگریزی زبان بولتے تھے اور حکومت انہوں نے ہی قائم کی تھی۔ اس لیے ملک کی سرکاری زبان انگریزی قرار دے دی گئی۔

انگولا

جنوبی افریقہ کے مغربی ساحل پہ پرتگالی مقبوضہ ہے۔ رقبہ چار لاکھ اٹھاسی ہزار مربع میل اور آبادی اکتالیس لاکھ کے قریب ہے۔ سینٹ پال ڈی لونڈا اس کا صدر مقام ہے۔ ربڑ، مکئی، نیشکر اور موم یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ معدنیات میں نیل جواہرات اور بعض دھاتیں شامل ہیں۔

وسطی اور جنوب مغربی علاقے میں ۵ ہزار سے ۸ ہزار فٹ اونچی سطح مرتفع ہے۔ کئی چھوٹے چھوٹے دریا اس علاقے میں بہتے ہیں۔ آب و ہوا کہیں گرم اور کہیں معتدل ہے۔ بڑے بڑے شہر ساحل پر واقع ہیں۔

انگولا کو پرتگالی مغربی افریقہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں بارہ سنگھے بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ ملک میں جہالت زیادہ ہے۔ یہاں دوسرے فرانسیسی مقبوضات کی طرح نسلی امتیاز نہیں۔ ۱۹۴۸ء میں ولندیزوں نے یہ ملک پرتگیزوں کے سپرد کیا تھا۔ اب یہ پرتگال کا ایک صوبہ ہے۔